ماہنامہ

چونکا دینے والی کہانیاں

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

جولائی 2012

www.pdfbooksfree.pk

16 — ذیشان اقبال عظمی — **اماوس کا غلام**
اچنبھے میں ڈالتی ہوئی ماورائی مخلوق کی ایک حقیقی داستان جو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دے گی

41 — علی آفاق کاشی — **انتقام**
ایک ہوس پرست شخص کی رونگٹے کھڑے کرتی لہولہان عبرت سے بھرپور کہانی

45 — خلیل جبار — **موبائل کی روح**
رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ایک چڑیل کی دیدہ دلیری جس نے لوگوں کو لرزا کر رکھ دیا تھا

50 — اے۔وحید — **رولوکا**
وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

75 — صائمہ حمید — **بھیانک انجام**
بے وفائی اور دھوکہ دہی کی داستان حیرت جو کہ خوف کے لبادے میں لپٹی ہوئی ہے

80 — ناصر محمود فرہاد — **قاتل مردہ**
خوف کی وجہ سے رگوں میں خون منجمد ہوتی اپنی نوعیت کی...... ناقابل فراموش کہانی

93 — اقصیٰ رباب — **دھوکا**
حرص ولالچ میں مبتلا دولت کے متلاشی لوگوں کا انجام بھیانک ہوتا ہے، ثبوت کہانی میں موجود ہے

96 — ایم الیاس — **بلیک ٹائیگر**
تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے

125 — ایس حبیب خان — **نفرت**
یہ حقیقت ہے کہ اصل سے خطا نہیں اور کم نسل سے وفا نہیں، جس کا ثبوت کہانی میں مکمل موجود ہے

130 — صبا رمضان — **ساتواں جنم**
جنم جنم کی ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش کہانی، جسے پڑھ کر عقل دنگ رہ جائے گی

139 — عبدالحمید ساگر — **ترکیب**
اپنے دام میں خود صیاد آ گیا ....اور اس حقیقت کا پتہ کہانی پڑھ کر ہی چلے گا

144 — ایس۔امتیاز احمد — **روح کا انتقام**
رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک خوفناک......اچھوتی اور انوکھی کہانی

161 — ذکاءاللہ قریشی — **ہاتھ کی لکیریں**
کیا یہ حقیقت ہے کہ ہاتھ کی لکیروں میں ماضی حال اور مستقبل کا راز پنہاں ہوتا ہے؟

165 — شہزادہ چاندزیب عباسی — **خونی کتے**
جسم وجاں میں خوف کی لہر دوڑاتی......ظلم و بربریت کی ایک خوفناک اور ہولناک کہانی

172 — ایم۔اے راحت — **سنہری تابوت**
شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

193 — رضوان قیوم — **معاوضہ**
راتوں رات دولت مند بننے کے خواب دیکھنے والوں کے لئے پرہیبت رونگٹے کھڑے کرتی کہانی

201 — ثاقب بشیر — **شیطانی کھیل**
اندھا اعتماد کبھی کبھی انسان کو اندھے کنوئیں میں دھکیل دیتا ہے، ثبوت کہانی میں موجود ہے

209 — قاسم رضا — **آسیبی حویلی**
خوف کی پگڈنڈی پر رواں دواں جسم و جاں پر لرزا طاری کرتی لہولہان خونی کہانی

231 — محمد عمران سعید — **لیٹر پیڈ**
اچانک سامنے موجود شخص کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر سرایت کر گئی۔لرزہ بر اندام وحشت ناک کہانی

234 — ڈاکٹر اختر ہاشمی — **شمیکا**
اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنے والی ایک زبردست اور حیرت انگیز روداد

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

www.pdfbooksfree.pk

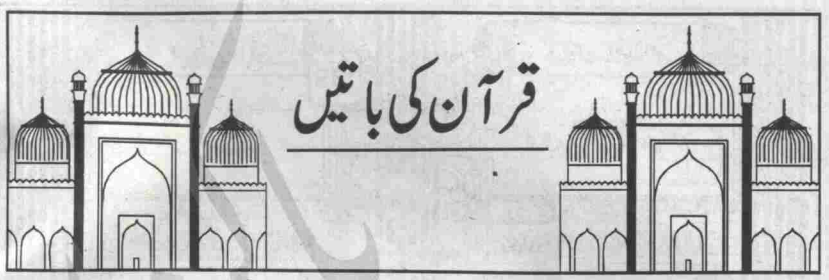

☆ اور کہتے ہیں کہ جب ہم مر کر بوسیدہ ہڈیاں اور چور چور ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہو کر اٹھیں گے کہہ دو کہ خواہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور چیز جو تمہارے نزدیک پتھر اور لوہے سے بھی بڑی سخت ہو۔ جھٹ کہیں گے کہ بھلا ہمیں دوبارہ کون جلائے گا؟ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔ تو تعجب سے تمہارے آگے سر ہلائیں گے اور پوچھیں گے کہ ایسا کب ہوگا کہہ دو امید ہے کہ جلد ہوگا۔ جس دن وہ تمہیں پکاریں گا تو تم اس کی تعریف کے ساتھ جواب دو گے اور خیال کرو گے کہ تم دنیا میں بہت کم مدت رہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 49 سے 52)

☆ لوگو اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں کچھ شک ہو تو ہم نے تم کو پہلی بار بھی تو پیدا کیا تھا یعنی ابتدا میں مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی تاکہ تم پر اپنی خالقیت ظاہر کر دیں اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک معیاد مقرر تک پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں پھر تم جوانی کو پہنچتے ہو۔ اور بعض قبل از پیری مر جاتے ہیں اور بعض شیخ فانی ہو جاتے اور بڑھاپے کی نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ بہت کچھ جاننے کے بعد بالکل بے علم ہو جاتے ہیں اور اے دیکھنے والے تو دیکھتا ہے کہ ایک وقت میں زمین خشک پڑی ہوتی ہے پھر جب ہم اس پر مینہ برساتے ہیں تو وہ شاداب ہو جاتی اور ابھرنے لگتی ہے اور طرح طرح کی بارونق چیزیں اگاتی ہے ان قدرتوں سے ظاہر ہے کہ اللہ ہی قادر مطلق ہے جو برحق ہے اور یہ کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور یہ کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (سورۃ حج 22 آیت 5 سے 6)

☆ اور اللہ ہی تو ہے جو ہوائیں چلاتا ہے اور وہ بادل کو ابھارتی ہیں پھر ہم اس کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں۔ پھر اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں اسی طرح مردوں کو جی اٹھنا ہوگا۔
(سورۃ فاطر 35 آیت 9)

☆ جو لوگ کافر ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ وہ دوبارہ ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے کہہ دو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر جو جو کام تم کرتے رہے ہو وہ تمہیں بتائے جائیں گے۔ اور یہ بات اللہ کو آسان ہے۔ (سورۃ طلاق 65 آیت 7)

☆ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی بکھری ہوئی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے ضرور کریں گے اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں۔ (سورۃ قیامہ 75 آیت 3 سے 4)

☆ اے ایمان والوں اللہ کے لئے انصاف کی گواہی دینے کے لئے کھڑے ہو جایا کرو۔ اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 8)

☆ اور جو لوگ اپنے متعلق کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان سے بھی عہد لیا تھا مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی ایک حصہ فراموش کر دیا تو ہم ان کے باہم قیامت تک کے لئے دشمنی اور کینہ ڈال دیا اور جو کچھ وہ کرتے رہے اللہ عنقریب ان کو اس سے آگاہ کرے گا۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 14)

☆ (اے پیغمبر) تم دیکھو گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں۔
(سورۃ مائدہ 5 آیت 82)

☆ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو ان کاموں سے باز رہنا چاہئے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 91)

☆ اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی تو سخت کلامی کے ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو ایسا کرنے سے تم دیکھو گے کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے اور یہ بات ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں۔ اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔ (سورۃ حٰمٓ سجدہ 41 آیت 34 سے 35)

☆ اور تمہارے لئے حیوانات میں ہی مقام عبرت وغور ہے کہ ان کے پیٹوں میں جو گوبر اور لہو ہے، اس سے ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 66)

☆ جو لوگ اللہ اور اسکے رسول سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک سے نکال دیئے جائیں۔ یہ تو دنیا میں انکی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا بھاری عذاب تیار ہے ہاں جن لوگوں نے اس سے پیشتر کہ تمہارے قابو آ جائیں توبہ کر لی تو جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 33 سے 34)

☆ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 190)

☆ اور ہم نے دن اور رات کو دو نشانیاں بنایا ہے۔ رات کی نشانی کو تاریک بنایا اور دن کی نشانی کو روشن تاکہ تم اپنے رب کا فضل یعنی روزی تلاش کرو اور برسوں کا شمار اور حساب جانو۔ اور ہم نے ہر چیز کی بخوبی بات کر دی ہے۔
(سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 12)

☆ اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا (یہ باتیں) اس شخص کے لئے جو غور کرنا چاہے یا شکر گزاری کا ارادہ کرے (سوچنے اور سمجھنے کی ہیں)۔ (سورۃ فرقان 25 آیت 62)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی"، بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

www.pdfbooksfree.pk

خطوط

ایس حبیب خان کراچی سے، بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! امید ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے جون 2012 کا شمارہ انتظار کی طویل گھڑیوں کے بعد جب ہاتھ میں آیا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ اپنی تحریر دیکھ کر خوشی ہوئی، جن ساتھیوں نے میری تحریر کو پسند کر کے مجھے یاد رکھا، میں تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں، آپ نے دو کہانیاں ارسال کرنے کا کہا تھا، اس بار کچھ مصروفیت رہی اور طبیعت بھی ٹھیک نہیں (فلو کی وجہ سے) اس بار معذرت! انشاء اللہ اگلے ماہ پوری کوشش ہوگی کہ دو تحریریں ارسال کروں۔ ڈر کی ابتداء ''قرآن کی باتیں'' کے مطالعہ سے ہوئی جس نے ایمان کو تازگی بخشی، خطوط کی رنگ برنگی محفل میں کافی دوست اپنے تبصرے لئے ہوئے تھے۔ ان میں رضیہ عارف، فرزانہ عابد اور رانا ظفر اقبال کی باتیں غور طلب ہیں۔ کہانیوں میں ''سنہری تابوت'' کی پہلی قسط نے متاثر کیا، آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے ''قتل موذی'' ایک عمدہ تحریر لگی، ''اذیت پسند'' بہت جاندار انداز میں تحریر کی گئی ایک زبردست تحریر لگی، ایس۔ امتیاز احمد کی ''بزدل روح'' ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ کہانی کے مرکزی خیال کے انوکھے پن نے متاثر کیا اور رائٹر نے شاندار انداز سے اس کو پیش کیا۔ ویلڈن، اور جو تحریر اس ماہ ٹاپ پر رہی وہ ''فالج زدہ'' ہے۔ اس کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں مل رہے۔ بہت ہی بہترین کاوش تھی، اس عبرتناک، سبق آموز اور حساس تحریر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، ڈرڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعاگو۔

☆☆ ایس صاحبہ: قلمی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف، نئی کہانی بھیجنے پر وری وری تھینکس، امید ہے آئندہ بھی اپنی کاوشیں ارسال کرتی رہیں گی۔ اس کے لئے شکریہ قبول کریں۔

صبا رمضان پنڈ دادنخان سے، ہیلو ایوری باڈی..... آپ کا ڈائجسٹ ہمیشہ کی طرح بس ترقی کرتا ہی نظر آیا ہے۔ مبارک ہو۔ آپ نے مجھے میری برتھ ڈے پر وش نہیں کی ناں..... 2 جون کو میری برتھ ڈے تھی۔ اور آپ کی کہانیوں کا معیار ماشاء اللہ دن بدن بہتر ہوتا جارہا ہے۔ آپ کو ایک مشورہ دینا تھا کہ ایسا ممکن ہے کہ آپ بھی اپنے تمام لکھاریوں کے لئے کسی سالانہ تقریب کا اہتمام کریں یا پھر ہر ماہ کی Top three اسٹوریز کا انتخاب کیا کریں اس سے لکھاری زیادہ محنت کریں گے۔ میری پچھلی اسٹوریز میں سے سواتی نکشرہ پلیز جلدی شائع کر دیجئے گا۔

☆☆ صبا صاحبہ: آپ کے تجویز کردہ پروگرام پر بہت جلد عمل شروع ہو جائے گا۔ کہانی شامل اشاعت ہے، سواتی نکشرہ کچھ زیادہ اصلاح طلب ہے اس کے علاوہ اور کہانیاں شائع ہوتی رہیں گی۔

شگفتہ حسین کراچی سے، آداب! امید کرتی ہوں ڈر کا پورا اسٹاف بھلا چنگا ہوگا۔ پچھلے کافی مہینے خطوط کی محفل میں غیر حاضر رہی مصروفیت کی وجہ سے لیکن پچھلے ماہ خطوط لکھ کر بھی رکھا لیکن حمیرا کی شادی کی وجہ سے بھیج ہی نہ سکی ہاں ویسے ٹھیک پہچانا آپ نے میری بہن کہانی ''سانوری'' کی رائٹر ''حمیرا غلام حسین کیریو'' جو کہ اب اپنے پیا دیس چلی گئی ہیں نواب شاہ۔ اور اپنا ڈرڈائجسٹ کے نام پیغام بھی چھوڑ گئی ہیں اس نے کہا ہے کہ میں نے دو کہانیاں لکھی ہیں صرف ان کا اینڈ ہی رہتا ہے ان دونوں کہانیوں کا اینڈ کر کے اس کا اینڈ نہایت عمدہ تھا اور اس کی جگہ جو نئی کہانی شروع ہوئی ہے ''شمیکا'' اس کی اب تک کی ساری قسطیں لاجواب ہیں، اب آگے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا۔ MAY کی ڈائجسٹ کو جیسے ہی کھولا پہلی نظر کہانی ''چندر ادیوی'' پر پڑی جس پر لکھا تھا آخری قسط یہ لفظ دیکھ کر ذرا سا دل اداس ہوا ایسا لگ رہا تھا ابھی ہی تو ہم نے پہلی قسط پڑھی اور اتنی جلدی کہانی کا اینڈ بھی ہوگیا پر اینڈ پڑھ کر دل خوش ہوگیا اب ہمیں یہ بھی تو بتائیے اس کہانی کی جگہ اب کون سی نئی کہانی شائع ہوگی ایم الیاس کی۔ قاتل روح، نہلے پر دہلا، خونی بت، راز، یہ سب کہانیاں بھی اچھی تھیں اور دیگر کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں آخر میں ڈر کے لئے ڈھیروں دعائیں.....

☆☆ شگفتہ صاحبہ حمیرا صاحبہ: کے لئے ہماری دعائیں، اللہ تعالیٰ انہیں خوش وخرم رکھے اور جائز مقاصد میں کامیابی عطا کرے، کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، امید ہے آئندہ ماہ بھی خط بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔

فاریہ قصور سے، تسلیم۔ اللہ کرے ڈرڈائجسٹ کے سارے لوگ خیریت سے اور خوش ہوں۔ جون کا شمارہ خریدا تو سرورق شاندار اور اچھا لگا۔ کہانیوں میں اذیت پسند، سنہری تابوت، ناگ نقش، شکاری، رقص موت، موت کا سفر اور بزدل روح بڑی اچھی تھیں۔ خدا کے کرم سے ماہنامہ ڈر کا معیار دن بہ دن بڑھتا جارہا ہے۔ خدا اس کو ہمیشہ ترقی دے۔ غزلوں کی وادی میں فریدہ خانم، محمد اسلم جاوید، حکیم خان حکیم شفیق رضا، غلام نبی نوری اور محمد عثمان علی کی غزلیں دل کو بھا گئیں۔ اور اس کے علاوہ جب قرآن کی باتیں پڑھیں تو ہوش آیا۔ کہ یہ دنیا صرف ایک دکھاوا ہے۔ اس میں رہنے والا کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی آرہا ہے تو کوئی جارہا ہے۔ پھر میرے دل میں ایک سوال آیا جو میں پوچھنا چاہتی ہوں، جواب ضرور دیجئے گا۔ آپ کو خط کس تاریخ تک پہنچ جانا چاہیے۔ میں کچھ اشعار، غزل اور لطیفہ بھیج رہی ہوں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ آئندہ ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ فاریہ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ خط ہر ماہ کی نو دس تاریخ تک موصول ہونا چاہیے، آئندہ ماہ بھی قلمی لگاؤ کا انتظار رہے گا۔

صدف حسین کراچی سے، السلام علیکم! مئی 2012 کا شمارہ بازار میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور جلد ہی خرید بھی لیا۔ ایک طویل عرصہ سے غیر حاضر رہی سب سے پہلے اس کے لئے معافی چاہتی ہوں۔ دراصل میری بہن جو کہ ڈر میں کہانیاں لکھتی ہے۔ رائٹر ''حمیرا غلام حسین کیریو'' کی شادی کی مصروفیات میں دو مہینے کس طرح گزرے پتا بھی نہ چلا اور پیپرز کی بھی تیاری ہو رہی ہے پلیز دعا کیجئے گا کہ اچھا رزلٹ آئے۔ اب آتے ہی اس ماہ کی کہانیوں کی طرف، سب سے پہلے چندر ادیوی، پڑھی مجھے لگتا ہے اسے جلدی ختم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اینڈ اچھا تھا۔ ہر ماہ کی طرح ''رولوکا'' بیسٹ لگی۔ ''شمیکا'' بھی زبردست جاری ہے ڈاکٹر اختر ہاشمی ماشاء اللہ سے بہت اچھا لکھتے ہیں۔ دیگر کہانیوں میں انوکھا انجام، درندگی، قاتل روح، خونخوار اور انور فرہاد کی جنات کا قبضہ بہت اچھی لگیں۔ آخر میں ڈر کے لئے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ خدا حافظ۔

☆☆ صدف صاحبہ: بہن کی شادی بہت بہت مبارک ہو۔ چلئے اب آپ کی مصروفیات ختم ہوئیں۔ اور قوی امید ہے کہ ہر ماہ خط لکھنا بھولیں گی نہیں۔

انوری رمضان پنڈ دادنخان سے، سب سے پہلے تمام پڑھنے والوں کو میرا اسلام۔ اس کے بعد آتے ہیں مئی کے شمارے کی طرف۔ جو ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا۔ اس ماہ جو اسٹوری آف دی منتھ تھی، وہ تھی جنات کا قبضہ۔ ایک ایک لفظ سحر انگیز تھا۔ رائٹر کو میری طرف سے بہت مبارکباد۔ اس کے بعد ہوائی مخلوق نے متاثر کیا۔ واقعی اسماء الحسنیٰ کی بدولت بہت بڑی بڑی آفات کا مقابلہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ شاعری ابھی پڑھی نہیں۔ اس لئے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ باقی کی تمام کہانیوں کا سرسری سا جائزہ لیا۔ اصل میں مصروفیات بہت تھیں۔ مگر پھر بھی ٹائم نکال کر آپ کے ڈائجسٹ کے لئے ایک کاوش تحریر کی ہے۔ پلیز کوشش کر کے بتا دیجئے گا کہ اشاعت کب تک ممکن ہے؟ اگلی بار تک کے لئے اجازت۔ اللہ حافظ۔

☆☆ انوری صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم۔ آپ کی کہانی بہت جلد شامل اشاعت ہو کر جلوہ گر ہوگی۔ آپ کے خط کا آئندہ ماہ بھی انتظار رہے گا۔

رضیہ عارف کراچی سے، جون کو ڈرڈائجسٹ اپنی تمام تر خوبصورتی اور رعنائیوں سمیت ہاتھوں میں آیا، نئے انداز کا ٹائٹل دیکھ کر خوشی ہوئی، اور جلدی سے قرآن کی باتیں پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ ایک بات فوراً ذہن میں آئی کہ آج کل ہمارے ارباب اختیار، اور کرتا دھرتا لوگ اپنی قوم کی چیخ وپکار پر کان نہیں دھرتے، ایسا لگتا ہے کہ پوری قوم کسی انجان زبان میں فریاد کر رہی ہے، کسی غیر زبان میں اپنی پریشانیوں اور دکھ وتکلیف کا اظہار کر رہی ہے، لوگ مصائب کا شکار ہیں۔ مہنگائی نے لوگوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، شب وروز لوگ دکھوں تلے دب کر بلبلا رہے ہیں، خودکشی کر رہے ہیں اپنے آپ کو جلا رہے ہیں، مہنگائی نے اتنا بے حال کر دیا ہے کہ لوگوں کا جینا دوبھر ہوگیا ہے، سب سے پیاری اپنی جان ہوتی ہے مگر یہ سوچنے کا مقام ہے اور لمحہ فکریہ ہے کہ لوگ اپنی جان کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ختم کر رہے ہیں، یعنی مہنگائی کے چکر میں پستے پستے لوگوں کا اپنا حال ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔ تو کیا، دین ودنیا کا خالق ومالک، سب سے بڑا منصف اور انصاف کرنے والا، یہ سب نہیں دیکھ رہا ہے۔ بہرحال آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ جون کے شمارے کی تمام کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں بلکہ شروع سے آخر تک تمام کہانیاں خوب سے خوب تر ہیں۔ میں ڈر

www.pdfbooksfree.pk

ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے آج بھی شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆رضیہ صاحبہ: آپ کی تمام باتیں بالکل درست ہیں۔ یقیناً اوپر بیٹھا دین و دنیا کا خالق و مالک سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

اقصیٰ رباب اوکاڑہ سے، محترم جناب ایڈیٹر صاحب! تسلیمات! میں ایسے موضوع پر لکھنے کی کوشش کی ہے جن مصائب اور بلاؤں نے ہمیں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اسے بھی آگے تفصیلاً لکھنا ہے۔ بہت طوالت ابھی باقی ہے۔ مگر میرے LLB کے پیپرز سر پر ہیں۔ پیپرز کے بعد میں اس کا بقیہ حصہ ضرور لکھوں گی۔ اس لئے کہ ہماری اندر کی موجود بلاؤں نے آج کل دنیا میں تباہی مچا رکھی ہے۔ امید ہے آپ اسے قابل اشاعت سمجھتے ہوئے مجھے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے تمام قارئین اکرام اور ڈرڈائجسٹ کی ٹیم کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ اس لئے کہ جواب میں مجھے بھی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

☆☆اقصیٰ صاحبہ: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مصروفیات کے باوجود کہانیاں ارسال کر دیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیابی و کامرانی عطا کرے، کہانی شامل اشاعت ہے۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، قابل احترام ایڈیٹر صاحب، آداب عرض! تمام اہل ڈر اور قارئین کی خیریت کا طالب ہوں۔ غزل کی اشاعت پر مشکور ہوں۔ دو غزل ارسال ہے اگلی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں۔

☆☆قدیر صاحب ہم آپ کی تہہ دل سے قدر کرتے ہیں کیونکہ لگن سے آپ ہر ماہ غزل ارسال کرتے ہیں۔ غزل شامل اشاعت ہے۔

احسان سحر میانوالی سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں ڈر کا سارا اسٹاف خیریت سے ہوگا؟ اس ماہ کا ڈرڈائجسٹ مجھے 24 تاریخ کو ملا ٹائٹل بہت زوردار تھا جس نے رسالے کو چار چاند لگا دیئے۔ قرآن پاک کی باتیں ہمیشہ کی طرح دل میں ٹھنڈک بخشتی رہیں اور محفل دوستاں اس مرتبہ کچھ سنجیدگی میں ڈوبی ملی، تبصرے اچھے رہے خاص کر۔ رضیہ عارف، رانا ظفر اقبال کے سب سے پہلے آغاز سنہری تابوت سے کیا، مصری تاریخ میں یہ ڈولی کہانی کافی سسپنس پھیلاتی رہی فرعونوں کی فرعونیت کی منہ بولتا ثبوت۔ قتل موذی، جادوئی گڑیا، خوف۔ ناگن کا انتقام، فالج زدہ، ناگ نقش، اور اذیت پسند اچھی تحریریں رہیں۔ غزلوں میں۔ محمد عثمان علی، نگہت اکرم، ذیشان اقبال عظمیٰ، فریدہ خانم، حکیم خان حکیم، پروفیسر واجد صاحب، چھائے رہے، اشعار میں۔ شمع پری، ہمارانی، امتیاز احمد، کترینہ بھی اچھی تھیں باقی اگلے ماہ، خدا حافظ۔

☆☆احسان صاحب: خط لکھنے اور کہانی کی تعریف کے لئے Thanks ، امید ہے آپ اگلے ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا نہیں بھولیں گے۔

ناصر محمود فرہاد فیصل آباد سے، جون کا ڈرڈائجسٹ وقت مقررہ پر مل ہی گیا۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ٹائٹل قابل تعریف ہے اور کہانیاں بھی دل موہ لینے والی ہیں۔ میری کہانی شائع کرنے پر بہت بہت شکریہ۔ ویسے کہانی تو میں ہر ماہ بھیجتا رہتا ہوں مگر خط ایک طویل عرصہ بعد تحریر کر رہا ہوں۔ پچھلے دنوں میری طبیعت کچھ زیادہ ناساز ہوگئی تھی اور پھر ایک بڑے غم سے واسطہ پڑ گیا۔ میری والدہ اپنے دست شفقت سے ہمیں محروم کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ میرا ایمان ہے کہ دعاؤں میں بہت اثر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول بھی کرتا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ قارئین میری والدہ کے لئے مغفرت کی دعا کریں اور ساتھ ہی ہم گھر والوں کے لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ ہم پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ میری بھی قارئین اور تمام دوست احباب و قلبی رشتوں کے لئے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی پناہ میں رکھے اور خوشیوں سے نوازے، تمام دکھ درد، اور پریشانیاں ختم کر دے اور جائز مقاصد میں کامیابی و کامرانی عطا کرے۔ (آمین)

☆☆ناصر صاحب: والدہ کا سن کر بہت دلی دکھ ہوا۔ ہماری اور قائین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، اور تمام اہل خانہ و قلبی رشتوں کو صبر جمیل عطا کرے اور سب کی پریشانیوں کو دور کر کے خوشیوں سے نوازے آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی اس وقت تک کے لئے خدا حافظ۔

محمد بشیر احمد پرواز جنڈ انوار سے، السلام علیکم! جون کا ڈرڈائجسٹ ہاتھ میں ہے۔ ٹائٹل کی تعریف کے لئے تو الفاظ

ہی نہیں مل رہے۔ بہت اچھا ٹائٹل تھا اس کے بعد تمام قارئین کے خطوط پڑھے۔ اس کے بعد سب سے پہلے ایم۔ اے راحت صاحب کی ''سنہری تابوت'' کی پہلی قسط کا مطالعہ کیا۔ جو کہ اچھا لگا۔ شمیکا کی قسط نمبر 4 بھی اچھی تھی۔ اس کے علاوہ، رولوکا، خوف، رقص موت، اور شکاری بہت اچھی تھیں۔ قوس و قزح کا سلسلہ بھی بہت اچھا ہے۔ جس میں ایس امتیاز احمد، احسان سحر، مس فوزیہ کنول اور محمد عمران نے اچھا لکھا تھا، غزلوں میں حکیم خان حکیم، شفیق رضا، منیر احمد ساغر نے اچھا لکھا تھا۔ اس دفعہ میری غزل کو دو حصوں میں شائع کیا گیا تھا۔ جب کہ غزل ایک ہی تھی۔ تو پلیز خیال کیا کریں۔ اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے بھائی منیر احمد ساغر کے والد کو مزید صحت عطا فرمائے آمین۔ اور ہمارا پیارا ڈرڈائجسٹ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

☆☆بشیر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ منیر احمد ساغر کے والد پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کر کے کلی صحت عطا کرے۔

محمد علی کراچی سے، جون کا ڈرڈائجسٹ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ میری نظر میں ڈرڈائجسٹ ایک معیاری رسالہ ہے اور یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے پاکستان کا اول نمبر ہے۔ اچھے اچھے رسالے اور بھی ہیں مگر ان میں شروع سے آخیر تک بے شمار موضوع ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ کمال ڈرڈائجسٹ کو جاتا ہے کہ ہر ماہ تقریباً ایک ہی موضوع پر اتنی ساری ہارر کہانیاں ایک جگہ کر کے ہارر پڑھنے والوں کے ذوق کی تسکین کر رہا ہے۔ وقت کے نشیب و فراز کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، بے شمار نئے رائٹر آئے اور مکمل رائٹر بن کر ڈر ڈائجسٹ سے چلے گئے۔ اور ڈرڈائجسٹ کا یہ بھی کمال ہے کہ نئے لکھنے والوں کی کہانیاں بنا سنوار کر چھاپتا ہے۔ ڈرڈائجسٹ سے منسلک تمام رائٹر دلی لگن سے کہانیاں لکھتے ہیں، تمام کی تمام قسط وار کہانیاں زبردست ہوتی ہیں، ایم الیاس اور ایم اے راحت بہت اچھا لکھ رہے ہیں مگر اے وحید کا جواب نہیں کیونکہ جس تندہی اور محنت سے رولوکا کو آگے بڑھا رہے ہیں، جس کی کامیابی اور ڈیمانڈ کا سب سے بڑھ کر منہ بولتا ثبوت یہ ہے کہ اس کی 85 ویں قسط ہمارے سامنے ہے۔ ہر قسط میں نیا نیا طور طریقہ اور موضوع نظر آتا ہے۔ زیادہ تر ہندوستانی ماحول میں لکھی گئی یہ کہانی اپنے پڑھنے والوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے اور خراماں خراماں کامیابی سے آگے ہی آگے بڑھ رہی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی قسط ذرا ہلکی رہ جاتی ہے مگر دوبارہ رائٹر کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ ڈرڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام سابقہ قسطوں نے اتنی شہرت حاصل نہیں کی اور نہ ہی اس قدر پسند کی گئی میرے خیال میں۔ میری دلی دعا ہے کہ رولوکا کی قسط اپنے پڑھنے والوں کے ذوق کا خیال رکھتے ہوئے بہت آگے جائے گی۔ اور یہ بھی دعا ہے کہ رائٹر کے قلم میں اور زور پیدا ہو۔ جون کے ماہ کی تمام کہانیاں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

☆☆محمد علی صاحب: قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف اور خاص طور سے رولوکا کی تعریف کے لئے شکریہ، ہر کہانی لوگوں کے ذہن میں اپنا مقام بناتی ہے۔ اور جب تک قارئین کی پسند جاری رہے گی۔ اس وقت تک کہانی شامل اشاعت ہوتی رہے گی۔ تمام قارئین کا شکریہ جبکہ آپ کا بھی شکریہ کہ آپ کو رولوکا اور دیگر کہانیاں پسند آتی ہیں۔

غلام نبی نوری کھڈیاں خاص سے، ماہنامہ ڈر کے تمام قارئین کو سلام! خدا کرے کہ آپ سب خیریت سے ہوں۔ یہ میرا ماہنامہ ڈر میں دوسرا خط ہے۔ نہ جانے اس مرتبہ مجھ پر کیا سختی تھی خدا کی طرف سے کہ میرا موٹر سائیکل پر سے ایکسیڈینٹ ہو گیا تھا۔ خدا نے بچا لیا۔ آپ سب سے درخواست ہے کہ میری صحت کی دعا کریں۔ سب سے پہلے ''قرآن کی باتیں'' پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ دنیاوی کام کے ساتھ ساتھ دینی تبلیغ بھی کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔ اس کے بعد کہانیوں کی وادی میں ڈوبا تو ناگن کا سفر زوہیب حسین صاحب کی کہانی نے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ اس کے بعد سنہری تابوت، بزدل روح، شمیکا، خوف، فالج زدہ، رولوکا، اور رقص موت واقعی قابل داد تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے اس بار تمام کہانیاں زبردست تھیں اس کے علاوہ اپنا خط اپنی غزل اور شعر دیکھ کر خوشی ہوئی۔

☆☆غلام نبی صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

رانا ظفر اقبال جنڈ انوار سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ اس دفعہ جون کا ڈرڈائجسٹ بہت لیٹ موصول ہوا۔ لیکن جیسے ہی ہاتھ میں آیا خوشی کی انتہا نہ رہی ٹائٹل کا تو جواب ہی نہیں۔ اس کے بعد قرآن کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملا۔

www.pdfbooksfree.pk

اس کے بعد ''ادارہ'' کا خط پڑھا۔ ایڈیٹر کی باتیں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ جو حکم خداوندی سے منہ موڑتا ہے وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا۔ ہم سے پہلی قومیں اسی لئے تباہ و برباد ہوئیں کہ انہوں نے حکم خداوندی سے منہ موڑا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جھٹلایا۔ اور ناشکرے رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو تباہ و برباد کر ڈالا اور ان کے انجام کو ہمارے لئے عبرت کا نشان بنا دیا۔ اور ہمیں چاہیے کہ ہم حکم خداوندی کو مانتے ہوئے اپنے آپ کو راہ راست پر لائیں تب ہی ہمارے اندر خوشحالی آئے گی۔ اس کے بعد تمام خطوط پڑھے۔ آپ نے میرے خط کی تعریف کی اس کے لئے ویری تھینکس۔ اس کے بعد کہانیوں کا مطالعہ کیا۔ جس میں ایم۔ اے راحت کا قسط وار سلسلہ اچھا تھا۔ ایم الیاس کا ناول بہت اچھا تھا۔ اس کے علاوہ شکاری، پیاسی دوستی، اور خوف بہت اچھی تھی۔ باقی مطالعہ جاری ہے۔ قوس وقزح میں شمع پری، شفیق رضا، ہمارانی، منیر احمد ساغر، نے بہت اچھا لکھا ہے۔ غزلوں میں احسان سحر، منیر احمد ساغر، قدیر رانا، اقصیٰ رباب، قاسم رضا، اور محمد عثمان علی کی غزلیں اچھی تھیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ، منیر بھائی کے والد کو صحت عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆ظفر صاحب: آپ کی باتیں سو فیصد درست ہیں، کاش کہ ہم لوگ احکام خداوندی پر عمل کر کے دوسروں کا احساس کریں۔ امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! آپ سب خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں آج صبح ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے شاید بارش کا امکان ہو مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ موسم بہت خوشگوار تھا دل شہر جانے کو بہت بے تاب تھا اپنے محبوب پرچے کے دیدار کے لئے میں بکسال پر پہنچا وہاں پر بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ اپنا من پسند پرچہ ڈرڈائجسٹ سے ملاقات ہوئی ایسا خوبصورت رسالہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارک قبول کریں سرورق پہلے کی نسبت بہت زیادہ دلکش اور بہتر تھا ہر عنوان پرچے کا انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ تھا مثلاً قرآن کی باتیں۔ خطوط قوس وقزح اور غزلیں پہلے سے زیادہ اچھی تھیں۔ اس بار ہر کہانی کا اپنا ایک الگ معیار تھا ہر کہانی سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ تمام قلمکاروں کو میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ خطوط میں یاد آوری کا شکریہ غزلیں شائع کرنے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں آپ کی محبت اور خلوص ہی وہ جذبہ ہے جس کی وجہ سے ہم آپ کو خط تحریر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

☆☆اسلم صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا، غزل شامل اشاعت ہے۔

عمر شرجیل خوشاب سے، السلام علیکم! امید ہے خیریت سے ہوں گے اس مرتبہ ڈرڈائجسٹ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ 24 مئی کو ملا قرآن کی باتوں کے ذریعے اپنے کمزور ایمان کو مضبوط کرنے کے بعد کہانیوں میں اذیت پسند، قتل موذی، دولہا دلہن، موت کا سفر اور ایم الیاس صاحب کی رقص موت متاثر کر گئی رولو کا ابھی تک پڑھی نہیں بشیر احمد پرواز شمع پری، شفیق رضا اور رانا ظفر اقبال کے اشعار پسند آئے ڈرڈائجسٹ ماہ بہ ماہ ترقی کر رہا ہے خوبصورت اور ڈراؤنا ٹائٹل دیکھ کر محبت بڑھ جاتی ہے دعا ہے کہ اللہ آپ سب کو موجودہ نامساعد حالات میں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔

☆☆عمر صاحب: چلئے اس مرتبہ بھی آپ کا خط شائع ہو گیا خوش ہو جایئے۔ آئندہ بھی امید ہے کہ خط لکھنا بھولیں گے نہیں۔

عبدالحمید ساگر کنڈیاں سے، امید ہے کہ مزاج اچھے ہوں گے۔ آپ لوگوں نے اب تک مجھے یاد رکھا ہوا ہے، آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہی، جو سالوں کسی کو یاد رکھتے ہیں۔ جس سے مطلب نہ ہو اس کو تو یہ دنیا ایک پل میں بھلا دیتی ہے۔ ڈرڈائجسٹ کا اور اس کی پوری ٹیم کا بہت بہت شکریہ۔ ایک نئی چھوٹی سی کوشش کی ہے۔ اسے میں نے ان پیج میں ٹائپ کیا ہے۔ اس سے پہلے آپ کو چار کہانیاں بھیجی تھیں۔ اب یہ اپنے آفس سے بھیج رہا ہوں۔ لیکن ایڈریس میرے گھر کا ہے۔ ڈر کے لئے دعا گو ہوں کہ یہ دن رات ترقی کرے (آمین) تمام دوستوں کو سلام۔ خدا حافظ۔

☆☆عبدالحمید صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر محاذ پر کامیابی و کامرانی عطا کرے۔ امید ہے ہماری خوشی کے لئے آئندہ بھی خط لکھتے رہیں گے۔ کہانی شامل اشاعت ہے۔

نسیم کنول کہروڑ پکا سے، السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ ہم علی پور کا نحو میں رہتے ہیں۔ آپ کا ڈرڈائجسٹ بڑے عرصے

سے پڑھ رہے ہیں۔ مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ہماری ملاقات دلکش امیر پوری سے ہوئی تو ان کے ہاتھ میں ناول تھا ہم نے اسے کہا اس کیوزی امیر پوری نے کہا جی فرمایئے ہم آپ کی کیا سیوا کر سکتے ہیں۔ نیا ڈرباز ار میں آ گیا ہے۔ جی ہاں آپ کا نام انہوں نے کہا ناول بس پڑھ لیجئے گا۔ ہم نے کہا کہروڑ پکا سے آپ لکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا جی ہاں تو پھر انہیں کے کہنے پر ہم نے خط لکھنے کی جسارت کی اس کے ساتھ ہم ایک چھوٹے سی شاعرہ ہیں۔ آپ کی خدمت میں ایک غزل پیش ہے۔

☆☆نسیم صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید۔ امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقعہ دیں گے۔ غزل شامل اشاعت ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی کراچی سے، ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کا شمارہ جون موسم گرما کی سخت تھکا دینے والی گرمی اور قارئین کا خون کھولا دینے والے دماغ کا پارہ ہائی لیول پر پہنچا دینے کے ساتھ قارئین کے ہاتھوں کی زینت بن چکا ہے۔ حسب سابق دستور کے مطابق ہولناک، خوفناک دہشت انگیز راتوں کی نیند حرام کرنے والی سسپنسیوں کہانیوں اور دلفریب نظموں غزلوں قطعات اشعار کے ساتھ جلوہ گر ہے سرورق کا جواب نہیں ہے۔

☆☆واجد صاحب: ڈرڈائجسٹ سے آپ کی چاہت قابل دید ہے۔ آپ ہر ماہ حسین خلوص سے شمارے کو یاد کرتے ہیں جس کے لئے ویری ویری تھینکس امید ہے آئندہ بھی اس خلوص کا اظہار کرتے رہیں گے۔

دلکش امیر پوری کہروڑ پکا سے، السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ شریک محفل ہیں۔ خداوند کریم سے امید رکھتے ہیں ڈرکا پورا (اسٹاف) پڑھنے اور لکھنے والے خوش وخرم ہوں گے۔ خداوند کریم رائیٹروں کے قلم میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین جناب اس بار بھی ایک غزل پیش خدمت ہے امید کرتے ہیں ردی کی ٹوکری کا مقدر نہیں بنے گی۔

☆☆دلکش صاحبہ: خوش ہو جایئے آپ کی غزل ردی کی ٹوکری سے بچ گئی۔ اور آئندہ ماہ بھی ردی کی ٹوکری سے دور ہی رہے گی۔

شرف الدین جیلانی نٹڈوالہار سے، آپ سب کی خیریت کے بعد خالد صاحب نے ایک اہم مسئلہ کی طرف خطوط میں توجہ دلائی ہے پیپر زکا استعمال خالد صاحب کی سوچ قابل تعریف ہے۔ سنہری تابوت خوش آمدید، بلیک ٹائیگر کا انتظار رہے گا غزلوں میں بہت دوستوں سے ملاقات، سب کے لئے دعا گو۔

☆☆شرف الدین صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوتی ہے، آپ کا ذوق وشوق قابل تعریف ہے۔ آئندہ ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ رواں کا ڈرڈائجسٹ ہمارے سامنے ہے دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے اسٹوریز کا انتخاب لاجواب رہا۔ میگزین خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے آرٹیکلز لگانے کا شکریہ..... آرٹیکلز آپ کے پاس ہیں پلیز دیکھئے گا..... مزید میٹر میں خوفناک وکٹوریہ، مراسلہ، غزل ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ڈرڈائجسٹ کے تمام خوبصورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوبصورت پڑھنے والے وویورز کو دعا سلام۔

☆☆امتیاز صاحب: بہت بہت شکریہ آپ ہر ماہ قلبی لگاؤ کے ساتھ اپنی کاوشیں پابندی سے ارسال کرتے ہیں۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

ساحل دعا بخاری بصیر پور سے، السلام علیکم ڈرڈائجسٹ ایک معیاری ڈائجسٹ ہے، تاہم باقاعدگی سے نہیں پڑھتے، لیکن اب پڑھیں گے۔ عرصہ قبل شائع ہونیوالی تحریر ''جادوگر'' ہم آج تک فراموش نہیں کر پائے۔ غالباً ایم الیاس کی تھی۔ باقی تحریریں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ہم اپنی چند تحریریں حاصل محبت اسیر انتظار اور یہی تھی وہ پلیز نوک پلک سنوار کر شائع کر دیں چند طویل تحریریں بھی لکھ رکھی ہیں اجازت ہو تو بھیج دیں؟ اگر آپ شائع کریں تو ہم وہ بھیجیں گے ورنہ نہیں.....

☆☆ساحل صاحب: آپ اس بات کا خیال رکھئے گا کہ ڈرڈائجسٹ کا اصل موضوع پار رہے، اس موضوع پر لکھی کہانیاں ارسال کر سکتے ہیں۔ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئی، لیکن ہو سکتا ہے کوئی ایک کہانی اگلے ماہ شائع ہو جائے، ابھی قسط وار کہانی کی گنجائش نہیں ہے ''پانی کی پری'' بھیج دیں دیکھ کر کوئی حتمی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

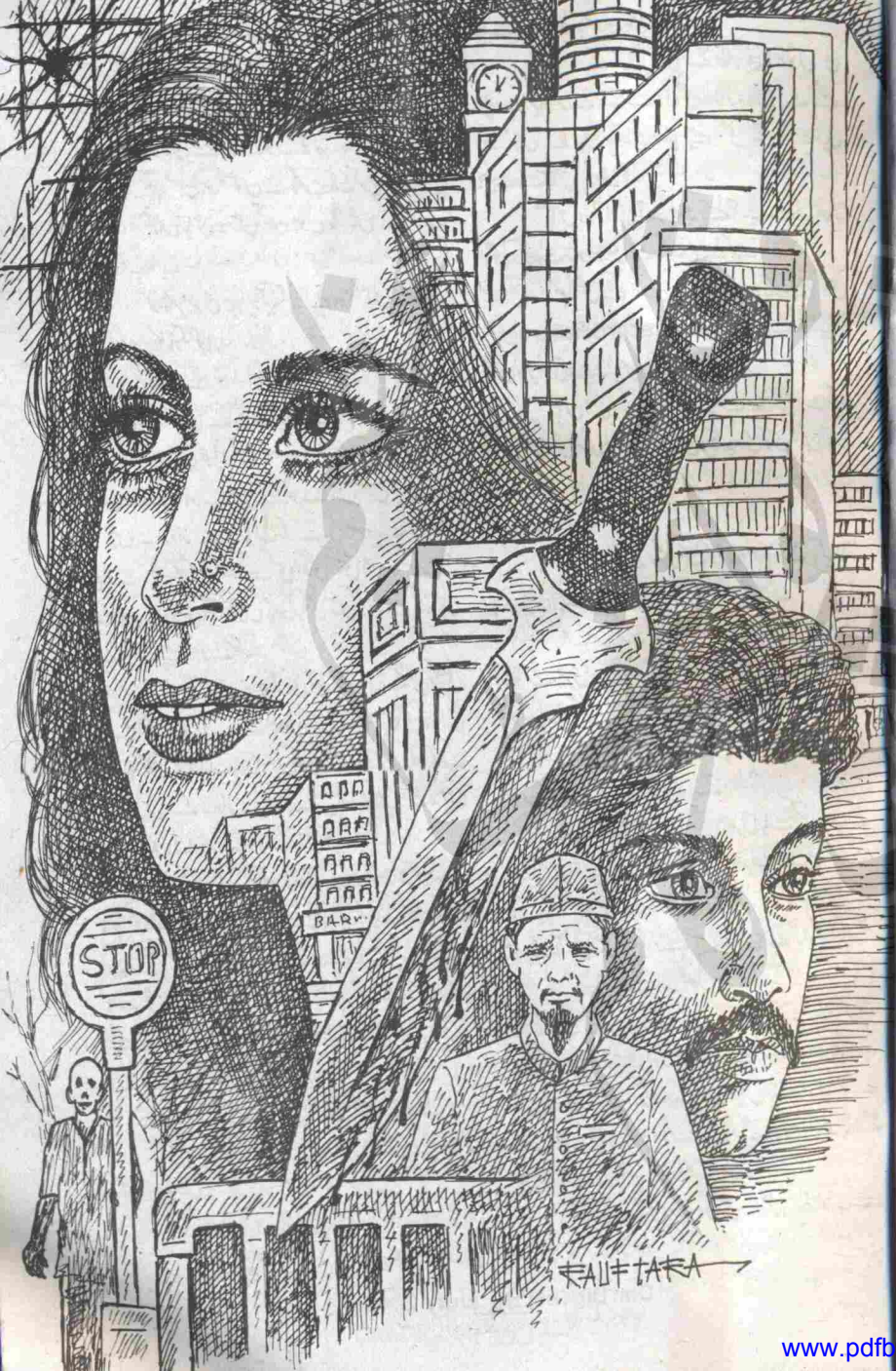

اماوس کا غلام

ذیشان اقبال عظمی۔کراچی

نوجوان کے پاس ایک عجیب مورتی تھی جو کہ طاقت کا سر چشمہ تھی، اس مورتی نے نوجوان کو فرش سے بام عروج پر پہنچا دیا، اور پھر اس مورتی کے غائب ہوتے ہی وہ نوجوان عقل سلیم سے بے گانہ ہو گیا مگر پھر اچانک.....

اچنبھے میں ڈالتی ہوئی ماورائی مخلوق کی ایک حقیقی داستان جو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دے گی۔

کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کو سننے کے لئے آپ کے کان ہمیشہ ترستے رہتے ہیں۔ وہ الفاظ جن کو سننے سے جلترنگ سی بج اٹھیں۔ جو کبھی ایک بار نہیں تو دل چاہے کہ بار بار سنتے ہی چلے جائیں۔ لیکن یہ بھی ایک کڑوی حقیقت ہے کہ کچھ ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جنہیں سننے سے ہمیں سخت چڑ ہوتی ہے۔ ہماری شدید خواہش ہوتی ہے کہ یہ الفاظ ہمیں کبھی نہ سننا پڑیں لیکن تجربہ یہ کہتا ہے کہ جس چیز کی آپ خواہش کریں وہ آپ کو کم ہی ملا کرتی ہے اور جس چیز سے آپ بھاگنا چاہیں تو وہ گھوم پھر کر آپ کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی آج کل ایسا ہی ہو رہا تھا۔ اور اس وقت تو میں سر سے پیر تک سلگ کر رہ گیا جب چپراسی نے تیسری بار میری میز پر آ کر کہا۔

"آپ کو باس نے بلایا ہے۔" جی ہاں دوستو! یہی ہیں وہ منحوس الفاظ جنہیں سننے سے مجھے سخت چڑ تھی اور شومئی قسمت دیکھئے کہ روزانہ دن میں کئی بار یہ الفاظ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند انڈیلے جاتے تھے۔ آپ کو یقیناً اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میرا باس کس قسم کا ہو گا اور میرے روابط باس سے کس نوعیت کے ہوں گے۔ چلئے میں خود ہی وضاحت کیے دیتا ہوں کہ میرا باس ایک روایتی باس تھا جس کی نظر میں اس کے سوا سبھی نکمے سست اور کام چور تھے۔ کسی کو بھی اپنے کمرے میں بلانے کا بنیادی مقصد اسے ذلیل کرنا ہوتا تھا۔ ماسوائے ان چند خوشامدی چمچوں کے جو باس کی شرٹ پر لگے سالن کے دھبے کی بھی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے کہ یہ اس پر بہت جچ رہا ہے۔ یہ لوگ باس کی نظر میں باصلاحیت، پیشہ ور، غلطیوں سے مبرا کمپنی کے لئے سرمایہ اور دوسروں کے لئے مثال تھے۔ بدقسمتی سے میں ان لوگوں میں شامل نہیں تھا لہٰذا دل ہی دل میں اپنی قسمت کو کوستا ہوا چپراسی کے پیچھے چل پڑا۔ جب میں باس کے کمرے میں داخل ہوا تو باس بظاہر شدید مصروف نظر آ رہا تھا۔ میز پر فائلیں کھلی پڑی تھیں اور باس فون پر کسی کو ڈانٹنے میں مصروف تھا۔ میں خاموشی سے جا کر باس کی میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد باس نے فون پٹخا اور مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر چونک پڑا۔

"تم کیسے آئے؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"دروازے سے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کیوں آئے ہو؟" اس نے جھنجلا کر پوچھا۔

"آپ سے ملنے۔" میں نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

"مجھ سے ملنے؟ میں نے کیا دعوت پر مدعو کیا تھا تمہیں؟" اس نے بھنا کر کہا۔

"وہ..... دراصل..... چپراسی نے بتایا..... کہ آپ نے بلایا تھا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تم احسن ہو؟" اس نے پھر چونک کر پوچھا۔

"نہیں باس۔ میں محسن ہوں۔" میں نے ادب سے جواب دیا۔

"تو پھر میری میز پر کیا کر رہے ہو؟" اس نے زور سے میز پر مکا مار کر کہا۔

"باس مجھے تو..... اس چپراسی نے پیغام دیا..... اس لئے....." میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"چپراسی کوئی بھی نام لے تو کیا تم بیوقوفوں کی طرح دوڑتے ہوئے میرے کمرے میں گھس جاؤ گے؟ تمہیں نہ دروازے پر ناک کرنے کی ضرورت ہے نہ اجازت لینے کا کوئی تکلف۔ کسی اچھی کمپنی میں کام کرنے کے ادب و آداب تو تمہیں چھو کر بھی نہیں گزرے۔" باس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں تو ہمیشہ پوچھ کر ہی آتا تھا باس۔ لیکن پچھلی ماہانہ میٹنگ میں آپ نے اعلان کیا تھا کہ آپ بھی ہماری طرح کمپنی کے ایک ملازم ہیں کوئی فرعون نہیں۔ اور آپ کے آفس کے دروازے ہمارے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے باس کو یاد دلایا۔

"اچھا! تو اب تم میری رحم دلی اور دوستانہ طبیعت کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ گے؟" باس نے فوراً پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ "آفس کے دروازے کھلے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جب جی چاہے منہ اٹھا کر بغیر پوچھے آفس میں گھس جاؤ۔ مجھے تمہاری فائل ایک بار پھر ذرا غور سے دیکھنی پڑے گی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

میں بے بسی سے کھڑا باس کی شکل دیکھنے لگا۔

"میرے لئے کیا حکم ہے باس؟" میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

"اچھا! ہاں۔ اب تم آ ہی گئے ہو تو....." باس کرسی پر یوں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا جیسے کوئی شیر اپنے شکار پر جست لگانے سے پہلے ہاتھ پیر سمیٹتا ہے۔

"میں نے تمہیں کمپنی کے ظاہری اثاثوں کی رپورٹ تیار کرنے کے لئے دی تھی۔ لاؤ وہ رپورٹ مجھے دو۔" اس نے یوں ہاتھ بڑھایا جیسے ابھی میں اسے اپنی جیب سے نکال کر دوں گا۔

"باس وہ تو ابھی آدھ گھنٹہ پہلے آپ سے کہا تھا۔ ابھی رپورٹ تیار ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم قطعی نکمے انسان ہو۔ اچھا وہ بینک ری کونسی لیشن (Bank reconsiliation) نکالو۔ اسے دیئے تو کافی دیر ہو گئی ہے۔" باس نے دوسرا وار کیا۔

"باس میں وہی کر رہا تھا کہ آپ نے رپورٹ بھجوا دی اور کہا ابھی کرو۔" اس لئے میں بینک ری کونسی لیشن چھوڑ کر رپورٹ بنانے بیٹھ گیا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟؟ تم نے ابھی تک کوئی کام پورا نہیں کیا؟" باس یوں اچھلا جیسے کرسی میں کوئی بچھو نکل آیا ہو۔

"اب یہ مت کہنا کہ تم نے اس سہ ماہی کی اکاؤنٹ سمری ہیڈ آفس نہیں بھیجی۔" اس نے مجھے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"سمری تو تیار ہے باس لیکن..... وہ..... آفس کی فیکس مشین کام نہیں کر رہی اس لئے....."

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میری بات مکمل ہونے سے پہلے باس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"اوہ میرے خدا! کیسے نالائق اور کام چور لوگ میرے آفس میں کام کر رہے ہیں۔" اس نے کراہ کر کہا۔

"میری بات کان کھول کر سن لو۔ تمہیں تنخواہ کام کرنے کی ملتی ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر عیاشی کرنے کی نہیں۔ میرے یہاں ٹرانسفر ہونے سے پہلے جو کچھ ہوتا رہا اب نہیں ہوگا۔ وہ دن گئے جب محسن میاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب یہاں وہی لوگ رہیں گے جو کام کرنا جانتے ہیں۔" اس نے طیش کے عالم میں کہا۔

"سر فاختہ خلیل میاں کی تھی۔" میں نے ادب سے کہا۔

"ہیں؟ کیا مطلب؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"وہ..... آپ نے کہاں کا وہ دن گئے جب محسن میاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ دراصل محاورہ یوں ہے کہ وہ دن گئے جب خلیل میاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"واٹ ربش ازدس!" اس نے گرج کر کہا۔ "میں کیا کہہ رہا ہوں اور تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے اور ہاں۔ آج یہ سارے کام مکمل کئے بغیر تم گھر نہیں جاؤ گے۔ اگر کل صبح آتے ہی مجھے یہ کام نہیں ملے تو اپنی نوکری کی خیر منا لینا۔ اب جاؤ اور مجھے کام کرنے دو۔" اس نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے کوئی مکھی اڑا رہا ہو۔ میں مجرموں کی طرح سر جھکائے آفس سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی میں نے ایک گہری سانس لی اور رومال سے ماتھے پر پسینہ پونچھا اور اپنی میز کی طرف بڑھ گیا۔ میں حتی الامکان تیزی سے کام کرنا چاہتا تھا تاکہ مجھے دیر تک آفس میں نہ رکنا پڑے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ میں پارٹ ٹائم میں ایک جنرل اسٹور پر کام کرتا تھا اور اس کا مالک میرے آئے دن دیر سے آنے پر بے حد نالاں تھا۔ ابھی میں نے کام کرنا شروع ہی کیا تھا کہ چپراسی نے مزید تین چار فائلیں لا کر میری میز پر پٹخ دیں۔

"منیجر صاحب کا حکم ہے کہ ان فائلوں کو چیک لسٹ کے حساب سے دیکھیں اور غیر موجود کاغذات لگا کر ساری فائلیں منور صاحب کو بھیج دیں۔" چپراسی روکھے لہجے میں حکم سنا کر چلتا بنا۔ نتیجتاً مجھے اس روز آفس میں تقریباً رات ساڑھے دس بجے تک رکنا پڑا۔ آفس سے نکل کر میں بھاگم بھاگ جنرل اسٹور پر پہنچا۔ اسٹور کے مالک کا نام بشیر احمد تھا لیکن سب اسے بشیر بھائی کہہ کر بلاتے تھے۔ بشیر بھائی اس وقت تین چار گاہکوں کے ساتھ لین دین میں مصروف تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ گاہکوں کو سامان دینے میں شامل ہو گیا۔ گاہکوں کی موجودگی کی وجہ سے بشیر بھائی مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ سارے دن آفس کے کام اور ذہنی تھکن کی وجہ سے اسٹور پر بھی مجھ سے غلطیوں پر غلطیاں ہوتی رہیں۔ کبھی کسی گاہک کا سامان کسی اور کو تھما دیا۔ کسی سے پیسے لے کر واپس دینا بھول گیا۔ شکر خدا کا کسی کو غلطی سے زیادہ پیسے نہیں تھما دیئے۔ یہ جنرل اسٹور سڑک کنارے ایک بس اسٹاپ کے پاس واقع تھا اور یہاں رات گئے تک گاہکوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ رات قریب ایک بجے جب ہر طرف سناٹا پھیلنے لگا تو بشیر بھائی نے بھی دکان بند کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ میں خاموشی سے ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ مجھے بشیر بھائی کی بے نقط نہ سننی پڑیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ آپ جس چیز سے بچنے کی کوشش کر رہے ہوں وہی گھوم پھر کر آپ کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ دکان کا شٹر گرانے کے بعد میں چپکے سے ایک طرف سرکنے لگا تھا کہ بشیر بھائی نے پیچھے سے آواز دی۔

"ٹھہرو۔" میں اس بچے کی طرح سر جھکائے واپس آ گیا جو امتحان میں نقل کرنے کے بعد بھاگنے کے چکر میں ہو لیکن عین موقع پر دھر لیا گیا ہو۔

"خیریت ہے؟ آج کچھ دیر ہو گئی؟" خلاف توقع انہوں نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

"دراصل بشیر بھائی۔ دفتر میں کچھ ضروری کام آ گیا تھا۔" میں نے حوصلہ پا کر کہا۔

"تو پھر اپنے دفتر میں ہی جا کر سر کھپاؤ۔ یہاں میری جان پر عذاب کیوں بنے ہوئے ہو؟" ان کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ "ایک تو آئے دن دیر سے آتے ہو پھر چیزوں کا اتنا نقصان کرتے ہو، اگر میں حساب لینا شروع کروں تو شاید تمہاری پوری تنخواہ اس میں ڈوب جائے۔ تمہیں میں نے اپنی مدد کے لئے رکھا تھا لیکن تمہارے آنے کے بعد تو مجھے پہلے سے زیادہ محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ ایسے تو نہیں چلے گا۔" انہوں نے اڑے بھینسے کی طرح ناک سے شوں شوں کرتے ہوئے کہا۔

"میں معذرت خواہ ہوں بشیر بھائی۔ بس ایک موقع اور دے دیں آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"میاں یہ تو تم پچھلے کئی ماہ سے کہہ رہے ہو۔"

www.pdfbooksfree.pk

تمہاری بات پر یقین کرنے کو دل تو نہیں چاہتا لیکن کیا کروں میری رحم دلی اور نرم طبیعت آڑے آتی ہے۔ اب کی بار چھوڑ رہا ہوں لیکن اگر آئندہ بھی یہی چلتا رہا تو پھر اپنا بندوبست کہیں اور کر لینا۔" انہوں نے خشک لہجے میں کہا اور اپنی ویسپا کی طرف بڑھ گئے۔ میں سر جھکائے گھر کی سمت پیدل چلنے لگا۔ پیدل چلنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو اتنی رات گئے بس کا ملنا محال تھا، دوسرے رکشہ ٹیکسی، کرنے سے جیب پر پڑنے والا بوجھ استطاعت سے باہر تھا۔ اس لئے میں تقریباً روز ہی آدھ گھنٹہ پیدل چل کر گھر پہنچتا تھا۔ کبھی قسمت سے راستے میں کوئی بس مل جاتی یا کوئی نیک دل موٹر سائیکل والا لفٹ دے دیتا تو الگ بات تھی۔

میں تھکا ہارا گھر پہنچا تو بچے سو چکے تھے۔ میری بیوی اسماء آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی لیکن وہ ابھی تک میرے انتظار میں سوئی نہیں تھی۔ مجھے گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔

"آ گئے آپ۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیں۔ میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔" میں باتھ روم میں گھسا تو منہ ہاتھ دھونے کے بجائے نہانے بیٹھ گیا۔ تھکن ہی اتنی شدید ہو رہی تھی کہ سوچا نہانے سے کچھ فرق پڑ جائے۔ کھانا کھاتے ہوئے میں نے اپنے دو پھول سے معصوم بچوں کو دیکھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند میں کھوئے ہوئے تھے۔ مجھے صرف چھٹی کے دن ہی ان سے ملنا نصیب ہوتا تھا۔ صبح کام پر نکلتے وقت وہ سو رہے ہوتے تھے اور واپسی کے وقت بھی وہ سو چکے ہوتے تھے۔

"آپ ابا میاں کی دوا لے آئے؟" اسماء نے مجھ سے پوچھا تو میری محویت کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"آں..... ہاں؟ کیا کہا تم نے؟" میں نے چونک کر اسماء سے پوچھا۔

"آپ کے ابا کی کھانسی کی دوا۔ صبح آپ سے کہا تھا لے آیئے گا۔ ختم ہونے والی ہے۔" اسماء نے کہا تو میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"میں بالکل بھول گیا۔ آج کا دن ویسے ہی ٹینشن میں گزرا۔ حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ رات میں دکانیں بند ہونے سے پہلے دوا لے لوں گا لیکن....." میں نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"آپ اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ مجھے پتہ ہے آپ اکثر بھول جاتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دوا باقی ہے۔ آج ہو جائے گی۔" اسماء نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ کھانے کے بعد جب میں سونے کے لئے لیٹا تو میری آنکھیں نیند سے جل رہی تھیں لیکن میرے دماغ میں موجود خیالوں کا بھونچال مجھے سونے نہیں دے رہا تھا۔ بار بار میرے ذہن میں یہی خیال آ رہا تھا کہ میں ایک ناکام انسان ہوں۔ یہ کوئی نیا یا اچھوتا خیال نہیں تھا۔ مجھے اس بات کا اچھی طرح ادراک تھا کہ میری اب تک کی پوری زندگی ناکامیوں سے لڑتے ہوئے گزری تھی۔ مجھ میں کوئی صلاحیت، کوئی کمال موجود نہیں تھا۔ اب تو میں ایک ناکام زندگی گزارنے کا عادی ہو چکا تھا۔ بس کبھی کبھار جب زمانے کے تھپیڑوں کی شدت بہت شدید ہو جاتی تھی تو اپنی بری قسمت اور خراب حالات پر رونا آنے لگتا تھا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، یہی کچھ دیکھتا اور سنتا آ رہا تھا۔ غریب گھر کا بچہ ہونے کی وجہ سے ماں باپ میری نشوونما پر کوئی خاص توجہ نہ دے سکے۔ میری جسمانی صحت شروع سے ہی کمزور رہی دماغ بھی کوئی ایسا خاص نہ تھا سرکاری اسکول میں داخلہ تو مل گیا لیکن ہر ٹیچر مجھے غبی اور ناکارہ طالبعلم کے نام سے جانتا تھا۔ کئی جماعتوں میں یکے بعد دیگرے فیل ہو ہو کہ میں نے بڑے مشکل سے میٹرک کیا۔ میں کالج جانا چاہتا تھا لیکن اسکول میں دوسرے بچوں کی حقارت بھری نظریں اور طنز آمیز فقرے اکثر میرے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ ٹیچروں کی ڈانٹ اور ہتھیلیوں پر کھائے ہوئے ڈنڈوں سے اب بھی میری ہتھیلیاں سلگتی تھیں۔ ان تمام چیزوں سے بچنے کے لئے میں نے پرائیوٹ انٹر کیا۔ اسی دوران میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ ان کے گزر جانے کے بعد ابا میاں بھی بجھے بجھے رہنے لگے۔ کوئی رہنمائی نہ ہونے کہ وجہ سے میں نے اپنی زندگی کے لئے کئی غلط فیصلے کئے جن میں سے ایک

گریجویشن کی جگہ چھ ماہ کا اکاؤنٹنگ کورس کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ دو سال کی پڑھائی چھ ماہ میں ہو جائے گی۔ ویسے بھی اداروں کو کام کی ضرورت ہوتی ہے ڈگری کی نہیں۔ کورس کرنے کے بعد میں نے اچھی نوکری کے لئے کافی دھکے کھائے لیکن مکمل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کامیابی نہ ملی۔ تنگ آ کر میں نے دکانوں اور بچت بازاروں میں سیلز مین کا کام شروع کر دیا۔ گو یہاں بھی میں اپنی غائب دماغی اور بولنے کے فن سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے کئی بار نکالا گیا لیکن شہر میں ہزاروں دکانیں تھیں۔ کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جاتی تھی۔

ابا میاں ریٹائر ہو چکے تھے اور تنہائی کا شکار تھے۔ ان کی فرمائش پر میری پھوپھی نے کچھ بھاگ دوڑ کر کے میرا رشتہ اسماء سے طے کر دیا اور کچھ عرصے بعد اسماء سادگی سے دلہن بن کر میری زندگی میں آ گئی۔ میری برباد زندگی میں اگر کوئی اچھا کام ہوا تھا تو وہ اسماء سے میری شادی تھی۔ اسماء نے میری محرومیوں اور ناکامیوں سمیت مجھے دل سے اپنایا اور ہر اس موقع پر مجھے سہارا دیا جب میں کہیں ٹھوکر کھا کر گرا۔ گو اس بدنصیب کو بھی میری وجہ سے قدم قدم پر دکھ اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر آفرین ہے اس وفا کی پتلی پر جس نے کبھی شکایت کا ایک حرف زبان پر نہیں آنے دیا۔ لیکن آج پھر تذلیل اور احساس ذلت سے میرے دماغ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ آخر یہ کب تک میرے ساتھ ہوتا رہے گا۔ آخر ایسا کون سا گناہ کیا تھا میں نے جس کی پاداش میں میری قسمت تباہ کر دی گئی تھی۔ میرے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ نہ اچھی شکل وصورت، نہ تعلیم، نہ پیسہ، نہ ذہانت، نہ ہی مجھے کوئی دوست بنانا پسند کرتا تھا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا غلط ہو جاتا تھا، جو فیصلہ کرتا تھا اس پر پچھتانا ہی پڑتا تھا۔ سب لوگ میری مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ کیا مجھے ایک کامیاب اور باعزت زندگی گزارنے کا حق نہیں تھا؟ نہ جانے کب تک میں لیٹا اسی طرح کڑھتا رہا اور آنسوؤں کے گرم گرم قطرے خاموشی سے میرے گالوں سے پھسل کر تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ مجھے نہیں یاد کہ میں کب سویا۔ دکھ اور اذیت کی ایک رات بھی گزر رہی گئی۔

جب میں نیند سے جاگا تو میری پلکیں بوجھل تھیں اور جسم کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ میں کچھ دیر یونہی لیٹا آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد جب ذرا سکسلندی کم ہوئی تو میں نے کمرے کی کھڑکی پر نظر ڈالی۔ تیز روشن دھوپ کھڑکی کی جالیوں سے چھن چھن کر کمرے میں پھیل رہی تھی۔

کمرے میں ایسی جگمگاتی دھوپ کو آتا دیکھ کر مجھے کچھ فرحت محسوس ہوئی۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

"کہیں مجھے دفتر سے دیر تو نہیں ہو گئی؟" میں نے پھرتی سے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن شاید نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے دماغ اور جسم پوری طرح مستعد نہیں تھے۔ نتیجتاً میں اٹھتے اٹھتے دھپ سے دوبارہ بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت اسماء کمرے میں داخل ہوئی۔

"اٹھ گئے آپ؟ رات کیا ہو گیا تھا آپ کو؟ نیند میں بڑبڑاتے رہے۔ بخار بھی تھا آپ کو۔" اسماء نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"وقت کیا ہوا ہے اسماء؟ مجھے دفتر سے دیر ہو جائے گی۔" میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بے تابی سے پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ صبح میں نے آپ کو جگایا تھا۔ پوچھا بھی تھا کہ دفتر جانا ہے یا نہیں۔ آپ نہیں کہہ کر دوبارہ سو گئے۔ آپ کی خراب طبیعت کی وجہ سے میں نے بھی خیال نہیں کیا۔" اسماء نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تو میں نے بے اختیار ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ باس کی قہر آلود نظروں اور ڈانٹ پھٹکار کا خیال آتے ہی دل میں ہول سا اٹھنے لگا۔ اسماء نے شاید میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

"کیوں اتنا پریشان ہو رہے ہیں آپ؟ ایک روز چھٹی کر لیں گے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ روز آپ اتنی جان کھپاتے ہیں۔ ایک روز تو دفتر والے بھی خیال کر لیں گے۔" اسماء نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

"نہیں اسماء۔ باس کا موڈ ویسے ہی آج کل خراب ہے اور ویسے بھی بڑی مشکل سے اتنی اچھی نوکری ملی ہے۔ مجھے جانا ہی پڑے گا۔ دیر ہونے کا کوئی بہانہ بنا دوں گا۔" میں نے بستر سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر میں ناشتہ لگا دیتی ہوں۔" اسماء نے سعادت مندی سے کہا اور پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

جلدی جلدی الٹا سیدھا ناشتہ کرنے کے بعد میں بھاگم بھاگ دفتر پہنچا۔ سارے راستے میں سوچتا رہا کہ ایسا کیا بہانہ بناؤں جس سے کام چل جائے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دروازے پر ہی چوکیدار نے مجھے روک کر بتایا کہ آج میری غیر حاضری لکھی جا چکی ہے اور صاحب نے ہدایت کی ہے کہ اگر میں آؤں تو مجھے واپس بھیج دیا جائے۔

میں مایوس قدموں سے پلٹ ہی رہا تھا کہ چوکیدار نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے لفافہ کھول کر دیکھا۔ وہ میرے نام ایک وارننگ لیٹر تھا جس کے تحت مجھے تین روز کے لئے نوکری سے معزول کر دیا گیا تھا اور اگلی بار غیر اعلانیہ چھٹی کی صورت میں نوکری سے برخاست کرنے کی دھمکی تھی۔ میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح وہ لفافہ ہاتھ میں پکڑے باہر نکل آیا۔ سڑک پر پہنچ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ گھر واپس جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں کسی ارادے کے بنا مرے مرے قدموں سے فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ میرا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر واقع سینکڑوں دفاتر میں سے ایک تھا۔ میں یونہی چلتا چلتا ایٹی جیٹی کے پل تک آ پہنچا۔ پل کے آس پاس عموماً آوارہ گردوں اور تفریح کی غرض سے آئے لوگوں کا رش لگا رہتا تھا مگر اس وقت دفاتر میں کام کا وقت ہونے کی وجہ سے رش بہت کم تھا۔ میں پل پر کھڑا ہو کر خاموشی سے نیچے گرتے پانی کو دیکھتا رہا۔ میرے ہاتھ میں موجود لفافہ ہوا سے پھڑ پھڑاتا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے لفافہ بھی پھڑ پھڑا کر مجھے لعن طعن کر رہا ہو۔ میں نے لفافہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اڑتے ہوئے لفافے کو دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میرا بھی دل چاہا کہ میں اس لفافے کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں اور ساری فکروں سے آزاد ہو کر ہوا میں اڑتا پھروں۔ سوچتے سوچتے میری نظر دوبارہ گہرائی میں گزرتے پانی پر جم گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے پانی مجھے اپنی طرف بلا رہا ہو۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ آؤ مجھ میں سما جاؤ۔ چھوڑو زندگی کے جھمیلے۔ پل سے کود جاؤ اور ختم کرو یہ سارا قصہ۔ یہ زندگی تم جی رہے ہو یہ تو موت سے بھی بدتر ہے۔ بس تھوڑی سی ہمت کرو اور سارے دکھ، ساری تکلیفیں سب مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ میں کسی سحر زدہ معمول کی طرح پل کی ریلنگ پر آہستہ آہستہ جھکنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے جھکتا دیکھ کر لہریں پرجوش ہو رہی ہوں۔

"آ جاؤ محسن! آؤ ناں..... شاباش..... بس تھوڑا اور جھکو گھبراؤ مت۔ تمہیں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔ دائمی سکون۔ آرام ہی آرام۔ ہر فکر سے نجات۔" لہریں اچھل اچھل کر مجھ سے کہہ رہی تھیں اور میں ان کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔

"گھاٹے کا سودا کر رہا ہے تو۔" اچانک کہیں سے ایک آواز آئی۔ "اور میں بے اختیار چونک کر سیدھا ہو گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ شاید یہ میرا وہم ہے۔ میرا دماغ مجھے روکنا چاہتا ہے اس لئے ایسی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میں نے پھر حوصلہ مجتمع کیا اور پل کی ریلنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کودنے کا ارادہ کیا۔

"اگر زندگی اتنی بے کار ہے تو مجھے بیچ دے۔" اس بار آواز کہیں نیچے کی طرف سے ابھری تھی۔ میں نے بوکھلا کر اپنے پیروں کے آس پاس دیکھا۔ تب میری نظر اس مجہول سے شخص پر پڑی جو میرے قریب ہی فٹ پاتھ پر دیوار سے ٹیک لگائے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ کب یہاں آیا تھا۔ اس کے انداز سے تو یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کافی دیر سے یہیں براجمان ہو۔ میں نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ بڑھے ہوئے بے ترتیب بال، الجھی ہوئی داڑھی، سیاہ ہونٹ، کیچڑ بھری میلی آنکھیں اور پھٹا پرانا میلا لباس۔ مجموعی پر یہ آدمی کوئی پاگل یا نشے باز نظر آتا تھا۔ میں نے کراہیت سے منہ پھیرا اور پلٹ کر واپس جانے لگا۔

"پھر واپس جا رہا ہے اپنی چھوٹی قسمت لے کر۔ پھر اسی ناکام زندگی کو گھسیٹتا پھرے گا۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ میں نے پلٹ کر الجھن بھری نظروں سے اس فقیر نما شخص کو دیکھا۔

"تیرا وقت بدل رہا ہے۔ اب کے غلط فیصلہ کیا تو بڑھاپے تک حالات کے بھنور میں چکر کھاتا رہے گا۔ نہ جیئے گا نہ مرے گا۔" اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس فقیر نما شخص کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے سامنے پہنچ کر میں اکڑوں بیٹھ گیا۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہا تم کیا کہہ رہے ہو!" میں نے بظاہر انجان بنتے ہوئے کہا۔

"تو پھر واپس کیوں آیا ہے؟ مجھے آزما رہا ہے؟" اس نے اپنی پیلی پیلی آنکھوں سے مجھے گھورا۔

"نہیں! میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے ابھی جو کچھ کہا اس کا مطلب کیا ہے۔" میں نے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

"تیری زندگی سے مصیبتیں چمٹی ہوئی ہیں۔ تو ان مشکلوں کو اپنی زندگی سے الگ نہیں کر پا رہا اس لئے زندگی کو ہی ختم کرنے جا رہا تھا۔ لیکن تو نہیں جانتا کہ تیرا نصیب بدل سکتا ہے۔ بلکہ وہ وقت آ بھی چکا۔ پر نتو نصیب بدلنے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ اب یہ تیری مرضی ہے کہ تو کیا چاہتا ہے۔" اس نے اپنی گردن کھجاتے ہوئے کہا۔

"بابا! کیوں گھما پھرا کر پہیلیوں میں بات کر رہے ہو؟ میں پریشان آدمی ہوں۔ مجھے سیدھی طرح بتاؤ کہ میری قسمت کیسے بدلے گی۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"ہاں..... مورکھ!" اس نے نعرہ مار کر کہا۔ "دنیا تیرے پیروں میں جھکے گی۔ جو چاہے گا پائے گا۔ پاتال سے نکل کر آسمان پر پہنچ جائے گا۔ ان سب کے بدلے میں کیا دے گا؟" اس نے میری طرف جھک کر کہا۔ گو اس کے اس طرح قریب آنے سے مجھے اس کے جسم سے اٹھنے والی بدبو اور بھی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی لیکن کراہیت کے باوجود میرا دماغ اس کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔

"بدلے میں کیا دوں؟ میرے پاس کیا دینے کے لئے ہے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"جان تو دے سکتا ہے ناں۔ ویسے بھی تو مرنے ہی جا رہا تھا تو۔ مجھ سے زندگی کا سودا کر لے اور بدلے میں دنیا جہان کے عیش لے جا۔" اس نے اپنی پیلی اور غلیظ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے زندگی دے دوں؟ تمہارے سامنے مر جاؤں؟ پھر میری قسمت کیسے بدلے گی؟" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تو تو واقعی بڑا مورکھ ہے۔" اسنے پھر قہقہہ لگایا۔ "جو تو چاہے گا تجھے ملے گا۔ بدلے میں تجھے وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔" اس کی بات سن کر میں چونک پڑا۔

"ناں بابا ناں۔ کل کو تم کہو گے کہ ڈاکہ ڈالو قتل کرو، کہیں بم لگاؤ، یہ سب کرنے کی نہ مجھ میں طاقت ہے اور نہ ہمت۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"تو تو بڑا بدھو ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم خود وقت کے فیصلے بدلنے پر قادر ہیں۔ تجھے صرف وہی کرنا ہوگا جو تیرے بس میں ہے اور اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو جا دفع ہو جا۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"معاف کرنا بابا میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ تم خود تو سڑک پر بیٹھے ہو۔ اگر تمہارے پاس کوئی ایسی طاقت ہوتی تو پہلے اپنے لئے کچھ کرتے۔" میں نے گڑبڑا کر جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ لیکن میری بات کا اس پر الٹا اثر ہوا۔ اپنا غصہ بھول کر اس نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

ہنستے ہنستے وہ زمین پر گر گیا اور فٹ پاتھ پر مکے مارنے لگا۔ میں ہونقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد جب اس کی ہنسی تھمی تو وہ دوبارہ سیدھا ہو کر بیٹھا اور بولا۔

"تجھے لگتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں؟ ارے اندھے! دنیا ہمارے قدموں میں پڑی ہے۔ ہم خود کو دنیا کو لات مار کر گھوم رہے ہیں۔ یہ دیکھ۔" اتنا کہہ کر اس نے فٹ پاتھ سے کچھ کنکر چن کر اٹھائے اور اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ہاتھ

www.pdfbooksfree.pk

میرے سامنے کردیا۔

"تو جانتا ہے ان کی کیا قیمت ہے؟" اس نے جنونیوں کی طرح پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بے کار پتھر ہیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"یہ پتھر تیرے لئے ہیں۔ ہمارے لئے کوئی قید نہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے مٹھی بند کی اور ایک ایک کر کے پتھروں کو مٹھی سے گرانا شروع کردیا۔ لیکن یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹتی چلی گئیں کہ اس کی مٹھی سے گرنے والے پتھر نہیں بلکہ چمکتی دمکتی سونے کی ڈلیاں تھیں۔ البتہ تعداد اور شکل ویسی ہی تھی جیسی ان پتھروں کی۔ مٹھی خالی ہونے کے بعد اسنے ہاتھ جھاڑے اور تمسخرانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"آ گیا یقین تجھے ہماری طاقت کا۔ یا اور کچھ دیکھے گا؟" اس نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"نہیں بابا۔ مجھے معاف کردو۔ میں بڑا مایوس اور ناکام انسان ہوں۔ میری قسمت ہی خراب ہے۔ اس لئے ایسی الٹی بات کر بیٹھا۔" میں بے اختیار اس کے قدموں میں جھک گیا۔

"اچھا اچھا چل..... زیادہ باتیں نہ کر۔" اس نے اپنے ہاتھوں سے مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"میرے لئے کیا حکم ہے بابا؟" میں نے عقیدت سے کہا۔

"اپنا نصیب بدلنا چاہتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بابا۔" میں نے جواب دیا۔

"بدلے میں زندگی کا سودا کرنے کو تیار ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"تو پھر آج سے تین روز بعد آدھی رات کو یہیں اسی جگہ آجانا۔ اور خبردار! اگر کسی سے اس کا ذکر کیا تو سب کچھ کیا کرایا ختم ہو جائے گا۔" اس نے میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا بابا۔ جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔" میں نے نیازمندی سے کہا۔

"چل اب دفع ہو جا۔" اس نے حقارت سے کہا۔

میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اور ہاں۔ یہ بھی لیتا جا۔ میرے لئے یہ کسی کام کے نہیں۔" اس نے سونے کی ڈلیوں کی طرف اشارہ کیا۔

خوشی اور حیرت سے میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگیں۔

"کیا..... واقعی یہ..... یہ میں لے جاؤں!" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے بے زاری سے ہاتھ ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ جو کرنا ہے کر۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سونے کی ڈلیاں اٹھائیں اور انہیں جیب میں ڈال کر واپس مڑ گیا۔ اس وقت میری حالت عجیب تھی۔ میرے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے اور دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فقیر اب وہاں نہیں تھا۔ مجھے کچھ تعجب ہوا لیکن ان سونے کی ڈلیوں کی خوشی پھر غالب آ گئی۔ میں بار بار اپنی جیب کو تھپکتا اور ان ڈلیوں کی موجودگی کا یقین کرتا۔ میں اس قدر خوش تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کب پیدل چلتا ہوا گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ گھر کا دروازہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ یہ تقریباً 20 کلومیٹر کا فاصلہ تھا جو میں نے پیدل طے کیا تھا۔ اور مجھے تھکن کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ میں نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور اسماء کی شکل نظر آئی۔ مجھے سلام کر کے وہ جلدی سے ایک طرف ہو گئی۔ میں قدم بڑھا کر گھر میں داخل ہو گیا۔

"خیریت تو ہے؟ آج آپ اتنی جلدی گھر آ گئے۔ آفس میں کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟" اس نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ باس کا موڈ آج اچھا تھا۔ میری طبیعت کا سن کر اس نے میرا حال پوچھا اور آج مجھے جلدی گھر آنے کی اجازت بھی دے دی۔" میں نے فوراً ہی بہانہ گھڑتے ہوئے کہا۔

"تبھی آج خوشی سے آپ کا چہرہ کھلا ہوا ہے۔

ورنہ گھر سے جاتے وقت تو آپ بہت پریشان تھے۔"

اسماء نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ اسماء نے میرے مزاج کی تبدیلی کو فوراً محسوس کر لیا تھا۔ آخر وہ میری بیوی تھی اور زندگی کے ہر پل کی ساتھی تھی لیکن اب میرے لئے یہ بہتر نہیں تھا کیونکہ مجھے اس راز کو پوشیدہ رکھنا تھا۔ میں نے جیسے تیسے خود پر قابو پایا اور کہا۔

"بس کبھی کبھار تو ایسا اچھا موقع ملتا ہے اس لئے خوش ہوں۔ اب کھانا لگا دو۔" میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"جی اچھا۔ آپ نہالیں۔ میں کھانا لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ کھانے کے بعد میں اطمینان سے بستر پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔

سب سے پہلے تو مجھے ان سونے کی ڈلیوں کو بیچ کر نقد رقم حاصل کرنا تھی۔ پھر اگر تین روز بعد اس فقیر کی کرامت سے کچھ مل جاتا تو میں شاید ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔ ایک ہی لمحے میں مجھے وہ سب کچھ آ گیا جو ہمیشہ میری سوچ کی دسترس سے باہر تھا۔ عالیشان گھر، چمکتی دمکتی گاڑی، باوردی ڈرائیور، اونچا رتبہ جھک کر سلام کرتے لوگ اور روپے پیسے کی ریل پیل۔

میں کافی دیر لیٹا یونہی ہواؤں میں اڑتا رہا۔ شام کی چائے پینے کے بعد میں سونے کی ڈلیاں بیچنے نکل پڑا۔

میں نے احتیاطاً صرف ایک سونے کی ڈلی جیب میں رکھی تھی اور باقی کپڑوں کی پیٹی میں چھپا دی تھیں ایک گھنٹے بعد جب میں گھر لوٹا تو میری دونوں جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میرا دل خوشی سے ناچنے کو چاہ رہا تھا لیکن میری مجبوری تھی کہ میں کسی کو نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ رقم کہاں سے میرے پاس آئی۔ میں نے اس رقم میں سے کچھ نوٹ جیب میں رکھے اور بقیہ رقم وہیں کپڑوں کی پیٹی میں چھپا دی۔ کچھ دیر بعد میں گھر سے باہر تھا۔ اس بار میں نے سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی روکی اور بڑی شان سے اس میں بیٹھ کر ڈرائیور کو طارق روڈ چلنے کے لئے کہا۔ ٹیکسی تیزی سے سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ میں دلچسپی سے کھڑکی سے باہر گزرتی گاڑیوں اور عمارتوں کو دیکھنے لگا۔ نہ جانے کتنے عرصے بعد میں ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔ طارق روڈ پر آ کر میں نے بے پرواہی سے ایک نوٹ ٹیکسی ڈرائیور کی گود میں پھینکا اور آگے بڑھ گیا۔ طارق روڈ پر کئی شاپنگ سینٹر تھے جو دیدہ زیب ملبوسات کے لئے مشہور تھے۔ میں دکانوں کو تاکتا جھانکتا آگے بڑھتا رہا۔ تقریباً آدھ گھنٹے میں میں نے اندازاً دس ہزار روپے کے ملبوسات خریدے ان میں میرے اسماء کے بچوں کے اور ابا میاں بھی کے لئے کچھ نہ کچھ تھا۔ واپسی پر میں نے ٹیکسی محمد علی سوسائٹی کے ایک معروف ریستوران کے سامنے رکوائی اور گھر کے لئے کھانا پیک کروایا۔ جب میں گھر کے دروازے پر اترا تو میرے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپنگ بیگ تھے۔ اسماء نے جب مجھے اس طرح لدے پھدے آتے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ اتنا سب کچھ..... آپ..... کہاں سے لے آئے.....؟" حیرت کی شدت سے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"اب ہماری مفلسی کے دن ہوا ہو گئے۔ آج اسی خوشی میں ہم کھائیں گے پئیں گے اور عیش کریں گے۔" میں نے سارے شاپنگ بیگ بستر پر ڈھیر کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کوئی لاٹری وغیرہ کھل گئی ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"بیٹھو بتاتا ہوں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بستر پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔

"میں نے ایک جاننے والے کو نوکری کا کہہ رکھا تھا۔ آج دفتر سے واپسی پر اس نے میری ملاقات ایک سیٹھ سے کرائی جو دبئی سے آیا ہے اور یہاں ایک بہت بڑی فیکٹری کھول رہا ہے۔ میرے تجربے اور لگن سے متاثر ہو کر اس نے مجھے اپنے پاس منیجر رکھ لیا ہے اور بڑی شاندار تنخواہ کی پیشکش کی ہے۔ معاہدہ کیا پکا کرنے پر اس نے آدھی تنخواہ ایڈوانس دی اور ساتھ ہی کیا ہے کہ اگر میں نے اچھا کام کیا

www.pdfbooksfree.pk

تو کچھ مہینوں میں گھر اور گاڑی بھی ملے گی۔" میں نے بڑی عمدگی سے ایک بہانہ تراشتے ہوئے کہا۔

اسماء تعجب اور بے یقینی سے میری بات سنتی رہی، پھر اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

"خدایا تیرا شکر ہے۔ تو سب کی سنتا ہے۔ آج تو نے ہمیں ہمارے صبر کا پھل دے دیا۔" وہ میرا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر رونے لگی۔ میں دل ہی دل میں خجالت محسوس کر رہا تھا لیکن فی الحال اسماء کو سچ بتانا مناسب نہیں تھا۔

"آپ یہیں بیٹھیں۔ میں دو شکرانے کے نفل ادا کر کے آتی ہوں۔" وہ اچانک اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سارے شاپنگ بیگ بستر سے اٹھا کر میز پر رکھے اور خود بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ اسماء سے جھوٹ بول کر کچھ اچھا تو نہیں لگ رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور موجودہ صورت حال کا سوچ کر دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔ ڈھیر سارے روپے، سونا اور کچھ دن بعد ملنے والی قسمت، سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس رات کھانے پر بھی بہت خوش تھے۔ پیزا اور چائنیز تو شاید ہم پہلی مرتبہ ہی کھا رہے تھے۔ پھر سب نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لباس نیا اور اچھا ہو تو پہننے والا خود کو تر و تازہ، اور شگفتہ محسوس کرتا ہے۔ کم از کم ہمارے جذبات تو اس وقت یہی تھے۔

اگلے روز میں نے اپنے اور اسماء کے لئے نیا موبائل فون خریدا اور بامیاں کے کمرے کے لئے ایک ٹیلی ویژن سیٹ۔ قصہ مختصر تین روز بعد میں حسب وعدہ آدھی رات کو اسی جگہ پہنچ گیا جہاں وہ فقیر پہلے ملا تھا۔ ابھی میں وہاں پہنچ کر ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو وہی فقیر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"مزے لگ گئے ناں تجھے زندگی کے؟ چل میرے پیچھے آ جا۔" وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیا۔ فقیر تیز تیز قدم بڑھاتے چلا جا رہا تھا۔ میرے لئے اس کی رفتار کا ساتھ دینا مشکل ہوگیا۔ ایک تو اندھیرا بہت تھا، پھر مجھے اس پر نظریں جمائے رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی رفتار بھی بڑھانی تھی۔ کافی دیر تک یونہی چلتے رہنے کے بعد کباڑی کا علاقہ شروع ہو گیا۔ فقیر مختلف سڑکوں اور گلیوں سے گھومتا گھماتا ایک ایسے علاقے میں جا پہنچا جہاں ہر طرف کباڑ اور ٹوٹی ہوئی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ فقیر کباڑ اور کوڑے کرکٹ سے ہوتا ہوا ایک احاطے کے سامنے جا پہنچا جس کے درمیان بانس کی لکڑی سے بنا ایک سال خوردہ دروازہ موجود تھا۔ فقیر نے دروازے کو دھکیلا اور اندر بڑھتا چلا گیا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے اندر جانے سے ہچکچاہٹ سی محسوس ہوئی لیکن پھر میں بھی ہمت کر کے اس کے پیچھے اندر گھس گیا۔

اگر عام حالت ہوتے تو میں کبھی بھی آدھی رات کو ایک انجان آدمی کے ساتھ ایسے ویران اور پراسرار علاقے کا رخ نہ کرتا جہاں کسی کو جان سے بھی مار دیا جائے تو پتہ نہ چلے۔ لیکن میں تو پہلے ہی اپنی ناکام زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ اور اب مجھے اس فقیر کی بدولت نہ جانے کیا کچھ ملنے والا تھا۔ اسی آسرے پر میں تمام احتیاطی تدابیر اور خطرات کو بالائے طاق رکھ کر یہاں آ پہنچا تھا۔ اس احاطے میں ہر طرف خودرو گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف پرانا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جو لگ بھگ سات فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا ہوگا۔ دور ایک طرف جھونپڑی نما چھپر بھی نظر آ رہا تھا۔ فقیر چبوترے کے قریب زمین پر اطمینان سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اشارے سے مجھے بھی بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ پورے ماحول میں ایک عجیب ناگوار سی بو رچی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آس پاس کوئی چوہا وغیرہ مرا ہوا ہو یا گلی سڑی سبزی اور پھلوں کا ڈھیر ہو۔ اس رات آسمان تاریک تھا اور بجلی کے محکمے کی شاندار کارکردگی کے باعث کہیں کوئی اسٹریٹ لیمپ یا کسی گھر میں کوئی لائٹ جلتی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کیا تجھے ڈر لگ رہا ہے؟" فقیر نے مجھ پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ نہیں تو۔ میں ڈر تو نہیں رہا۔" میں نے

بظاہر ہمت سے جواب دیا۔

"کیا تجھے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سب معلوم ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے۔ میری زندگی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں سب معلوم ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تجھے معلوم ہے تیری پیدائش کیسے ہوئی تھی؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

؟؟ کیا مطلب؟ جیسے سب کی ہوتی ہے ویسے ہی ہوئی تھی۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔ اندھیرے میں فقیر کے زرد دانتوں کی جھلک دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

"تو چاند گرہن کی رات پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب چاند پورا گرہن تھا۔ تیری ماں تجھے جنم دینے سے پہلے مر چکی تھی۔ بہت دیر تک اپنی مردہ ماں کے پیٹ میں رہنے کے بعد ڈاکٹروں نے پیٹ کا آپریشن کر کے تجھے نکالا۔ اسی وقت ایک جھٹکے سے تیری ماں کی رکی سانس پھر چل پڑی۔ ڈاکٹروں نے کہا ہزاروں میں سے ایک کیس میں ایسا ہو جاتا ہے کہ مریض کی سانس اور دل کی دھڑکن اس قدر مدھم ہو جاتی ہے کہ اسے مردہ سمجھ لیا جاتا ہے مگر بعد میں الیکٹرک شاک کی مدد سے یا اتفاقیہ جھٹکے سے نبض دوبارہ چل پڑتی ہے۔ اس کیس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ لیکن اس طرح کافی دیر مردہ پیٹ میں رہنے سے تیری بھی جسمانی اور ذہنی اعضاء بہت سست اور کمزور پیدا ہوئے۔ پھر چاند گرہن کی نحوست تجھ پر طاری تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک تو ہر طرح سے ناکام اور منحوس قدم چلا آ رہا ہے اور اس نحوست کو تجھ سے دور کنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔" فقیر بولتا جا رہا تھا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔

"یہ..... یہ سب کچھ تو میں نہیں جانتا۔ ہاں اتنا پتہ ہے کہ میری پیدائش آپریشن سے ہوئی تھی۔" میں نے حیرت سے اٹکتے ہوئے کہا۔

"تجھے ابھی بہت کچھ نہیں معلوم۔ جانے دے ان باتوں کو۔ اب بتا اپنے برے نصیب سے چھٹکارا چاہتا ہے یا نہیں؟" فقیر نے بے نیازی سے پوچھا۔

"ہاں بابا۔ بالکل چاہتا ہوں۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"جو آپ کہیں گے میں کرنے کے لئے تیار ہوں۔" میں نے نیاز مندی سے کہا۔

"تکلیف اٹھانی پڑے گی۔" اس نے گویا تنبیہ کی۔

"میں اٹھا لوں گا۔" میں نے پھر کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں ایک منتر پڑھتا ہوں۔ تجھے میرے ساتھ دہرانا ہوگا۔" اس نے مجھے ہدایت کی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فقیر نے کسی نامانوس زبان میں منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی اس کی دیکھا دیکھی اٹک اٹک کر وہی منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ پہلے تو کافی مشکل ہوئی لیکن پھر وہ منتر میری زبان پر رواں ہو گیا۔ فقیر نے میری منتر کی ادائیگی سے مطمئن ہونے کے بعد کہا۔

"اب اٹھ اور اس چبوترے پر بیٹھ جا۔" میں خاموشی سے اٹھ کر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ فقیر نے کسی عجیب سے سفوف سے میرے گرد دائرہ سا بنایا اور میرے سامنے ایک پرانا سا کانسی کا پیالہ رکھ دیا۔

"اپنا ہاتھ اس پیالے کے اوپر لا۔" اس نے حکم دیا۔ میں نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے اپنے لبادے سے ایک خنجر نکالا اور میرے انگوٹھے پر کٹ لگا دیا۔ تکلیف کی شدت سے میرے منہ سے سسکی نکل گئی۔ زخم سے قطرہ قطرہ خون پیالے میں ٹپکنے لگا۔

"اب تجھے مسلسل یہ منتر پڑھنا ہے اور اس وقت تک اس کا ورد بند نہ کرنا جب تک یہ پیالہ بھر نہ جائے۔" یہ کہہ کر وہ چبوترے سے اترا اور کچھ دور جا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح درد کی شدت کو ضبط کرتے ہوئے منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ خون قطرہ قطرہ پیالے میں گرتا رہا۔ کچھ دیر بعد میرے اعصاب شل ہونے شروع

www.pdfbooksfree.pk

ہوگئے۔ آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ لیکن میں جھومتا جھامتا منتر پڑھنے میں مشغول رہا۔ نہ مجھے منتر کی گنتی یاد تھی نہ یہ نظر آرہا تھا کہ پیالے میں کتنا خون بھرا۔ فقیر نے نہ جانے کس طرح کٹ لگایا تھا کہ خون رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں منتر پڑھتا رہا۔ اچانک مجھے اپنے ہاتھ پر کسی کا لمس محسوس ہوا۔

"بس کر۔ کام ہوگیا۔" فقیر کی آواز مجھے کسی کنوئیں کی تہہ سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں کچھ کہے بغیر وہیں ایک طرف لڑھک گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو زمین پر لیٹا ہوا پایا۔

"اٹھ کر بیٹھ جا۔ قسمت کی دیوی تجھ پر مہربان ہوگئی ہے۔" فقیر کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں کراہتا ہوا کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں اسی چبوترے پر لیٹا ہوا تھا جہاں کچھ دیر پہلے میں بیٹھا منتر پڑھ رہا تھا۔ وہ پیالہ جس میں میرا خون موجود تھا اب فقیر کے سامنے رکھا تھا۔ فقیر نے اپنی جھولی میں سے کوئی پتھر نکالا اور اسے خون سے بھرے پیالے میں ڈبو دیا۔ اس کے بعد فقیر نے کھڑے ہوکر اپنی ایک ٹانگ اٹھالی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سر سے بلند کرلئے۔ ساتھ ہی اس نے زور زور سے کسی اجنبی زبان میں کوئی منتر پڑھنا شروع کردیا۔ اس کی آواز سے میرا دل ہولنے لگا۔ وہ کسی جنونی شخص کی طرح زور زور سے چلا کر منتر پڑھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر پیالے پر پڑی جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پیالے سے باقاعدہ شوں شوں کی آوازیں نکلنے لگیں جیسے گرم لوہے پر کوئی پانی ڈال دے۔ میں خوفزدہ نظروں سے پیالے کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک ایک تڑاخا ہوا اور پیالہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ساتھ ہی فقیر نے منتر پڑھنا بند کردیا۔ میں حیرت زدہ نظروں سے پیالے کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ اب پیالے میں خون کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس کے جتنے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے سب خشک تھے۔ البتہ وہ پتھر اسی طرح پیالے کے ٹکڑوں کے درمیان موجود تھا۔

"اسے اٹھالے۔ یہی تیری قسمت کی چابی ہے۔" فقیر نے بلند آواز میں کہا۔ میں نے الجھن کے عالم میں وہ پتھر اٹھالیا۔ اس پتھر کو ہاتھ میں لیتے ہی مجھے احساس ہوا کہ جسے میں اب تک پتھر سمجھ رہا تھا وہ دراصل ایک چھوٹی سی مورتی ہے، میں اس کے ابھرے ہوئے خدوخال کو محسوس کرسکتا تھا البتہ اندھیرے کی وجہ سے اسے واضح طور پر دیکھنے سے قاصر تھا۔

"یہ اماوس کی ملکہ جوزو ہے۔ صدیوں میں کسی ایک پر مہربانی ہوتی ہے۔ لوگوں کی زندگی میں اماوس بدبختی پریشانی اور تکلیف لاتی ہے مگر تیرے لئے یہی اماوس سکون، دولت اور قسمت کے دروازے کھولے گی۔ جب تک یہ مورتی تیرے پاس رہے گی تجھے کامیابی ملے گی۔ اب اٹھ اور واپس جاکر اپنی نئی زندگی کی شروعات کر۔" فقیر کی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی اور میں سحر زدہ انداز میں اس مورتی کو دیکھ رہا تھا۔ فقیر کے خاموش ہونے کے بعد میں نے مورتی سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف شکرمندانہ انداز میں دیکھا لیکن میں یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ فقیر اپنی جگہ سے غائب تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن آس پاس بنجر زمین اور خودرو گھاس پھوس کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اٹھا اور اس احاطے سے باہر نکلنے والے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ جب میں واپس سڑک پر پہنچا تو رات کی سیاہی ماند پڑ رہی تھی اور اجالے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ جسم سے خون نکل جانے کی وجہ سے مجھے نقاہت محسوس ہو رہی تھی اور قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اگر میرے پاس کوئی سواری ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے قریب سے کار کی تیز بریکوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ ایک سرخ رنگ کی بے حد خوبصورت اور قیمتی کار تھی جس میں گاڑی ہی کی طرح ایک خوبصورت اور دلکش عورت موجود تھی۔

"معاف کیجئے۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ حمید کالونی کو کون سا راستہ جاتا ہے؟" اس نے مترنم لہجے میں پوچھا۔

"وہ...... وہ تو میرے گھر کے قریب ہی ہے۔ میں بھی وہیں جا رہا تھا۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"ویری گڈ۔ تو کیا آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں جھٹ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی کیا تھی کوئی جادوئی قالین تھا۔ میں سیٹ کی گدی میں تقریباً دھنس گیا۔ گاڑی میں کسی بہت دلفریب پرفیوم کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اب نہ جانے یہ گاڑی میں رکھے ائیر فریشنر کی مہک تھی یا اس عورت کے وجود سے اٹھتی کلون کی۔

"آپ کو حمید کالونی میں کہاں جانا ہے؟" میں نے عورت سے سوال کیا۔

"وہاں قریب ایک ہیلتھ ہاسپٹل ہے۔ وہاں جانا ہے۔" عورت نے اسی طرح مترنم لہجے میں کہا۔

"ارے ہاں۔ وہ تو میرا دیکھا ہوا ہے۔ اسی ہسپتال کی پچھلی سڑک میرے گھر کو جاتی ہے۔" میں نے خوش ہوکر کہا۔

"آپ نے تو میری مشکل ہی آسان کردی۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔" اس نے میری طرف ممنونانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ بات سن کر میں تو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا۔ ایسا حسین اتفاق پہلے کبھی میرے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ کہاں میں پیدل چلتا ہوا کسی سواری کی خواہش کر رہا تھا اور کہاں یہ پری زاد مجھے اتنی شاندار گاڑی میں لئے میرے ہی گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں یہ اتفاق اس مورتی کی بدولت تو نہیں؟ میں جیب میں ہاتھ ڈال کر مورتی کو ٹٹولا۔ بلاشبہ وہ اس مورتی کا کمال تھا صرف میری شکل اور حلیہ دیکھ کر تو رکشہ ٹیکسی والے بھی رکے بغیر گزر جاتے تھے۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کیا واقعی میری قسمت پلٹ چکی تھی؟ میری ہر خواہش کی تکمیل اسی طرح کے اتفاقات سے ہونے والی تھی؟ میں سوچتا رہا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔ وہ عورت گاہے بہ گاہے مجھ سے راستہ پوچھتی رہی اور ساتھ ساتھ مجھ سے چھوٹی موٹی باتیں بھی کرتی رہی۔ میرے لئے اتنی خوبصورت عورت کی قربت ایک حسین خواب جیسا تھا۔

"بس وہ رہا سامنے ہیلتھ ہاسپٹل۔" میں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس نے گاڑی روکے بغیر آگے بڑھادی۔

"آپ کا ہسپتال تو پیچھے رہ گیا۔ میں نے حیرت سے کہا۔

"میں اتنی بداخلاق نہیں ہوں کہ اپنی منزل پر پہنچ کر آپ کو راستے میں سڑک پر چھوڑ دوں گی۔ جگہ میں نے دیکھ لی ہے۔ آپ کو گھر ڈراپ کرکے میں واپس آجاؤں گی۔" اس نے مسکرا کر کہا تو میں خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر میں گاڑی گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

"لیجئے جناب۔ آپ کا گھر آگیا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"شکریہ ادا کرنے کا فرض تو میرا بنتا ہے۔ ویسے کیا میں اپنے محسن کا نام جان سکتی ہوں؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام محسن ہے۔" میں نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

"یہ بھی خوب رہی۔ آپ میرے محسن بھی ہیں اور نام بھی محسن ہے۔ میرا نام رخشی ہے پچھلے ماہ کینیڈا سے آئی ہوں۔ ہیلتھ ہاسپٹل میں میرے انکل ہڈیوں کے ڈاکٹر ہیں۔ کبھی مجھ سے ملنے کا دل کرے تو آپ ان کی معرفت رابطہ کرسکتے ہیں۔ آپ کا گھر تو میں نے دیکھ ہی لیا ہے۔" اس نے الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا اور گاڑی بڑھا کر روانہ ہوگئی۔ میں اس کی باتوں کے خمار میں کھویا کھویا گھر کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی مجھے اپنی قسمت سے کافی حساب کتاب وصول کرنا باقی تھا۔

☆......☆......☆

تین ماہ میں بہت کچھ بدل گیا۔ میں اپنے چھوٹے سے مکان سے نکل کر ایک چار سو گز کے خوبصورت بنگلے میں منتقل ہوگیا۔ اب میرے پاس تین گاڑیاں بمعہ ڈرائیور

www.pdfbooksfree.pk

کے موجود تھیں۔ دکھاوے کو میں نے ایک چھوٹی سی فیکٹری ڈال لی تھی جہاں گارمنٹس تیار ہوتے تھے۔ میرے بچے بھی اب ایک بڑے اور مہنگے پرائیوٹ اسکول میں پڑھنے جا رہے تھے۔ سماجی حلقوں میں میری مقبولیت تیزی سے بڑھی تھی اور آئے دن مجھے پارٹیوں اور فنکشنز کے دعوت نامے موصول ہوتے رہتے تھے۔ میں جہاں جاتا دل کھول کے پیسہ خرچ کرتا۔ مہنگے ملبوسات خریدنا اور اونچے ہوٹلوں میں کھانا میرا روز کا معمول تھا۔ پیسہ اور طاقت آئی تو ساتھ کچھ خرابیاں بھی لائی۔ میرے نئے دوست یار شاہ خرچ اور عیاش تھے۔ ان کی صحبت میں مجھے پینے پلانے اور ہلڑ بازی کی لت بھی پڑ گئی۔ ہفتے کی رات کہیں نہ کہیں شراب اور شباب کی محفل جمتی اور میں اس میں لازمی موجود ہوتا۔ یہ سب بے شک غلط تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اتنا عرصہ محرومی کی زندگی گزارنے کے بعد اتنا تو میرا حق بنتا تھا۔ اب دنیا میری مٹھی میں تھی اور یہ سب کچھ اس اماوس کی مورتی کی بدولت تھا جو مجھے اس نامعلوم فقیر نے دی تھی۔ جب وہ مورتی میرے پاس ہوتی تو میرے منہ سے نکلا ہر لفظ اور میرے دل میں موجود ہر خواہش کسی نہ کسی ذریعے سے پوری ہو جاتی۔ آج میرے پاس جو کچھ بھی تھا، اس مورتی کی بدولت تھا۔ میں اس مورتی کو ہر وقت اپنے پاس چھپا کر رکھتا تھا اور اپنی جان سے زیادہ اس کی حفاظت کرتا تھا گھر سے نکلتے وقت میں لازمی طور پر مورتی کو اپنی اندرونی جیب میں ڈال لیتا اور گھر واپس آ کر اسے حفاظت سے تجوری میں رکھ دیتا۔ شب و روز بڑے عیش اور سکون میں گزر رہے تھے لیکن اچانک ایک دن ایسا واقعہ ہوا کہ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس روز میں اپنی گاڑی میں شاہراہ فیصل سے گزر رہا تھا۔ سگنل کی بتی سرخ ہوئی تو ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ اچانک میری نظر سڑک کی دوسری جانب موجود ایک بلند و بالا عمارت کے گیٹ پر پڑی۔ اس وقت گیٹ سے جو آدمی باہر نکل رہا تھا اسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ میرا وہی باس تھا جس کی کمپنی میں کبھی میں ملازم تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو صبح و شام مجھے بلا بلا کر ذلیل کرتا تھا اور مجھ سے یوں برتاؤ کرتا تھا جیسے میں کوئی اچھوت ذات کا ہوں۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر وہی رعونت موجود تھی اور گردن اکڑی ہوئی تھی۔ اس وقت اس پر ایک نظر پڑتے ہی پچھلے تمام سالوں کا منظر میری آنکھوں کے گرد گھومنے لگا۔ میرا چہرہ غصے کی حدت سے تپنے لگا اور کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ اتنی دیر میں سگنل کی بتی سبز ہو گئی اور گاڑی آگے بڑھ گئی لیکن میرا دماغ اب بھی وہیں اٹکا ہوا تھا۔ بے شک آج میرے پاس سب کچھ تھا لیکن میرے باس نے جو زیادتیاں میرے ساتھ کی تھیں انہیں بھلانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اپنے آفس پہنچ کر بھی میں کرسی پر بیٹھا اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کتنا مزہ آئے اگر میرا باس بھی انہی حالات کا شکار ہو جائے جو کچھ عرصہ پہلے تک میں جھیلتا آیا تھا۔ یہ بھی پائی پائی کو محتاج ہو جائے اور پھر میرے ہی پاس نوکری کرے۔ پھر میں اسے بتاؤں گا کہ ذلت کسے کہتے ہیں۔ میں نے جیب سے اماوس کی مورتی نکال کر سامنے میز پر رکھی اور عقیدت سے اس کے آگے سر جھکا کر کہا۔

"تجھے معلوم ہے میرے دل میں کیا ہے۔ میں اپنے باس کی تباہی چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ میرا ملازم ہو اور میں اس سے اپنا انتقام لوں۔ اور میں....." ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروزے پر دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر میز سے مورتی اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔

"یس کم آن....." میں نے اونچی آواز میں کہا۔

دوسرے لمحے دروازہ کھلا اور میری اسسٹنٹ کچھ فائلیں اٹھائے اندر آ گئی۔ میں فائلیں دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ دو تین روز بعد میرے منیجر نے مجھے اطلاع دی کہ ریکارڈ کیپر کی خالی آسامی کے لئے اشتہار دے دیا گیا ہے اور اگلے ہفتے سے درخواستیں موصول ہونا شروع ہو جائیں گی۔ مجھے اگلے ہفتے ان میں سے چنے گئے موزوں امیدواروں کا انٹرویو کرنا تھا۔ عموماً میرا منیجر پہلے انٹرویو کر کے قابل امیدوار چھانٹ لیتا تھا اور مجھ تک صرف چیدہ چیدہ لوگ ہی پہنچ پاتے تھے۔

بہر حال اگلے ہفتے سے انٹرویو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میری میز پر پہنچنے والا پہلا نام نذیر احمد کا تھا۔ جب

اندر داخل ہوا تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ نذیر احمد میرا وہی سابقہ باس تھا جسے کچھ روز پہلے میں نے دیکھا تھا۔ لیکن اس نذیر احمد اور آج کے نذیر احمد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس نے سستی سی قیمتی پتلون پہن رکھی تھی۔ گردن جھکی ہوئی تھی اور چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر میز کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میرا دل چاہا کہ میں ابھی فوراً جیب سے اماوس کی مورتی کو نکال کر چوم لوں لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے جذبات پر قابو رکھا۔

"بیٹھ جاؤ" میں نے حاکمانہ انداز میں کہا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اس سے پہلے کسی اچھی جگہ ملازمت کی ہے؟" میں نے اسی طرح حاکمانہ انداز میں پوچھا۔ اس نے جواب دینے کے لئے میری طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر حیرت اور الجھن کے تاثرات نمودار ہو گئے۔ جسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں بھی یہاں موجود ہو سکتا ہوں۔ کچھ دیر کی کشمکش کے بعد اس نے یوں سر جھٹکا جیسے خود اپنے خیال کی نفی کر رہا ہو۔ بھلا مجھ جیسا ناکارہ اور کمتر آدمی اتنی بڑی جگہ پر کیسے موجود ہو سکتا تھا۔

"جناب! آپ کے پاس میرے سارے کاغذات موجود ہیں۔ اس سے پہلے میں ایک معروف ادارے کا منیجر تھا اور میں نے گزشتہ پندرہ سالوں میں مختلف نامور اداروں میں سروس کی ہے اور ہر جگہ اپنے مالکان کے معیار پر پورا اترا ہوں۔" نذیر نے اس بار اعتماد سے بات کرتے ہوئے کہا۔

"اگر اتنا تجربہ اور قابلیت ہے تو پھر ریکارڈ کیپر کی ملازمت کے لئے کیوں آئے ہو؟" میں نے طنز آمیز لہجے میں کہا تو اس کے چہرے پر پھر پریشانی اور مایوسی کے تاثرات پیدا ہو گئے۔

"سب قسمت کا کھیل ہے سر۔ کچھ روز پہلے کمپنی نے مجھے غبن کے جھوٹے الزام میں پھنسا کر تمام اثاثے ضبط کر لئے اور ساتھ ہی میرے سماجی حلقے میں اس جھوٹے

گھر بیٹھے! بغیر بیوٹیشن کے میک اپ کرنا سیکھیے
Beauty
شمع بیوٹی پارلر
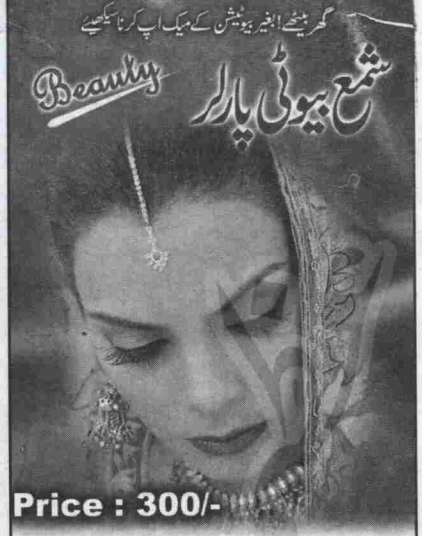
Price : 300/-
میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟۔
جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔
پیاری بہنیں! ایک بیوٹیشن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پریکٹس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تگ و دو اور محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت ہاتھ پیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ صحت مند رہنے کے راز بھی اس کتاب میں درج ہیں۔
صابری دار لکتب
قذافی مارکیٹ اردو بازار لاہور

www.pdfbooksfree.pk

الزام کی اتنی تشہیر کر دی کہ میرے دوست احباب اور کاروباری جاننے والے مجھ سے کترانے لگے۔ لیکن میں پھر بھی پرامید تھا کہ میں اپنی قابلیت کے بل بوتے پر جلد یا بدیر کچھ نہ کچھ کرلوں گا لیکن شومئی قسمت کہ میری بیوی سر میں شدید تکلیف کے باعث ہسپتال میں داخل ہوگئی جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ برین ٹیومر کے عارضے میں مبتلا ہے اور فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنی بچی کھچی جمع پونجی اس کے آپریشن اور علاج معالجے پر خرچ کردی۔ اب میں بالکل قلاش ہوں۔ ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہ رہا ہوں۔ بیوی بچوں کے لئے روز کا خرچہ مشکل ہو رہا ہے۔ اس لئے میں فوری طور پر کوئی بھی کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔" اس نے بجھے بجھے لہجے میں بتایا تو میرے دل میں خوشی سے لڈو پھوٹنے لگے۔ کام میری توقع سے کہیں زیادہ جلدی ہوا تھا اور آج میرا دشمن برباد حالت میں میرے سامنے بیٹھا تھا۔

"یعنی اچھی نوکری ملتے ہی تم یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ گے؟ کیوں؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"آپ کا یہ سوچنا بجا ہے سر اور اسی وجہ سے کوئی مجھے نوکری پر نہیں رکھ رہا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ تمام عمر آپ کا غلام بن کر رہوں گا آپ جو کہیں گے میں وہ کروں گا۔ بس مجھے نوکری پر رکھ لیجئے۔" مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی رو پڑے گا۔ میں دل ہی دل میں اس کی حالت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اچھا بس بس! میں تمہیں نوکری پر رکھ رہا ہوں لیکن اپنی مجبوریوں کا رونا رو کر کوئی رعایت حاصل کرنے کی کوشش مت کرنا۔ یہاں کام کرنے والوں کی قدر ہوتی ہے۔ کام چوروں کی نہیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ سر۔ میں پوری محنت سے کام کروں گا۔" وہ شکر گزار لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ کل سے کام پر آجانا۔ میرا منیجر تمہیں تفصیلات بتادے گا۔ اب جاؤ۔"

میں نے روکھے لہجے میں کہا اور ایک فائل کھول کر اسے دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ وہ سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے فائل بند کی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر مسکرانے لگا۔ اب صحیح معنوں میں لطف آنے والا تھا۔ اگلے روز سے میرا سابقہ باس نذیر آفس آنے لگا۔ میں نے اس سے اپنی تذلیل کا جی بھر کر بدلہ لیا۔ اس پر کام کا بوجھ اتنا لاد دیا کہ اسے روز رات گئے تک آفس میں رکنا پڑتا، ہر تھوڑی دیر بعد اسے بلا بلا کر کسی بات پر ذلیل کرنا میرا معمول تھا۔ اس کے چہرے پر ذلت اور بے بسی کے تاثرات دیکھ کر میرے رگ و پے میں بے اختیار سکون کی لہر دوڑ جاتی۔ وہ بھی اپنے عروج کے وقت کا ایک کائیاں شخص رہا تھا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ میں وہی محسن ہوں جو کبھی اس کا ملازم تھا لیکن اب حالات مختلف تھے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اب میں اس کا باس تھا اور میری ملازمت کرنا اس کی مجبوری۔ سو وہ ہر ذلت اور ہتک آمیز سلوک کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ اس روز بھی میرے دفتر میں کچھ کاروباری دوست آئے ہوئے تھے اور بزنس کی گفتگو کے ساتھ پینا پلانا بھی چل رہا تھا جب انٹرکام کی گھنٹی بجی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے ریسیور اٹھا کر خشک لہجے میں کہا۔

"سر وہ..... ریکارڈ کیپر نذیر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" دوسری طرف سے میری سیکریٹری نے مئودبانہ انداز میں کہا۔

"کیا میں نے اسے بلایا تھا!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں سر۔ کہتا ہے کوئی ذاتی کام ہے آپ سے۔" سیکریٹری نے کہا۔

"میں کیا اس کی بیوی کا یار لگتا ہوں جو مجھ سے ذاتی کام کے لئے ملنا چاہتا ہے۔ اس سے کہو دفع ہو جائے۔ میں ابھی مصروف ہوں۔" میں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد آفس کا دروازہ کھلا اور نذیر اندر داخل ہوا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بال بے ترتیب تھے۔ وہ

اس وقت چہرے سے کافی پریشان نظر آرہا تھا۔ میں اسے اندر آتا دیکھ کر چونک پڑا۔

"واٹ نان سنس از دس! تم بلا اجازت اندر کیسے گھس آئے؟" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"سوری باس۔ مجھے معاف کر دیجئے لیکن مجھے صرف دو منٹ کی بات کرنی ہے۔ میں اس وقت بڑے مشکل میں ہوں۔" وہ تیر کی طرح لپک کر میری میز کی طرف آگیا۔

"کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ میں اس وقت ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہوں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا تو اس کی نظر بے اختیار میز پر رکھے شراب کے لوازمات کی طرف اٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمودار ہوئے لیکن پھر دوبارہ اس نے خود پر قابو پالیا۔

"سر میری بارہ سال کی بیٹی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ آئی سی یو میں داخل ہے۔ اس کے علاج کے لئے کچھ رقم درکار ہے۔ آپ بے شک ہر ماہ میری آدھی تنخواہ کاٹ لیں لیکن اس وقت میری بیٹی زندگی اور موت کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ خدارا میری مدد کریں۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ مجھے اس کی بات سن کر کوئی خاص دھچکا نہیں لگا کیونکہ گزشتہ روز ہی میں نے اماوس کی مورتی کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ نذیر کے گھر پر مزید قیامت ٹوٹنی چاہئے۔ بہت دنوں سے وہ بنا کسی خاص تکلیف کے زندگی گزار رہا تھا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ اپنی مجبوریوں کا رونا رو کر کوئی رعایت حاصل کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ویسے ہی میں تمہیں نوکری پر رکھ کر پچھتا رہا ہوں۔ اب دفع ہو جاؤ ورنہ اسی وقت کام سے نکال دوں گا۔" میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ غصے اور بے بسی سے سرخ ہوگیا۔

"بس کرو محسن بہت ہوگیا۔ میں نے تمہیں پہلے روز ہی پہچان لیا تھا۔ تمہیں خدا نے اونچا رتبہ دے دیا ہے تو اس کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔ اگر کبھی میں نے تمہارے ساتھ سخت سلوک کیا تھا تو وہ تمہاری خراب کارکردگی کی وجہ سے تھا لیکن تم مجھ سے اس کا کئی گنا زیادہ انتقام لے چکے ہو۔ میں نے آج تک تم سے کوئی شکوہ نہیں کیا لیکن آج میری اولاد کی زندگی کا سوال ہے میں عمر بھر تمہاری غلامی کروں گا۔ تمہاری ہر بات سہوں گا۔ بس اس وقت میری مدد کرو۔" وہ غصے سے بولتے ہوئے دوبارہ منت سماجت پر اتر آیا۔

"سالے حرام زادے تیری یہ اوقات کہ تو مجھ سے اس طرح بات کرے۔" میں نے طیش کے عالم میں شراب سے بھرا گلاس اٹھا کر اس کے منہ پر شراب پھینک دی۔ وہ بڑبڑا کر دو قدم پیچھے ہوگیا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ یقیناً شراب سے اس کی آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی ہوگی۔ اسی وقت میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے چہرے پر الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے گر گیا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں لاتیں رسید کرنی شروع کردیں۔

"کتے کے بچے۔ نالی کے کیڑے۔ تو اس قابل ہی نہیں کہ تجھے عزت دی جائے۔ میں نے تجھے نوکری دی۔ آسرا دیا اور تو میرے ہی سر پر چڑھ رہا ہے۔" میں غصے میں بولتا رہا اور اس کی پسلیوں میں، چہرے اور سر پر لاتیں رسید کرتا رہا۔ اس نے پہلے تو بچنے کی کوشش کی لیکن پھر اس میں بچنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ میں جب مارتے مارتے تھک گیا تو میں نے میز کے نیچے لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دوسرے ہی لمحے چپراسی دروازے پر نمودار ہوگیا۔

"سیکیورٹی کو بلاؤ اور اس سور کے بچے کو اٹھا کر سڑک پر پھینکوا دو۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی بتادو کہ آئندہ یہ میرے دفتر کے آس پاس نظر نہ آئے۔" میں نے طیش کے عالم میں کہا۔ کچھ ہی دیر میں سیکیورٹی کے آدمی آئے اور نذیر کو زخمی حالت میں گھسیٹتے ہوئے دفتر سے باہر لے گئے۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میرے دوست جو بیٹھے یہ سارا تماشہ دیکھ رہے تھے، میری ہمت اور "درست" رویے کی تعریف کرنے لگے۔ میں خود بھی نذیر کی ٹھکائی کرنے کے بعد کافی مطمئن محسوس کر رہا

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ میں نے تقریباً اپنا حساب برابر کرلیا تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی کرلیا تھا۔ اس روز شام تک میں شراب نوشی میں مصروف رہا۔ دوست گئے تو شام کو آفس خالی ہونے کے بعد میری سیکریٹری کمرے میں آگئی۔

فائزہ میری خاص سیکریٹری تھی اور اسے میں نے بطور خاص اپنے لئے رکھا تھا۔ اس کی گہری سبز آنکھیں، بھورے بال، کسا ہوا جسم اور ہچکولے لیتی ہوئی چال مجھے بہت پسند تھی۔ وہ میرے قریب آئی تو میں سب کچھ بھول کر اس کے ساتھ نشاط انگیز لمحات میں ڈوب گیا۔ وہ قریب دو ڈھائی گھنٹے مجھے لطف و سرور کے جہانوں کی سیر کراتی رہی، پھر لباس وغیرہ درست کر کے چلی گئی۔ میں یونہی آفس کے قالین پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ ایک تو شراب کا نشہ پھر فائزہ کے ساتھ گزارے ہوئے رومان پرور لمحات کا نشہ۔ دماغ اس وقت ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد میں بھی لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور کوٹ کندھے پر لٹکا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

آج کا دن تو میری توقع سے کہیں زیادہ کامیاب اور پر مسرت گزرا تھا۔ آج میں نے اپنے سابقہ باس نذیر سے جی بھر کے اپنی تذلیل کا بدلہ لیا تھا۔ دوستوں کے ساتھ اعلیٰ اور مہنگی شراب پی تھی اور فائزہ جیسی حسین لڑکی کے ساتھ جسمانی قربت کے لمحات گزارے تھے۔ اور یہ سب کچھ اس اماؤں کی مورتی کی بدولت تھا جس نے مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر لا بٹھایا تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر جیب سے مورتی نکال کر چوما اور پھر احتیاط سے واپس رکھ لی۔

آج فائزہ کی وجہ سے میں نے ڈرائیور کو سرِ شام ہی چھٹی دے دی تھی اس لئے اب گاڑی مجھے خود چلانی تھی۔ گو زیادہ شراب چڑھا لینے سے مجھے ہر چیز دھندلی نظر آرہی تھی لیکن مجھے اب کسی چیز کا ڈر نہیں تھا۔ میں ہر کام بلا خوف و خطر کر سکتا تھا۔ میری قسمت جو میرے ساتھ تھی۔ میں نشے میں نہ جانے کہاں کہاں سڑک پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ کئی گاڑیاں میری زد میں آتے آتے بچیں۔ ایک جگہ اچانک سبزی والا ٹھیلا لئے میرے سامنے آگیا۔ میری گاڑی کوئی اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جارہی تھی۔ چشم زدن میں گاڑی ٹھیلے سے ٹکرائی۔ ٹھیلا الٹ کر ایک طرف جا گرا اور سبزی والا قلابازی کھا کر فٹ پاتھ پر جا گرا۔ میں نے گاڑی روکے بغیر بلند قہقہہ لگایا اور گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی۔ میں اسی طرح گاڑی لہراتا ہوا نہ جانے کس سڑک پر نکل آیا۔ کافی دیر تک گاڑی چلتے رہنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں کسی غلط راستے پر نکل آیا ہوں۔ سڑک کے دونوں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں اور راستے میں جا بجا گڈھے موجود تھے۔ میں نے اپنی نشے سے بوجھل آنکھوں کو ملا اور راستے کو غور سے دیکھا، وہ سڑک دور تک اسی طرح جارہی تھی۔

"لعنت ہے۔ یہ میں کہاں نکل آیا؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا اور گاڑی واپس موڑنے کے لئے اسٹیرنگ گھمایا۔ لیکن نشے میں ہونے کی وجہ سے میں گاڑی کی رفتار کم کرنا بھول گیا۔ ستر اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی گاڑی کے پہیے جب اچانک گھومے تو گاڑی توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے الٹ گئی۔ الٹنے کے بعد گاڑی سڑک پر گھسٹتی ہوئی کافی دور تک گئی اور پھر جھاڑیوں میں جا کر رک گئی۔ مجھے نہ جانے کہاں کہاں چوٹیں آئی تھیں لیکن میں ابھی ہوش میں تھا۔ گاڑی رکنے کے بعد میں نے خود کو گھسیٹ کر گاڑی سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن یہ دیکھ کر میرے ہوش و حواس اڑ گئے کہ میرا نچلا دھڑ گاڑی میں پھنس چکا تھا۔ اسی اثناء میں کوئی چیز میرے سر سے رینگتی ہوئی میرے گالوں اور پھر گردن پر آگئی۔ میں نے بوکھلا کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو میرا ہاتھ خون کی چپچپاہٹ سے بھر گیا۔ ساتھ ہی میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے ایک بار پھر خود کو گاڑی سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن زور لگانے کے نتیجے میں میرا سر گھومنے لگا اور میں اسی طرح پھنسی ہوئی حالت میں بے ہوش ہوگیا۔ کہتے ہیں قدرت کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ شاید میرے غرور و تکبر اور گمراہی پر یہ لاٹھی حرکت میں آگئی تھی اور اب شاید میری گناہ آلود زندگی کا وقت قریب آچکا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ وہ کوئی چھوٹا سا اسپتال تھا کیونکہ دیواروں پر سے رنگ و روغن اکھڑ رہا تھا اور چھت پر لٹکا پنکھا نہایت

خستہ اور زنگ آلود حالت میں تھا۔ دروازے کھڑکیاں بھی ٹوٹے پھٹے سے تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو بے اختیار دماغ میں ٹیس سی اٹھنے لگیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے سے دماغ میں درد کی لہریں اٹھتی رہیں پھر آہستہ آہستہ ان میں کمی آنی شروع ہوگئی۔ جب طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو میں نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور پیلی سفید وردی میں ملبوس ایک وارڈ بوائے اندر داخل ہوا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ بے اختیار چونک پڑا۔

"اوہ! مریض کو ہوش آگیا۔" یہ کہہ کر وہ الٹے پاؤں واپس مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر واپس آیا تو اس کے ہمراہ ایک موٹی توند والا گنجا آدمی بھی موجود تھا جس کے گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹک رہا تھا۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟" اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"سر میں درد ہو رہا ہے..... لیکن میں یہاں کیسے آیا اور یہ اسپتال کس جگہ واقع ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو تقریباً دس روز پہلے کچھ لوگ یہاں چھوڑ گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ انہیں سڑک کے کنارے زخمی حالت میں پڑے ہوئے ملے تھے۔ آپ کی ٹانگیں بری طرح کچلی ہوئی تھیں اور سر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ ٹانگ کا علاج تو ہم نے کر دیا لیکن سر کی طرف سے ہمیں تشویش تھی کہ کہیں آپ کی یادداشت متاثر نہ ہو۔ کیا آپ یاد کر کے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" بظاہر ڈاکٹر نظر آنے والے آدمی نے بتاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میری گاڑی موڑتے وقت الٹ گئی تھی۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ویری گڈ۔ اپ اپنا نام بتا سکتے ہیں؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"ہاں۔ میرا نام محسن شمیم ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کی رہائش کہاں ہے محسن صاحب؟" اس نے ایک اور سوال کیا۔

"میرا گھر..... ہاں..... وہ" میں نے ذہن پر زور دیا لیکن مجھے کوئی جواب نہ مل سکا۔ الٹا میرے سر میں دوبارہ درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"اچھا اگر آپ کو یاد نہیں آرہا تو ذہن پر زور مت دیں۔ آپ اپنے کسی عزیز یا دوست کا نام بتا سکتے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔

"ہاں۔ میری بیوی اسماء میرا بزنس پارٹنر مکرم شیخ اور میرا قریبی دوست سکندر علی جس کا ایک ریسٹورنٹ بھی ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"بہت اچھے۔ کیا آپ کو ان میں سے کسی کا پتہ یا فون نمبر وغیرہ یاد ہے!" اس نے ایک اور سوال کیا۔ میں نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا لیکن ذہن پھر سپاٹ ہو گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کچھ یاد نہیں آیا۔ بے بسی سے میرا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ حادثے کی وجہ سے آپ کی یادداشت کا کچھ حصہ متاثر ہوا ہے اچھی بات یہ ہے کہ یادداشت مکمل طور پر ضائع نہیں ہوئی۔" ڈاکٹر نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر وہ میرے کپڑے..... میری چیزیں..... میرے بٹوے میں میرا کارڈ ہوگا اور میرے موبائل میں بھی میرے گھر کا نمبر ہے۔" میں نے چونک کر پوچھا تو ڈاکٹر مسکرا دیا۔

"بھلا حادثے کے بعد ایسی چیزیں کہاں ملتی ہیں۔ آپ کو کچھ چھینتوں میں ملبوس یہاں لایا گیا تھا۔ آپ کے پاس سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ ہم نے اگلے روز قریبی پولیس چوکی کو اطلاع دے دی تھی۔ انہوں نے جائے حادثے کا معائنہ کیا لیکن انہیں بھی کچھ نہیں ملا۔" اس نے افسوس سے بتایا۔

"میری گاڑی کی نمبر پلیٹ؟ اس سے کچھ پتہ چل جائے شاید....." میں نے ایک موہوم سی امید کے تحت پوچھا۔

"ہاں۔ ایسا ممکن تھا لیکن گاڑی پر نہ نمبر پلیٹ

www.pdfbooksfree.pk

موجود تھی اور نہ ہی کاغذات وغیرہ۔ اس علاقے میں چور ڈاکو وغیرہ کی اکثریت ہے۔ لاوارث گاڑی دیکھ کر نمبر پلیٹ اتار لے گئے ہوں گے تاکہ کسی واردات وغیرہ میں استعمال کرسکیں۔ اس معاملے میں آپ کی قسمت کچھ اچھی نہیں رہی۔" اس نے کہا تو میں قسمت کا سن کر بے اختیار چونک پڑا۔

"اوہ۔ اوہ..... میری جیب میں ایک مورتی تھی۔ وہ کہاں ہے؟ ارے ہاں۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ ڈاکٹر۔ وہ مورتی۔ مورتی کہاں ہے!" میں نے جوش سے بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کون سی مورتی؟ کیسی مورتی؟ میں نے آپ کو بتایا تو کہ ہمیں آپ کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ اور وہ مورتی؟ آپ نے تو اپنا نام محسن بتایا ہے۔ کیا آپ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں؟" ڈاکٹر نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ وہ..... دراصل..... کسی نے تحفتاً دی تھی۔" میں نے گڑبڑا کر بات بدلتے ہوئے کہا۔ "مجھے فوراً جانا ہوگا۔ مورتی نہ ملی تو کیا ہوگا۔ میں تو برباد ہوجاؤں گا۔ پلیز ڈاکٹر مجھے اسی وقت فارغ کردیں۔ میں جانا چاہتا ہوں۔" میں نے ڈاکٹر سے منت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے جانے میں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ میں ابھی کاغذات وغیرہ تیار کردیتا ہوں لیکن آپ جائیں گے کہاں۔ اپنا کوئی پتہ ٹھکانہ تو یاد نہیں ہے آپ کو۔ کہاں بھٹکتے پھریں گے۔؟" اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"وہ سب کچھ ہوجائے گا۔ بس مجھے جانے دیں اور صرف جائے حادثہ تک میری رہنمائی کردیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔" میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے بھی یہ سرکاری اسپتال ہے۔ ہمیں عموماً جگہ کی کمی کی پریشانی رہتی ہے اس لئے ہم بنا ضرورت کسی کو یہاں رکھ بھی نہیں سکتے۔"

اس نے کندھے اچکا کر کہا اور واپس مڑ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اسپتال سے فارغ کردیا گیا۔ میں نے اسپتال سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کوئی نواحی علاقہ تھا، کچی سڑکیں، چھوٹے چھوٹے مکان اور پیدل آتے جاتے لوگ۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر آگے بڑھ گیا۔ گو ڈاکٹر نے مجھے جائے حادثہ کا وقوع اچھی طرح سمجھا دیا تھا پھر بھی مجھے وہاں تک پہنچنے میں دقت ہوئی۔ کسی نہ کسی طرح لوگوں سے پوچھتا ہوا میں اس بڑی سڑک تک پہنچ گیا جو شہر کو جاتی تھی۔

یہ بڑی سڑک بھی یکطرفہ اور ٹوٹی ہوئی سی تھی۔ لیکن علاقے کی بقیہ سڑکوں سے بہرحال غنیمت تھی۔ شاید اسی لئے اسے بڑی سڑک کہا جاتا ہوگا۔ بہرحال مجھے اس سڑک پر تقریباً تین میل آگے جانا تھا۔ میں آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے چلنے لگا۔ گو میری جسمانی حالت اس وقت اچھی نہیں تھی لیکن میرے دماغ میں اس وقت بھونچال آیا ہوا تھا۔

اماوس کی مورتی اگر مجھے نہ ملتی تو میں ایک بار پھر اپنی زندگی کے اسی موڑ پر آ کھڑا ہوتا جہاں بحرومی اور بربادی میرا مقدر ہوتی اور زندگی کا یہ دوسرا کامیاب رخ دیکھنے کے بعد تو مجھے واپس پلٹنا بالکل گوارہ نہیں تھا۔ سو میں اپنی جسمانی حالت کی پروا کئے بغیر آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ مجھے موہوم سی امید تھی کہ مورتی گاڑی کے آس پاس کہیں گری ہوگی اور شاید اب تک وہیں پڑی ہو۔ اس میں کوئی ہیرے موتی تو جڑے نہیں تھے کہ کوئی اسے اٹھا کر لے جاتا۔ اس کی اہمیت تو صرف میں جانتا تھا۔

کئی گھنٹوں کی تھکا دینے والی پیدل مسافت کے بعد مجھے اپنی گاڑی تباہ شدہ حالت میں سڑک سے کچھ دور جھاڑیوں میں کھڑی نظر آئی۔ گاڑی کو دیکھتے ہی میرے جسم میں گویا جان سی آ گئی۔ میں حتی الامکان تیزی سے چلتا ہوا گاڑی کے قریب پہنچا۔ گاڑی اب گاڑی تو نہیں رہی تھی۔ سیٹیں اکھاڑ لی گئی تھیں، پہیے غائب تھے، کارٹیپ اور اسپیکر وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہے تھے گاڑی کیا تھی، بس اس کا بنیادی ڈھانچہ تھا، لیکن مجھے اس وقت گاڑی کی پروا نہیں تھی۔ میں نے گاڑی کے اندر اور آس پاس مورتی ڈھونڈنی شروع کردی۔

کئی گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد بھی مجھے مورتی کہیں نہیں ملی۔ میرا دل بے اختیار بیٹھنے لگا۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ حادثے کے بعد تو گاڑی کافی دور سے لڑھکتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ ہوسکتا ہے گاڑی موڑتے ہی مورتی کہیں گر گئی ہو یا پھر لڑھکتی ہوئی گاڑی سے..... میں نے آنکھوں کا چھجا بنا کر سڑک کی طرف دیکھا۔ دور تک دھول اڑاتی سڑک اور اس کے اطراف جھاڑیاں، ٹیلے اور تاحد نظر بنجر زمین۔ یہ تو گویا گھاس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا۔

میں کچھ دیر امید اور مایوسی کی کیفیات کے درمیان پھنسا گومگو کی حالت میں وہیں کھڑا رہا، پھر دل کو مضبوط کر کے مورتی تلاش کرنے چل پڑا۔ میں نے گاڑی کے پاس اس جگہ سے آغاز کیا جہاں تک میں پہلے مورتی تلاش کرچکا تھا۔ میں نہایت احتیاط سے ہر پتھر، ہر جھاڑی کو ہٹا ہٹا کر مورتی تلاش کررہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں جھاڑیوں میں الجھ کر میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے اور چہرے ہاتھوں پر خراشیں نمودار ہوگئیں۔ میرے جسم پر موجود سادہ شلوار قمیض بھی اسپتال والوں کا عنایت کردہ تھا۔ لیکن اب وہ بھی فقیروں والی حالت اختیار کرگیا تھا۔ ابھی میں دس گز کا علاقہ بھی تلاش نہیں کرپایا تھا کہ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ میں نے بے بسی سے سر پہ آتی رات کو دیکھا اور تیزی سے مورتی کو تلاش کرنے لگا۔ چند منٹ میں رات گہری ہوگئی اور اس قدر گہرا اندھیرا ہوگیا کہ مجھے اپنے ہاتھ پیر بھی نظر آنے بند ہوگئے۔ میں نے مورتی تلاش کرنی بند کردی اور وہیں پتھریلی زمین پر لیٹ گیا تاکہ اگلی صبح یہیں سے مورتی تلاش کرنے کا آغاز کرسکوں۔ لیٹتے ہی تھکن کے ساتھ بھوک اور پیاس بھی عود کر آئی۔ مورتی تلاش کرنے کی دھن میں مجھے بھوک پیاس کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ اطراف میں میلوں تک کچھ تھا اور نہ مجھ میں اتنی ہمت باقی تھی کہ اٹھ کر آبادی تک جاسکتا۔ سو میں خود پر ضبط کئے وہیں پڑا رہا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے ایک بار پھر اپنا پتہ ٹھکانہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے پرانے گھر کا منظر ابھر آیا جہاں میں غربت کی زندگی گزارتا تھا۔ رات کو کام سے تھکا ہارا لوٹتا تھا تو اسماء گرما گرم کھانے میرے آگے رکھتی تھی، پھر میں بستر پر پاؤں پسارے لیٹتا تھا تو اسماء اکثر میرے پیر دباتی تھی۔ اور آج میں بھلا کس حال میں تھا! کمر کے نیچے پتھریلی زمین تھی۔ پیٹ خالی تھا اور پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ مجھے اپنے گھر کا پتہ یاد آجائے یا میں وہ گلی اور راستے دیکھ لوں جو میرے گھر کو جاتے تھے لیکن ایسا کرنے سے میرے ذہن پر ایک سیاہ چادر سی پھیل گئی اور سب کچھ نظر آنا بند ہوگیا۔

اگلے روز سورج نکلتے ہی میں نے پھر مورتی کی تلاش شروع کردی۔ سارا دن مورتی تلاش کرنے کے باوجود میں ناکام رہا۔ اس دوران کھانے کے نام پر میں نے جھاڑیوں کے کڑوے پتے چبائے اور ان کا کسیلا رس حلق سے اتارا۔ میں کئی روز تک سڑک اور اس کے اردگرد علاقے میں بھٹکتا رہا۔ کبھی کوئی راہ گیر گزرتا تو ازراہ رحم کچھ کھانے کو دے جاتا ورنہ میں بھوکا رہتا یا جھاڑیوں کے پتے چباتا۔ میری داڑھی بڑھ گئی تھی اور کپڑے تار تار ہوگئے تھے۔ مورتی کی تلاش کے جنون میں میں آبادی کی طرف جا نکلا۔ میں ہر گلی، ہر سڑک، میدان اور چوراہوں پر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا مورتی تلاش کرتا رہتا۔ کبھی کسی گھر کا کھلا دروازہ دیکھ کر اس گھر میں گھس جاتا اور تلاشی لینا شروع کردیتا۔ آتے جاتے لوگوں کو روک کر ان کی جیبیں ٹٹولنا شروع کردیتا۔ کئی بار لوگوں نے زدوکوب کیا اور گالیاں دیں لیکن میرے دماغ پر اماوس کی مورتی کا خبط سوار تھا۔

آہستہ آہستہ میں پاگل مشہور ہوگیا۔ علاقے کے بچے پتھر لئے میرے پیچھے بھاگتے اور پاگل پاگل شور مچاتے۔ لوگ مجھے دیکھ کر مجھ پر پھبتیاں کستے اور قہقہے لگاتے۔ کچھ نیک اور شریف لوگ بھی تھے جو کبھی کچھ کھانے کو دے دیتے کبھی بچوں کو ڈانٹ کر مجھے پتھر مارنے اور ستانے سے منع کردیتے۔ سارا دن مورتی ڈھونڈنے اور لوگوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے بعد میں رات کو کسی گلی کے کونے میں یا کسی درخت کے نیچے سو جاتا۔ زندگی نے عجب موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ لاکھ چاہنے کے باوجود میں اپنی

www.pdfbooksfree.pk

پرانی زندگی میں لوٹ کر نہیں جاسکتا تھا کیونکہ یادداشت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

اماؤں کی مورتی مل کے نہیں دے رہی تھی کہ وہی میری مدد کرسکتی تھی۔ اسی کے سہارے میں دوبارہ ایک نئی زندگی شروع کرسکتا تھا۔ اس وقت میں کہاں بھٹک رہا تھا اور گھر سے کتنا دور تھا مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ کیا اسی طرح لوگوں کے پتھر ڈنڈے کھاتے ہوئے مجھے بالآخر مر جانا تھا؟ میں اکثر یہی باتیں سوچتا رہتا اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ مجھے روتا دیکھ کر لوگ مزید ہنستے۔ میں ان سے بچنے کے لئے گھٹنوں میں سر چھپالیتا۔ ایک روز میں کسی گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت نے مجھے آواز دے کر ایک روٹی اور کچھ سالن تھما دیا۔ میں اب خیرات کا عادی ہو چکا تھا۔ خاموشی سے روٹی لے کر وہیں گلی کی دیوار کے پاس بیٹھ گیا۔ ابھی میں روٹی کھا ہی رہا تھا کہ دو آدمی آئے اور اس دروازے پر دستک دی جس کے قریب میں بیٹھا تھا۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"صابر بھائی کو بھیج میں۔ میں ان کا دوست خالد ہوں۔" ایک آدمی نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر باریش آدمی باہر آ گیا۔ اس نے مجھ پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور پھر اپنے دوستوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہنے کے بعد خالد نامی آدمی بولا۔

"ارے صابر بھائی! میں تو بتانا ہی بھول گیا۔ آج نماز عشاء کے بعد بابا مشکور غنی کا درس ہے پچھلی بار کی طرح اس بار بھی وہ مسجد کے صحن میں درس دیں گے۔ ساری خلقت ان سے دعا کروانے آئے گی۔ پچھلی بار جب وہ آئے تھے تو تم کام کے سلسلے میں شہر گئے ہوئے تھے۔ اس بار تو چلو گے ناں؟" خالد نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ یہ انہی کی دعا کا اثر تو ہے جو میرا ایک سال سے کھویا ہوا بیٹا مل گیا۔ انہوں نے جو وظائف بتائے تھے اس کی بدولت ساتویں روز ہی وہ خود گھر پہنچ گیا۔ ان کا تو میں نے شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔" صابر کہہ رہا تھا اور میں سر جھکائے روٹی کھانے کے ساتھ ساتھ ان کی باتیں بھی سن رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اگر یہ بزرگ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں تو پھر یہ اماؤں کی مورتی ڈھونڈنے میں میری مدد بھی تو کر سکتے ہیں۔ مجھے اچانک مایوسی کے اندھیرے میں ایک امید کی کرن نظر آنے لگی۔

رات کو میں بھی مسجد پہنچ گیا لیکن مجھ میں اندر جانے کی ہمت نہ ہو سکی اس لئے میں باہر دروازے کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ نماز کے بعد سارے نمازی صحن میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ کچھ دیر تک مجمع میں بھنبھناہٹ ہوتی رہی پھر بابا مشکور کا درس شروع ہوتے ہی لوگ خاموش ہو کر باادب بیٹھ گئے۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ صحن میں میز پر ایک نورانی صورت بزرگ بیٹھے تھے۔ سفید لباس پر سیاہ عمامہ اور سفید براق داڑھی، ماتھے پر سجدے کا نشان موجود تھا اور چہرے پر نرمی کے تاثرات موجود تھے۔ ان کی آواز گونج دار لیکن نرم اور دل موہ لینے والی تھی۔ میں چپکے چپکے ان کو دیکھتا رہا اور ان کا درس سنتا رہا۔ وہ لوگوں کو صبر و قناعت اور اللہ پر توکل کا درس دے رہے تھے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ درس ختم ہو، دعاؤں اور لوگوں کے مسائل کا سلسلہ شروع ہو تو میں بھی اپنا مسئلہ بیان کروں۔ درس ختم ہونے کے بعد اجتماعی دعا ہوئی اور پھر لوگوں نے باری باری اپنی حاجات کے لئے دعا کروانی شروع کی۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اتنے سارے لوگوں کے سامنے جا کر اپنا مسئلہ بیان کروں پھر میں نے سوچا کہ جب سب لوگ چلے جائیں گے تو میں اکیلے میں جا کر ان بزرگ سے اپنے لئے مدد مانگوں گا۔ ابھی کچھ ہی لوگ دعا کروا کر پلٹے ہوں گے کہ اچانک بابا مشکور نے نظریں اٹھا کر مسجد کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں میں اوٹ میں دبکا کھڑا تھا۔

"بھئی اس کو بھی اندر آ لینے دو۔ بہت بھٹک لینے کے بعد آیا ہے۔" انہوں نے اونچی آواز میں کہا تو سارے لوگ بے اختیار چونک پڑے۔ میں جھجک کر مزید پیچھے ہو گیا۔

"آجاؤ محسن میاں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔" انہوں نے پھر اونچی آواز میں میرا نام پکار کر کہا تو میں حیران ہو گیا۔ بھلا ان بزرگ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا، میں آہستہ آہستہ اوٹ سے باہر نکلا اور سر جھکائے مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے اس وقت اپنی حالت پر شرم آ رہی تھی۔ میں مہینوں سے نہایا نہیں تھا۔ سر اور داڑھی کے بال الجھے اور بے ترتیب تھے، کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔ بھلا اس حالت میں بھی کوئی مسجد میں داخل ہوتا ہے۔

"آؤ۔ یہاں آؤ۔ ہمارے پاس بیٹھو۔" انہوں نے شفقت سے کہا۔ میں جھجکتے ہوئے ان کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ لوگ بھی حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ مجھ پاگل کو یہ بزرگ اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔

"جو دل میں ہے ابھی کہو گے یا پہلے ہم ان لوگوں کی بات سن لیں!" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

تو آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔

"پہلے آپ ان لوگوں کی بات سن لیں۔" میں نے بڑے مشکل سے ہمت مجتمع کر کے دھیمی آواز میں کہا۔

میری بات سن کر بابا مشکور مسکرا دیئے۔ انہوں نے مجمع میں بیٹھے لوگوں سے ایک کو آنے کا اشارہ کیا۔

"بابا۔ پچھلے سال ایک حادثے میں میری آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ جو ہوا وہ اللہ کی مرضی تھی لیکن آنکھوں میں شدید تکلیف رہتی ہے۔" اس شخص نے ادب سے کہا۔

بزرگ نے میری طرف دیکھا۔

"کیوں بیٹا محسن! تمہیں ایسی کوئی، پریشانی تو نہیں ہے؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے اس آدمی کو ایک دعا بتائی اور دوسرے شخص کو آنے کا اشارہ کیا۔

"بابا جی۔ اللہ نے تین بار اولاد سے نوازا لیکن کچھ ہی عرصے میں ایک ایک کر کے تینوں ہی واپس لے لیں۔ دعا کریں کہ اللہ میری اولاد کو زندگی دے۔" اس آدمی نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ بزرگ نے پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے ان کی نظروں کا اشارہ سمجھ کر پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ اسی طرح باری باری لوگ آتے گئے اور اپنی پریشانیاں اور دکھ درد بیان کرتے گئے۔ کسی کی بیٹی کی شادی کا مسئلہ تھا، کسی کے گھر فاقے ہو رہے تھے، کسی کی بیوی نافرمان تھی اور کسی کا بھائی نشے کا عادی تھا۔ ہر بار کسی کو دعا یا وظائف بتانے سے پہلے بزرگ میری جانب دیکھتے اور میں نفی میں سر ہلا دیتا۔ آہستہ آہستہ تمام لوگ رخصت ہو گئے۔

"کیا بات ہے محسن میاں؟ تم دنیا کی کسی ایسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہو جس میں یہ سب لوگ گرفتار ہیں۔ پھر تمہارا حال ان لوگوں سے ابتر کیوں ہے؟" انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تو میرے آنسو چھلک پڑے۔

"میں جانتا ہوں تم نے کیوں اپنی زندگی برباد کر رکھی ہے۔ ایک اللہ کا بندہ بننے کے بجائے تم ایک مورتی کے غلام بن گئے؟ یہ تو نعوذ باللہ کھلا شرک ہے۔ کس چیز کی محرومی کا شکوہ تھا تمہیں؟ اللہ نے تمہیں روز پیٹ بھر کر کھانا نصیب کیا، نیک طبیعت بیوی عطا کی، صحتمند اور تندرست اولاد دی، بوڑھے والد کی خدمت کا موقع دیا، سر پر چھت عطا کی، تمہیں روزگار دیا پھر بھی تمہیں لگتا تھا کہ خدا نے تمہارے ساتھ ناانصافی کی؟ اور جب تمہیں یہ سب مل گیا تب تم نے کیا کیا؟ دنیا کی ہر برائی کو اپنا لیا؟ شراب زنا کاری، تکبر، جھوٹ اور بے ایمانی جیسی تباہ کن برائیوں میں غرق ہو گئے۔ جتنا تم نے اس اماؤں کی مورتی سے مانگا، کیا کبھی اس سے آدھا بھی اپنے اللہ سے مانگ کر دیکھا؟ کبھی نماز روزے کی فکر کی؟ کبھی صلوٰۃ الحاجات پڑھی؟ شکرانے کے نفل ادا کئے؟ کبھی اپنے گناہوں پر نادم ہو کر صلوٰۃ التوبہ ادا کی؟ ارے اپنے رب سے رجوع کر کے دیکھتے، اس کے آگے ہاتھ پھیلا کر تو دیکھتے۔ کیا وہ جو ستر ماؤں سے بڑھ کر اپنے بندے سے پیار کرتا ہے کیا اپنے بندے کی پکار نہیں سنے گا؟ کیا اللہ کبھی اپنے کسی بندے کا برا چاہے گا؟ اپنے گھر کی دیوار کا رنگ میلا ہو جائے تو افسوس ہوتا ہے کہ اتنی محنت سے بنائے گھر میں نقص پیدا ہو گیا۔ اللہ نے جس محبت سے اپنے بندے کی تخلیق کی اس کی

www.pdfbooksfree.pk

نافرمانی اور غفلت پر اسے افسوس نہ ہوتا ہوگا۔" بابا مشکور دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے اور میں ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ بابا اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگئے لیکن میرے آنسو نہیں تھمے۔ یہ شرمساری کے آنسو تھے، توبہ کے آنسو تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں غرق ہوجاؤں۔ بزرگ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ درست تھا۔ میں اس سے کہیں زیادہ بڑی سزا کا مستحق تھا۔

"تمہیں اس مورتی کی تلاش تھی ناں۔ یہ رہی وہ مورتی۔" بابا مشکور نے اپنے قریب رکھی پوٹلی میں ہاتھ ڈالا اور اماوس کی مورتی نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے چونک کر اس مورتی کو دیکھا۔ بلاشبہ یہ وہی مورتی تھی لیکن اب اس مورتی سے میرا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔

"مجھے نہیں چاہئے یہ مورتی۔ میں اپنی پرانی غربت کی زندگی میں ہی خوش تھا۔ اس شیطانی مورتی نے مجھے برائی کی دلدل میں غرق کر دیا۔ اب نہیں چاہئے مجھے یہ مورتی۔" میں نے روتے ہوئے کہا تو بابا مشکور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیرنے لگی۔

"تو پھر اللہ کا نام لے کر یہ پتھر اٹھاؤ اور اس مورتی کو پاش پاش کردو۔" انہوں نے کہا تو میں نے تیزی سے پاس پڑا پتھر اٹھایا اور اللہ اکبر کہہ کر مورتی پر دے مارا۔ مورتی ایک زوردار آواز کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

"مورتی تو اب رہی نہیں۔ تم کیا کرو گے؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"میری باقی بچی پوری زندگی بھی اپنے گناہوں کی توبہ کے لئے کم ہے۔ مجھے اپنی غلامی میں لے لیں۔ بس اب میں اللہ سے معافی چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔" میں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ مشکور نے ایک گہری سانس لی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی سبز موتیوں والی تسبیح میرے ہاتھ میں تھمادی۔

"بیٹا جس قدر ہو سکے استغفار کا ورد کیا کرو۔ تمہارے ذمے کچھ لوگوں کے حقوق ہیں، کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ تمہارے بیوی بچے، تمہارے بوڑھے والد۔ ان کے فرائض کو پورا کرنا تمہارے ذمہ ہے۔ تمہیں واپس جانا ہوگا۔ اسی دنیا میں خیر و شر کی آویزش کے درمیان۔ صحیح اور غلط میں سے خود فرق کرنا ہوگا۔ جاؤ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے مجھے گلے سے لگالیا اور پھر میری آنکھوں پر دونوں انگوٹھے رکھ کر کچھ پڑھنے لگے۔ میں نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ آہستہ آہستہ ان کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہونے لگی اور تیز ہواؤں کا شور ساتھ میں گڈمڈ ہونے لگا۔ پھر ان کی آواز آنی بند ہوگئی۔ میں کافی دیر تک یونہی ساکت کھڑا رہا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ مگر یہ کیا؟

میں اس وقت نیٹی جیٹی کے پل پر کھڑا تھا۔ عین اسی جگہ جہاں میں خودکشی کی سوچ رہا تھا اور ایک فقیر نے آکر مجھ سے میری زندگی کے بدلے اماوس کی مورتی کا سودا کیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں مل کر دیکھا۔ یہ کہیں کوئی خواب تو نہیں تھا؟ یا پھر وہ سب کچھ خواب تھا جو اب تک میں دیکھتا رہا تھا۔ میں شدید الجھن کے عالم میں کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"گھاٹے کا سودا کر رہا ہے تو۔" میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہی غلیظ حلیے والا فقیر پل کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا جس نے مجھے اماوس کی مورتی دی تھی۔

"اگر زندگی اتنی بے کار ہے تو مجھے بیچ دے۔" یہ وہی الفاظ تھے جو اس کے منہ سے میں پہلے بھی سن چکا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ میری زندگی بے کار ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور واپس پلٹ کر اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ اب میری چال میں ایک اعتماد اور یقین موجود تھا۔ اب اس واقعے کو دس 10 سال گزر چکے ہیں۔ میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ مطمئن اور آسودہ زندگی گزار رہا ہوں۔ ہر نماز کے بعد اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی ضرور مانگتا ہوں۔ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس روز میں نے پل پر کھڑے ہو کر کوئی خواب نہیں دیکھا تھا کیونکہ بابا مشکور کی سبز دانوں والی تسبیح آج بھی میرے پاس موجود ہے۔

انتقام

علی آفاق کاشی - آزاد کشمیر

سیٹھ کی آنکھ اچانک کھل گئی تو اس نے اپنے سامنے ایک روشن ہیولے کو دیکھا، وہ ہیولہ بہت ہی غضبناک حالت میں تھا، ہیولے نے اپنے نوکیلے ہاتھ سیٹھ کی طرف بڑھائے اور سیٹھ کی گردن گرفت میں کرکے اس کے نرخرے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔

ایک ہوس پرست شخص کی رونگٹے کھڑے کرتی لہولہان عبرت سے بھرپور کہانی

لہلہاتے کھیتوں

کے درمیان وہ خوبصورت بنگلہ تھا۔ مگر اس بنگلے کا مالک سیٹھ شیام خوبصورت نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شکل وصورت کا برا تھا۔ صورت اس کی جتنی اچھی تھی اس سے کہیں زیادہ بری اس کی سیرت تھی عورتوں کے لئے۔ جب بھی کوئی عورت اس کے بیڈروم کی زینت بنتی تو اسے کچل مسل کر رکھ دیتا۔ گاؤں کے لوگوں کو بھی اس کے کرتوتوں کا علم تھا۔ مگر وہ بے چارے غریب لوگ تھے۔ گاؤں کے لوگ بارسوخ سیٹھ شیام کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ گاؤں والوں کے کچھ نہ کرنے سے سیٹھ کو مزید حوصلہ ملا اور وہ پہلے سے زیادہ بے خوفی سے من مانیاں کرنے لگا۔

سیٹھ شیام یہ بھول گیا تھا کہ ایشور کی زبردست ذات اوپر بیٹھی ہے جو پہلے تو ظالموں کو ڈھیل دیتی ہے۔ مگر پھر اچانک رسی کھینچ لیتی ہے۔ جس سے وہ ذلیل و خوار ہو کر دنیا سے چلا جاتا ہے۔ سیٹھ شیام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

www.pdfbooksfree.pk

سیٹھ شیام اکثر اپنے بنگلے میں شراب و شباب کی محفلیں جمایا کرتا تھا۔ اس محفل میں اس کے دوست بھی موجود ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے محفل جمائی تو ایک اپسرا جیسی خوبصورت کم عمر طواف کو انوائٹ کیا۔ اس وقت کی وہ بہت مشہور و معروف تھی اپنی خوبصورتی اور دلربائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ بڑے بڑے دل پھینک دولت مند سیٹھوں کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ان کی محفل کی زینت بنے مگر ایسا نہیں ہوتا تھا، جو سب سے زیادہ رقم دیتا وہ اس کی دعوت قبول کرتی۔ اس نے اپنی لبھانے والی اداؤں سے نہ جانے کتنوں کو اپنا اسیر بنا رکھا تھا۔ اس دلربا کا نام پھول وتی تھا۔ سیٹھ شیام کے دل میں بھی تھا کہ وہ بھی پھول وتی کو اپنے بیڈروم کی زینت بنائے۔ اسی خیال کو وہ آج عملی جامہ پہنا رہا تھا۔

سیٹھ اور اس کے دوست نشے میں چور تھے اور پھول وتی کا ہوشربا رقص دیکھ رہے تھے۔

ایک بولا۔ ”ایسے ناچتی ہے جیسے کہ کوئی اپسرا فضاؤں میں رقص کر رہی ہو۔“

دوسرا بولا۔ ”بجلی کی طرح تیزی سے تھرکتا ہوا شریر دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ بوٹی بوٹی کر دوں۔“

تیسرا بولا۔ ”مگر اب تو بوٹی بوٹی شیام کرے گا۔“

ایک اور نشے میں چور لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ ”میرا بس چلے تو میں اسے دنیا کے کسی ایسے کونے میں لے جاؤں جہاں کہ کوئی اور نہ ہو۔“

سیٹھ شیام بڑی قاتل نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جلد از جلد رقص ختم کرا کے اپنی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔ آخر رقص ختم ہو گیا تو سیٹھ شیام کے دوستوں نے تعریف کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ خیر تھوڑی دیر تک پینے پلانے کی محفل جمی رہی، اس کے بعد سارے دوست چلے گئے۔

پھول وتی سیٹھ شیام کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ شراب سے لبالب بھرا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ سامنے میز پر ایک بڑا سا کٹا ہوا آدھا سیب پڑا تھا۔ ساتھ ہی تیز دھار بڑی چھری بھی موجود تھی۔ سائیڈ میں خوب صورت ڈبل بیڈ بھی موجود تھا۔ جس پر نہ جانے کتنی عورتوں کی عزت کو پامال کیا گیا تھا۔ اپنی ہوس کی تسکین کے لئے۔

اس وقت سیٹھ شیام کسی بھیڑیے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

پھول وتی یہ منظر دیکھ کر کسی بے یار و مددگار ہرنی کی طرح سہم کر رہ گئی، وہ طوائف ضرور تھی مگر کسی عمر رسیدہ اور تجربہ کار جیسی نہیں تھی بلکہ اپنی کم عمری کے باعث ابھی تک معصوم تھی۔

سیٹھ شیام جیسے درندہ صفت کا تشدد برداشت کرنے کی اس میں ابھی قطعی سکت نہ تھی۔ اس لئے وہ ڈری ڈری نظروں سے سیٹھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

دوسری طرف پنڈت گوپال کالی ماتا کے مندر میں موجود تھا۔ مندر سے تھوڑے فاصلے پر موجود سیٹھ شیام کے بنگلے میں ہونے والا ہلا گلا اب سرد پڑ گیا تھا۔

”آخر سیٹھ شیام اپنی درندہ صفت عادتوں سے باز نہیں آتا۔“ پنڈت گوپال نے سوچا۔ سیٹھ شیام کے درندہ پن سے پنڈت ہی کیا بلکہ سارا گاؤں واقف تھا، مگر گاؤں والے بے چارے محنت مزدوری کرنے والے جبکہ سیٹھ شیام کی تھانے، پولیس میں بھی رسائی تھی، پولیس والے کھل کر اس کا ساتھ دیتے تھے، کئی مرتبہ اس کی شکایت تھانے پہنچی، مگر شکایت کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے خاموش کر دیا گیا۔

پنڈت نے کئی مرتبہ اشارے کنائے میں بہت کچھ اسے سمجھایا اور ایسے کاموں سے دور رہنے کی تلقین کی۔ بھگوان اور دیوی دیوتاؤں کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کے لئے کہا، مگر سیٹھ شیام پر پنڈت کی کسی بات کا بھی اثر نہیں ہوا، بلکہ مندر میں جو وہ دان کرتا تھا، اسے بھی روک لیا۔

کمرے میں بیٹھے سیٹھ شیام نے شرابی نگاہوں سے پھول وتی کو دیکھا تو اس کے اندر کا بھیڑیا بیدار ہونے لگا۔ پھر اس نے شراب کا آخری گھونٹ بھرا اور گلاس کو میز پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

پھول وتی نے اسے دیکھا اور بولی۔ ”سیٹھ صاحب! میں زیادہ تشدد پسند نہیں ہوں۔ ہم آرام سے یہ رات گزار سکتے ہیں۔“ مگر سیٹھ تو درندہ تھا۔ آرام کا لفظ تو اس نے جیسے کبھی سنا ہی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ اور دھان پان سی نازک پھول وتی کو پکڑ کر بیڈ پر گرا لیا۔ گرنے سے پھول وتی کا پاؤں ٹیبل سے ٹکرا اور ٹیبل کے ہلنے سے اس پر موجود چھری اچھل کر نیچے گر پڑی۔ چھری کے گرنے کا انداز ایسا تھا کہ صوفے کے قریب سیٹھ کی جوتی پڑی ہوئی تھی۔ چھری اس طرح گری کہ جوتی کے سہارے سے وہ کھڑی ہو گئی۔ چھری کا تیز پھل اوپر کی طرف اٹھ گیا۔ ادھر درندہ صفت سیٹھ کا درندہ پن شروع ہو چکا تھا۔

پھول وتی کے ”واسطے“ گڑگڑائیں، ”التجائیں“ دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ پھول تھی۔ درندہ اس کی پتیاں نوچنے لگا۔ وہ ریشم جیسا وجود رکھتی تھی۔ درندہ اس ریشم کو ادھیڑنے اور چیرنے لگا۔ پھول وتی کی کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہ پھول کچلا مسلا جا رہا تھا۔

کبھی کبھی انسان کیسے بھیڑیے بن جاتے ہیں کسی کی تکلیف کا احساس نہیں کرتے۔ محض انہیں اپنی ہوس پرستی عزیز ہوتی ہے، کسی کے آہ و بکا کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

پھول وتی کی کراہیں آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگیں۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ مگر سیٹھ اسے کچلتا رہا۔ مسلتا رہا۔ بھیڑیے کی طرح بھنبھوڑتا رہا۔ درندے کی طرح چیرتا رہا۔ آخر وہ بھی تھک گیا۔ وہ ہانپنے لگا تھا۔

آخر نشے سے چور اپنی ہوس کی تکمیل کے بعد وہ سو گیا۔

پھول وتی کافی وقت بے ہوش رہی۔ اس کی آنکھ کھلی، اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی۔ درد کی ایک لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی، اس کے منہ سے بے اختیار کراہیں نکلنے لگیں۔ پھر وہ جیسے تیسے اٹھی ایک نظر اپنے وجود پر ڈالی۔ جو اس وقت روندا گیا تھا، اچانک اسے چکر آیا تو وہ گر گئی۔

ایک کربناک اور فلک شگاف چیخ نے کمرے کو دہلا کر رکھ دیا۔ کیونکہ وہ منہ کے بل گری تھی، فرش پر اور اس جگہ پڑی ہوئی چھری سیدھی اس کے سینے میں گھس گئی۔ وہ اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگی اور پھر اس کی آتما اس کا جسم چھوڑ کر الگ ہو گئی۔ پھول وتی اذیت ناک موت سے ہمکنار ہو کر مر گئی۔ مگر سیٹھ کا مکافات عمل شروع ہو گیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ پنڈت گوپال کو بے چینی محسوس ہوئی، جیسے کوئی خطرہ منڈلا رہا ہو، پنڈت کو پراسرار علوم پر کافی دسترس حاصل تھا۔ آسیب، بھوت، چڑیل اور کئی بھٹکی ہوئی آتمائیں بھی ان کے قبضے میں تھیں، اس طرح انہیں چھپی ہوئی باتوں کا بھی علم ہو جاتا تھا، مگر آج اپنی بے چینی کی حقیقت کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ”بھگوان کرپا کر، سب کو امن و شانتی سے رکھنا، منش اپنی لوبھی فطرت سے بے حال، دولت اور ہوس پرستی کے چکر میں پڑا رہتا ہے، سب پر کرپا کر۔“ پنڈت کو بالکل بھی شانتی نہیں مل رہی تھی، لہٰذا پنڈت اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

بہرحال اپنی مخصوص رفتار سے رات آگے کو بڑھ رہی تھی۔ سیٹھ شیام اپنے بستر پر تنگ دھڑنگ آڑے ترچھے پڑا ہوا تھا۔

اچانک اس کمرے میں ایک ہیولہ جیسے ہوا پر تیرتا ہوا آہستہ آہستہ آگے کو بڑھ رہا تھا۔ پھول وتی کی قابل اعتراض اور قابل رحم لاش وہیں پڑی تھی۔ وہ ہیولہ سیٹھ شیام کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ اس کے بعد وہ ہیولہ ایک ٹھوس وجود اختیار کر گیا، اس کی شکل بہت ہی بھیانک اور وحشت ناک ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں کی جگہ جیسے دو انگارے سے دہکنے لگے پھر اچانک ان میں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس کے ہاتھ کے ناخن لمبے ہو گئے تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ سیٹھ کی طرف بڑھائے اور اسے گردن سے پکڑ لیا۔

سیٹھ شیام کسمسایا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے سامنے بھیانک شکل دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو گیا۔ اس کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگیں۔ ہیولے نے اپنے نوکیلے ہاتھ سیٹھ شیام کی گردن میں پیوست کر دیئے۔ اور پھر سیٹھ کے نرخرے کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔

سیٹھ کے منہ سے طویل اور آخری چیخ نکلی۔ اس

www.pdfbooksfree.pk

کی گردن سے بھل بھل خون فوارے کی طرح نکل کر بستر کو رنگین کرنے لگا اور پھر تڑپتے ہوئے سیٹھ نے آخری ہچکی لی اور بے سدھ ہوگیا۔

دوسرے دن صبح سورج نکل آیا۔ سیٹھ شیام کے گھر کے ملازمین صفائی وغیرہ کرنے لگے۔ کافی وقت گزر گیا۔ سیٹھ کا اکلوتا بیٹا جاگا۔ وہ بھی باپ کی طرح عیاش تھا۔ نت نئی لڑکیوں کو اپنے بستر کی زینت بنانا اس کی بھی عادت تھی۔

بہرحال سورج آگے بڑھنے لگا۔ مگر سیٹھ شیام اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا۔ اس کے بیٹے کو پریشانی ہوئی۔ اس نے کمرہ کھولا تو دنگ رہ گیا۔ سامنے اس کے باپ کی خون سے لت پت برہنہ لاش پڑی تھی۔ پاس ہی پھول وتی بھی برہنہ حالت میں مری پڑی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر پھول وتی کی لاش کو سیدھا کیا تو اس کی چیخ منہ میں گھٹ کر رہ گئی۔ چھری کا پورا پھل پھول وتی کے خوب صورت نقرئی سینے میں پیوست تھا۔

بیٹا ذہین تھا۔ سمجھ گیا کہ باپ رات کس حالت میں تھا۔ مگر اس کی موت اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

چونکہ اس طرح بات پھیل سکتی تھی اور بدنامی بھی ہوسکتی تھی کہ سیٹھ کو کسی نے بھیانک انداز میں قتل کردیا ہے۔ اس لئے اس نے سیٹھ کی لاش کو اٹھوایا اور اپنے رسم ورواج کے مطابق ٹھکانے لگا دیا جبکہ پھول وتی کی لاش کو بنگلے کے پیچھے ایک گڑھا کھدوا کر اس میں دبوا دیا۔

شام کا وقت تھا۔ پنڈت کالی ماتا کے مندر میں بیٹھا تھا۔ سیٹھ شیام کی موت کے بارے میں اسے پتا چل گیا تھا۔ وہ الجھن میں تھا کہ اتنے خوفناک انداز میں قتل کسی نے انتقام لیا ہوگا۔ مگر کس نے؟ یہی سوال پنڈت کو پریشان کر رہا تھا۔

خیر، رات آئی اور گزر گئی۔ صبح کے وقت پنڈت کو ایک چیلے نے بتایا کہ ''سیٹھ شیام کے بیٹے کی موت بھی ہوگئی ہے، بالکل، اپنے باپ کی طرح۔'' اور پھر ایک دن مزید گزرا اور سیٹھ شیام کی بیوی کی موت بالکل اسی طرح ہوئی۔ پھر اس کی بہو بھی اسی طرح چل بسی۔

پے در پے قتل کے واقعات نے جہاں پنڈت کو الجھا دیا، وہیں سارے گاؤں والوں کو بھی پریشانی لاحق ہوگئی۔

تیسرے دن گاؤں کا ایک اور آدمی بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کی موت بھی اسی طرح ہوئی تھی۔ گردن ادھیڑ دی گئی تھی۔ یہ دیکھتے ہوئے پنڈت نے ایک جاپ شروع کردیا۔ کئی دن کی متواتر جاپ کرنے سے پنڈت کو کامیابی ملی۔ پنڈت نے پورے گاؤں میں اعلان کرادیا کہ ''فلاں دن تمام اہل گاؤں فلاں بڑے میدان میں جمع ہوں۔''

مقررہ دن پر جب میدان میں گاؤں کے سارے افراد جمع ہوگئے تو پنڈت نے سب کے سامنے کھڑے ہو کر کوئی منتر پڑھا تو اچانک گاؤں والے چونک پڑے کیونکہ وہاں پھول وتی حاظر ہوئی تھی۔ پنڈت نے گرج کر کہا۔ ''اب تو سارے گاؤں والوں کو بتا کہ اصل حقیقت کیا ہے اور تیرے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''میں سیٹھ شیام کا شکار ہو کر مرگئی۔'' پھول وتی لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''سیٹھ شیام نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا، اس نے میرے ساتھ درندوں والی حرکت کی اور میں مرگئی۔ مگر مجھے انتقام لینا تھا۔ اس لئے میں نے سیٹھ کو اور اس کے خاندان کو تباہ کر ڈالا۔ میرا انتقام تو پورا ہوگیا مگر مجھے مرد ذات سے نفرت ہوگئی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ہر مرد کو مار دوں۔ مگر پنڈت جی نے مجھے روک دیا۔ پنڈت جی سے میں بنتی کرتی ہوں کہ بنگلے کے پیچھے سے گڑھا کھود کر میری لاش کو نکلوا کر رسم ورواج کے مطابق میرا کریا کرم کردیا جائے۔ اس طرح میری آتما ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گاؤں سے پرلوک میں چلی جائے گی۔''

پھول وتی کی لاش کو بنگلے کے پیچھے سے گڑھا کھود کر نکالا گیا اور ہندو رسم ورواج کے مطابق اسے چتا کے حوالے کردیا گیا۔ چتا جلنے کے بعد پھول وتی کا وجود ایک ہیولہ کی شکل میں نظر آیا، وہ اپنا ہاتھ ہلاتی ہوئی آسمان کی وسعتوں میں غائب ہوگئی۔

موبائل کی روح

خلیل جبار-حیدرآباد

اسپتال میں زیر علاج مریض کی نظر جیسے ہی نرس پر پڑی تو وہ فلک شگاف آواز کے ساتھ چیخنے لگا۔ چڑیل چڑیل۔ وہ مریض بدحواس ہو کر چیخے جارہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کمرے میں موجود دیگر لوگوں نے دیکھا کہ.....

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ایک چڑیل کی دیدہ دلیری جس نے لوگوں کو لرزا کر رکھ دیا تھا

وہ سردی کے دن تھے، میں شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کی غرض سے شہر سے گاؤں آیا تھا۔ اور اب اپنی کار میں واپس شہر حیدرآباد جارہا تھا۔ میرے کزن نے بہت کوشش کی تھی کہ میں رات کے وقت گاؤں میں ہی رک جاؤں لیکن صبح ایک بزنس میٹنگ میں میرا شریک ہونا ضروری تھا۔

''کامران بھائی دیکھ کر جانا راستے میں کوئی چڑیل نہ مل جائے۔'' اسماعیل ملک نے کہا۔

''کیا چڑیل بھی مل سکتی ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں آگے جو جنگل ہے اس میں آسیب کا راج ہوتا ہے۔ اور وہ آسیب رات میں مسافروں کو تنگ کرتے ہیں۔'' اسحاق نے بتایا۔

''تم گاؤں والے ایسی باتوں کو مانتے ہو، ہم شہر والے آسیب پر یقین نہیں رکھتے۔'' میں نے ان کا مذاق اڑایا۔

www.pdfbooksfree.pk

"کامران بھائی تم شہر والوں کا کبھی کسی آسیب سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس لئے ایسا کہہ رہے ہو۔ جس دن تم نے دیکھ لیا پھر ہم پوچھیں گے۔" نصیر الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ویسے یہ حقیقت ہے ان دنوں ایک چڑیل مسافروں کو نظر آرہی ہے لیکن کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔" اسحاق نے کہا۔

"اچھا بھئی تمہاری معلومات کا شکریہ آج میں بھی اس چڑیل کو دیکھ لوں گا۔ میں نے کبھی چڑیل نہیں دیکھی اگر وہ چڑیل میرے سامنے آجائے گی تو اس کی مہربانی ہوگی اور اس کا شکریہ ادا کروں گا کہ آنٹی چڑیل تمہارا بہت بہت شکریہ جو تم نے اپنی پیاری سی صورت دکھائی۔" میں نے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

میرے قہقہہ لگانے پر وہ بھی ہنسنے لگے تھے۔

راستے میں بڑے بڑے قد آور درخت دور سے دیو محسوس ہو رہے تھے اور ان کی شاخیں لمبے لمبے بالوں کی طرح لگ رہی تھیں لیکن قریب پہنچنے پر وہ دیو درخت نکلتے تھے۔ گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ شاید ان درختوں کو دور سے آسیب سمجھ کر ڈر جاتے ہوں ورنہ اس جدید دور میں جن بھوتوں اور آسیب پر کون یقین کرتا ہے۔

میں نے مشکل سے آدھا سفر ہی طے کیا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ایک چڑیل جس کے لمبے لمبے بال ہیں آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ سرخ سرخ خون لگا ہوا تھا۔ وہ گھنے درختوں سے نکل کر سڑک پر آگئی ہو مجھے بروقت کار کو روکنا پڑا۔

رات کی تاریکی میں چڑیل کو دیکھ کر واقعی میرے حواس جواب دے رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری چیخ نکل جاتی۔ میں نے بڑی مشکل سے چیخ کو روکا تھا۔ خوف و دہشت سے مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ زندگی میں کبھی میرے ساتھ اس قسم کی صورت حال پیش نہیں آئی۔ وہ میری کار کی جانب تیزی سے بڑھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کار کو اسپیڈ دے کر آگے نکل جاؤں۔ میں بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ میری طرف بڑھ رہی تھی پھر چڑیل نے ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول کر میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ بالکل برف کی طرح سرد تھا۔ وہ تقریباً مجھے کھینچتی ہوئی درختوں کے جھنڈ میں لے گئی درختوں کے جھنڈ میں زمین پر ہری ہری گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے ہری ہری گھاس پر گرا دیا اور میرے برابر گھاس پر بیٹھ گئی۔

"کیوں میں کیسی لگ رہی ہوں، میں خوبصورت ہوں نا؟" وہ بولی۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بولوں۔

"بولتے کیوں نہیں بولو! میں ہوں نہ خوبصورت؟" چڑیل نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہا..... ہاں..... ہاں!" میں نے بمشکل کہا۔

"ہاں میں واقعی خوبصورت ہوں، جبھی لوگ میرے جسم سے کھیلنا چاہتے ہیں سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہوس پرست۔" وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "اتنی خوبصورت حسینہ تمہارے سامنے ہے پھر بھی تمہاری آنکھوں میں خوف کے سائے کیوں ہیں.....؟"

ن..... ن..... نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے جھوٹ بولا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہوجائے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ میں اس وقت اتنا خوفزدہ تھا کہ کبھی زندگی میں اتنا خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے موت اپنے سامنے نظر آرہی تھی۔ موت کے خوف سے اچھے اچھے انسانوں کے حوصلے جواب دے جاتے ہیں۔

سناٹے میں اس کی آواز دور، دور تک سنائی دے رہی تھی۔ چڑیل غصے سے گھاس سے اٹھی اور زور، زور سے زمین پر پاؤں مارتی ہوئی دور تک چلی گئی۔ اس سے قبل کہ وہ مجھ تک واپس آتی نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی جھٹ میں کار میں بیٹھ گیا۔ کار کا انجن اسی طرح چل رہا تھا، میں نے کار کو اسپیڈ دے دی۔ اور میں اس کی پہنچ سے بہت دور نکل گیا۔ باقی کا سفر میرا کیسا گزرا کچھ یاد نہیں، میں نے گھر پہنچ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

اس واقعہ کو کئی ہفتے گزر گئے تھے لیکن مجھے سکون کی

نیند نہیں آئی وہ اکثر میرے خواب میں آجاتی تھی اور میں خوفزدہ ہو کر نیند سے بیدار ہوجاتا اسی خوف کے باعث میں بیمار رہنے لگا تھا۔ دن بدن میرے جسم میں کمزوری بڑھ رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ چڑیل رات میں آکر میرے جسم سے خون چوس رہی ہو۔ مجھے کسی پل بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ چڑیل میرے حواس پر چھا گئی تھی ہر لمحہ مجھے ایسا لگتا کہ وہ کہیں سے نمودار ہوگی اور مجھے دبوچ لے گی اور میرے خون کا ایک ایک قطرہ پی جائے گی۔

چڑیل کے خوف سے میں سوکھ کر کانٹا بن کر رہ گیا تھا۔ میری خوراک بھی کم ہو کر رہ گئی تھی جو کھاتا وہ جسم کو نہیں لگ رہا تھا۔ گھر والے مجھے مختلف ڈاکٹرز کے پاس لے کر جا رہے۔ تھے تمام ڈاکٹرز اس بات پر متفق تھے کہ مجھے کوئی بیماری نہیں۔ میں نے اپنے ذہن پر خوف سوار کیا ہوا ہے۔ اسی سبب صحت گر رہی ہے۔ کم خوراک کھانے سے جسم میں خون کم بن رہا ہے۔ اس لئے خون کی کمی جسم میں ہو رہی ہے۔

میرے خوف کو دور کردینے سے خون بھی بننا شروع ہوجائے گا بھوک بھی کھل کر لگنے سے صحت اچھی ہوجائے گی۔ میں نے ڈاکٹرز کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ میری گرتی ہوئی صحت کا راز وہ منحوس چڑیل ہے جو راتوں میں نہ جانے کب خاموشی سے آکر میرا خون پی جاتی ہے لیکن ڈاکٹرز میری اس بات کو کسی صورت بھی ماننے کو تیار نہیں تھے۔

ایک روز میری طبیعت جب زیادہ خراب ہوئی تو مجھے اسپتال میں داخل کرلیا گیا۔ مجھے نیند کی دوائیاں دی جارہی تھیں تاکہ میں سکون کی نیند لے لوں اور میرا علاج بھی ہوتا رہتا۔

ایک رات میں پانی پینے کو بیدار ہوا۔ ابھی میں نے پانی کا آدھا گلاس ہی پیا تھا کہ وہ چڑیل مجھے اسپتال میں نظر آئی۔ وہ اس وقت نرس کے روپ میں میرے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ خوف سے میرے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی اور پانی کا گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ میں چڑیل کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے بے ہوش ہو چکا تھا۔ ہوش آنے پر گھر والے میرے گرد جمع تھے۔ کمرے سے چڑیل غائب ہو چکی تھی۔

"و..... و..... وہ..... چو..... چڑیل..... کہاں گئی۔" میں نے ہوش میں آنے پر پوچھا۔

"چڑیل!!۔ ارے بیٹے یہاں کہاں سے چڑیل آئے گی۔ وہ نرس تھی اور تمہیں انجکشن لگانے آئی تھی۔" امی جانے نے کہا۔

"نن..... نن..... نہیں..... وہ چڑیل تھی..... وہ..... وہ..... یقیناً میرا خون پینے آئی تھی تم لوگوں کو دیکھ کر بھاگ گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے وہ چڑیل نہیں ہے۔ نرس ہے اور ابھی وہ ڈاکٹر کو بلانے گئی ہے۔ تم خود غور سے اسے دیکھ لینا۔" ابا جان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ چڑیل ہے میرا خون پئے گی مجھے کہیں چھپا دو۔" میں نے امی کی آغوش میں چھپنے کی کوشش کی۔

"بیٹے یہ تم چھوٹے بچوں والی حرکت نہ کرو تم ایک نوجوان ہو، خیالی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجاؤ۔ دیکھو تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے پورا گھر پریشان ہے۔" ابا جان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ چڑیل کس دلیری سے نرس کے روپ میں میرا خون پینے اسپتال تک پہنچ گئی تھی گھر والوں کو اس پر ذرا سا بھی شک نہیں ہو سکا تھا کہ وہ چڑیل ہے وہ اسے نرس ہی سمجھ رہے تھے میں نے اس موقع پر زیادہ بولنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ میرے چھوٹے بہن بھائی بھی کمرے میں تھے۔ وہ بھی میری اس حالت پر پریشان تھے مجھے اس وقت بڑی حیرت کا جھٹکا لگا جب چڑیل نرس کے روپ میں ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے کئی بار پلکیں جھپکیں لیکن وہ واقعی چڑیل ہی تھی فرق اتنا تھا کہ اس نے اپنا روپ بدلا ہوا تھا۔

"یہ نرس نہیں چڑیل ہے..... یہ..... یہ میرا خون پینے آئی ہے۔" میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ چڑیل ہے۔" ڈاکٹر طاہر نے مسکراتے

www.pdfbooksfree.pk

ہوئے نرس کی طرف دیکھا۔

نرس کا چہرہ بھی چڑیل کہنے پر فق ہوگیا تھا۔

"مسٹر کامران اپنے آپ کو سنبھالو تم کب تک چڑیل کے خوف میں مبتلا رہو گے اور اب تم نے ہماری نرس مسز شہلا کو بھی چڑیل کا خطاب دے دیا ہے۔" ڈاکٹر طاہر نے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا یہ چڑیل ہے اور نیو سعید آباد سے حیدر آباد آئے ہوئے راستے میں مجھے ملی تھی۔" میں نے کہا۔

"تم نے رات میں سفر کیا ہوگا اور وہیں تمہاری چڑیل سے ملاقات ہوئی تھی وہ تمہیں ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی جنگل کے اندر لے گئی ہوگی۔" نرس شہلا بولی۔

"ہاں، ہاں دیکھ لیں ڈاکٹر صاحب اس نے خود میری بات کی تصدیق کردی یہ واقعی چڑیل ہے جبھی اسے معلوم ہے کہ اس نے میرے ساتھ کیا حرکت کی تھی۔" میں نے کہا۔

میری بات پر اب چونکنے کی باری ڈاکٹر طاہر کی تھی اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"شہلا یہ سب کیا چکر ہے تم کیسے جانتی ہو مسٹر کامران کے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے کہیں تم.....؟"

"ڈاکٹر صاحب یہ درست کہہ رہے ہیں لیکن میں وہ چڑیل نہیں ہوں وہ میری ہم شکل چھوٹی بہن ہے جو لوگوں کو چڑیل کے روپ میں اکثر رات میں نظر آتی ہے۔"

"تمہاری بہن چڑیل ہے یہ سب کیسے ہوا؟" ڈاکٹر طاہر بے یقینی کی کیفیت سے نرس شہلا کو دیکھ رہا تھا۔

"پروین میری چھوٹی بہن تھی وہ ابھی کالج میں زیر تعلیم تھی اس نے جیب خرچ سے بچت کرکے موبائل لے لیا تھا۔ اب ہر وقت اس کے ہاتھ میں موبائل ہوتا اور کسی نہ کسی سے بات یا (SMS) کر رہی ہوتی تھی۔ ابو اکثر اس کو سمجھاتے کہ موبائل کا زیادہ استعمال اچھا نہیں ہے۔ رات آرام اور دن کام کے لئے ہوتا ہے لیکن اس کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ رات میں وہ بظاہر بستر میں سو رہی ہوتی تھی لیکن بستر میں بھی وہ کسی نہ کسی لڑکے سے موبائل پر (SMS) پر بات کر رہی ہوتی تھی میں اس کی راز دار تھی۔ ایک دن میں غصے میں آگئی۔

"پروین یہ سب کیا ہے تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آجاتے ہیں کہ دن رات موبائل پر مصروف رہتی ہو۔"

"ارے باجی تم بھی بہت بھولی ہو۔ وہ تم نے سنا نہیں جب تک بے وقوف زندہ ہیں عقلمند بھوکا نہیں مرسکتا۔ لڑکیوں سے باتیں کرکے خوش ہونے والے اس ملک میں بہت ہیں۔ ذرا سا فری ہوکر جس لڑکے سے بھی بات کرلو وہ خوش ہوجاتا ہے پھر اس سے دن رات جتنا چاہے بیلنس منگواؤ بھیج دیتا ہے۔" پروین نے کہا۔

"کوئی ایک لڑکا اتنا بیلنس نہیں بھیج سکتا جتنا تم دن رات استعمال کرتی ہو۔" میں نے شک بھری نظروں سے پروین کو دیکھا۔

"ہاں۔ ہاں میں نے کب کہا ہے کہ ایک لڑکا اتنا بیلنس بھیجتا ہے۔ مختلف لڑکوں سے بیلنس منگواتی ہوں جبھی تو میرے پاس ایڈوانس میں اتنا بیلنس ہوتا ہے کہ اگر ایک مہینہ موبائل میں بیلنس نہ ڈالا جائے تب بھی فکر کی کوئی بات نہیں ہوتی۔" پروین نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"پروین تم آگ سے کھیل رہی ہو یہ اچھی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا اچھی بات نہیں لڑکوں سے دوستی رکھنا یا ان سے بیلنس منگوانا۔"

"دونوں ہی باتیں اچھی نہیں ہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔

مجھے غصے میں دیکھ کر وہ خاموش ہوگئی۔ میرے غصہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی موبائل بند کردیتی تھی ایک دن میں گھر آئی تو پروین کو بہت خوفزدہ دیکھا۔ اسے پریشان دیکھ کر میں بھی وقتی طور پر پریشان ہوگئی اور اس سے پوچھا۔

"کیا ہوا تم اتنی پریشان کیوں ہو۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہوگئی۔" پروین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"کچھ پتا بھی چلے کیا ہوا تا کہ اس کا تدارک کیا جائے۔" میں نے کہا۔

"وہ باجی مجھے وہ دونوں جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔" پروین نے کہا۔

"وہ کون ہیں ان کے کچھ نام بھی ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"دلاور اور جانو مجھے دھمکی دے رہے ہیں اور دلاور کہتا ہے کہ میں جانو سے بات نہ کروں اور جانو کہتا ہے کہ میں آئندہ دلاور سے بات نہ کروں ورنہ وہ مجھے قتل کردیں گے میں بری طرح پھنس گئی ہوں۔" پروین نے کہا۔

"تم سب سے پہلے یہ کام کرو موبائل سے اپنی سم نکال کر پھینک دو۔" "سم نکال کر پھینک دینے کا کوئی فائدہ نہیں وہ میرے کالج اور گھر کا پتا جانتے ہیں۔ ان کے پاس موبائل کے ذریعے تصویر بھی محفوظ ہے وہ رابطہ نہ رکھنے پر مجھے قتل کردیں گے۔"

"موبائل کے ذریعے ان کے پاس تصویر پہنچی کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"بیلنس مفت منگوانے کے چکر میں تصویر بھیجی تھی پتا نہیں تھا کہ جانو اور دلاور دونوں دوست ہیں۔ راز کھلنے پر ان کی دوستی دشمنی میں تبدیل ہوگئی اور ان دونوں کی یہ خواہش ہے میں صرف ایک سے دوستی رکھوں ورنہ انجام بھیانک ہوگا۔" پروین نے روتے ہوئے تفصیل بتائی۔

"میں تمہیں اسی دن کے لئے منع کرتی تھی لیکن تمہاری سمجھ میں بات نہیں آرہی تھی دیکھ لیا مفت بیلنس منگوانے اور لڑکوں سے دوستی رکھنے کا نتیجہ میری سمجھ میں اس کا حل یہی آرہا ہے کہ تم پہلی فرصت میں سم پھینک دو اور ایک دو ماہ تک گھر سے باہر نہ نکلو، پھر بھی اگر انہوں نے کسی اور ذرائع سے تنگ کرنے کی کوشش کی تو پولیس سے مدد لیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

میری ہدایت پر پروین دو ماہ تک گھر سے بالکل نہیں نکلی۔ جب ہمیں یہ اطمینان ہوگیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے پروین نے گھر سے نکلنا شروع کیا۔ ایک ماہ تک کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوئی۔ ایک دن پروین کالج سے نہیں لوٹی ہمیں بڑی تشویش ہوئی۔ پروین کی سہیلیوں سے بھی معلوم کیا۔ انہوں نے بھی بتایا کہ پروین صبح کالج آئی تھی اور چھٹی ہونے پر کالج سے نکل گئی۔ میرے بھائی نعمان نے تھانے میں پروین کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی اور اپنے ذرائع سے خوب ڈھونڈا لیکن پروین کو نہ ملنا تھا۔ اور نہ ملی۔ دو ماہ گزرنے پر پروین کی تشدد زدہ لاش ہالا سے کچھ فاصلے پر سڑک پر نیم برہنہ حالت میں ملی۔ میڈیکل رپورٹ پر پتا چلا کہ اسے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور اس کے جسم پر جگہ جگہ زخم بھی تھے۔ پروین کو جو دھمکی دی گئی تھی وہ پوری ہوگئی تھی۔ پولیس نے ملزمان تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن ملزمان کا کوئی سراغ نہ مل سکا جن نمبرز سے پروین پر بات کی گئی تھی وہ سم کسی کے نام پر رجسٹرڈ نہیں تھیں اور وہ اب بند ہوگئی تھیں۔ مجھے بھی مختلف لوگوں کی زبانی علم ہوا کہ پروین کی روح چڑیل کی شکل میں گھومتی رہتی ہے۔ اور اکثر رات میں سفر کرنے والوں کو ملتی ہے لیکن وہ کسی مرد کو جان سے نہیں مارتی۔ صرف ڈراتی ہے اور نہ جانے وہ کب تک اس حال میں رہے ممکن ہے اسے اپنے ملزمان کی تلاش ہو اور انہیں ختم کرکے اس کی روح کو چین نصیب ہو۔" یہ کہتے ہوئے نرس شہلا بے اختیار رو پڑی۔

واقعی نرس شہلا کی کہانی بہت دکھ بھری تھی۔ اس کی بہن پروین نے چڑیل کے روپ میں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا صرف ڈرایا تھا۔ شاید اسے یہ سب کرکے خوشی ملتی ہو اور نہ جانے وہ کب تک یہ عمل کرتی رہے۔ پروین کی کہانی سن کر مجھ پر خوف طاری تھا۔ اس میں کمی آگئی تھی پھر میری صحت تیزی سے بہتر ہونے لگی پتا نہیں یہ ڈاکٹرز کی دوائی کا اثر تھا یا خوف کے ختم ہوجانے کا اثر تھا بہرحال میری بیماری جاتی رہی اور میں صحت یاب ہوکر گھر لوٹ آیا۔ میں جب مختلف لڑکیوں کو بسوں میں موبائل پر مصروف دیکھتا ہوں تو بے اختیار پروین یاد آجاتی ہے اور میں دعا کرتا ہوں ان لڑکیوں کا انجام بھی پروین جیسا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ان لڑکیوں کو نیک ہدایت دے (آمین)

www.pdfbooksfree.pk

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:86

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

رمیش ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنے گال پر انگلی پھیرنے لگا تو واضح طور پر اسے محسوس ہوا کہ گال پر پانی کا ایک گرم قطرہ گرا تھا۔ وہ اچنبھے میں پڑ گیا کہ رات کے اس سے، بند کمرہ میں کون آ سکتا ہے اور پھر اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ اس کے سر کے بالوں میں کوئی اپنی نرم و نازک انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اور پھر مالتی کی یادوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بستر پر وہ کروٹیں بدلتا رہا اور پھر اس طرح صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا۔ ایک رات سنیل اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ اچانک ایک خونخوار بلی کی خوفناک آواز سنائی دی اور پھر اس کے بعد بہت سی بلیاں چیخنے لگیں۔ پھر بلیوں نے رات کے اندھیرے میں اس پر حملہ کردیا جس سے وہ بہت زیادہ لہولہان ہوگیا۔ اس کے بعد دوسری رات آئی تو وہ ٹرانس کی حالت میں اٹھا اور ایک تیز دھار چھری لے کر اپنے کمرے سے باہر نکل گیا، اب اس کا رخ برگد کے درخت کی طرف تھا۔ وہ برگد کے درخت کے پاس پہنچ گیا اور اطمینان سے اس جگہ لیٹ گیا اس کے بعد اس نے چھری اپنی گردن پر پھیرنے لگا، اس کی خراخراتی آوازیں نکلیں اور پھر چند سیکنڈ میں ہی وہ ٹھنڈا ہوگیا۔ اس کے چند دن بعد ایک سادھو اس گاؤں میں آیا اور گاؤں والوں سے بولا کہ میں تین بکرے اور ایک گائے لوں گا، اور گاؤں پر مسلط آتما کو نکال باہر کروں گا۔ لوگ راضی ہوگئے اور اسے مندر میں ٹھہرا دیا مگر اسی رات مندر کے سامنے پیپل کے درخت پر سادھو ایک رسی سے لٹکا مردہ پڑا تھا۔ جسے دیکھ کر گاؤں والے دہشت زدہ ہوگئے۔ پھر ایک رات سنیل کا دوست گنیش برگد کے درخت کے پاس موجود تھا اس کی گردن دھڑ سے الگ تھی جسے دیکھ کر گاؤں والے خوفزدہ ہوگئے اور تھر تھر کانپنے لگے گاؤں والے مجبور تھے بے بس تھے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سب کے سب مندر میں پنڈت کے پاس آئے اور پنڈت سے مدد طلب کی تو پنڈت بولا۔ ”میں کالی ماتا کے چرنوں میں بیٹھ کر آج رات اشلوک پڑھوں گا اور کالی ماتا کے حاضر ہونے پر پوچھوں گا کہ گاؤں میں یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ مندر میں لوگ جمع تھے، پنڈت کے اشلوک پڑھنے پر کالی ماتا کی حاضری ہوئی، گاؤں کے سارے لوگ اپنا سر جھکائے بیٹھے تھے کہ ماتا کی گونجدار آواز سنائی دی، آواز سے لگتا تھا کہ ماتا بہت غصے میں ہے، وہ بولی۔ ”گاؤں والو! مجھے معلوم ہے مرنے والے پاپی تھے، انہوں نے بہت بڑا پاپ کیا تھا۔“

(اب آگے پڑھیں)

مندر میں گونجتی ہوئی دیوی کی آواز سن کر گاؤں والے سکتے میں آ گئے اور جیسے ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ کالی ماتا غصے میں تھی اس کا بپھرا ہوا، انداز جو کہ آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ غضبناک حالت میں ہے۔

”گاؤں والو! ان چاروں پاپیوں کا انت ہوگیا، انہوں نے گاؤں بھر کا چین سکھ برباد کر کے رکھ دیا تھا، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ انہوں نے ناریوں کی عزت کو خاک میں ملایا، رات کے اندھیرے میں انہوں نے بہت کچھ کیا۔ مجھے سب کچھ معلوم تھا، میں نے بار بار انہیں موقع دیا کہ وہ ٹھیک ہو جائیں مگر ہر بار وہ آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔

اب اس گاؤں میں اس طرح کوئی نہیں مرے گا، جو سادھو گاؤں میں آیا تھا، وہ بہت بڑا الو بھی تھا، میر

www.pdfbooksfree.pk

ے نام کے آئے ہوئے بکروں پر اس نے ہاتھ صاف کرنا چاہا اور وہ بھی میرے مندر میں بیٹھ کر اس کا بھی انت ہوگیا۔"

اتنے میں ایک کافی ضعیف شخص اٹھا اور اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "ماتا جی! ان چاروں کا دوش کیا تھا، اور ایسا کیا ہوا تھا کہ ان کا انت آپ کے مندر کے پاس برگد کے درخت کے پاس ہوا۔"

"ان کے پاپ کے بارے میں تم لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا، آگے اب کوئی اور سوال نہ کرنا، بس اب خاموش ہو جاؤ اپنے دل میں شک شبہہ نہ لاؤ، بہت جلد اصل حقیقت پر سے پردہ اٹھ جائے گا۔ اب میں چلتی ہوں۔" اور پھر مندر میں خاموشی چھا گئی۔

چند منٹ تک سارے لوگ اپنا سر جھکائے کھڑے تھے پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے اپنے سروں کو اٹھایا اور اچنبھے کی حالت میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کسی میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ایک دوسرے سے کوئی سوال کرسکیں۔ اتنے میں مندر کے پنڈت کی آواز سنائی دی۔

"ماتا کے سیوکھوں! تم لوگوں نے ماتا کی ساری باتیں سن لیں، اور یہ بھی اندازہ لگالیا کہ ماتا کس قدر غصے میں تھی۔ ان چاروں نے بہت بڑا پاپ کیا تھا جو کہ ماتا کے برداشت سے باہر ہوگیا اور اس پاپ کے بارے میں بقول ماتا کے بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ، اور کل سے ماتا کے چرنوں میں زیادہ سے زیادہ دان پن ماتا کے نام پر کرو کہ ماتا ہم تمام گاؤں والوں سے خوش رہے۔" یہ بول کر پنڈت خاموش ہوگیا۔

پنڈت کی باتیں سن کر سارے لوگ خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اپنے اپنے گھروں کو پہنچ کر لوگ سہمے ہوئے تھے، ماتا کی غضبناک آواز نے لوگوں کو مبہوت کر کے رکھ دیا تھا، سب کے ذہنوں میں بس ایک سوال گردش کر رہا تھا کہ مرنے والے ان چاروں نے ایسا کیا پاپ کیا تھا جس سے کالی ماتا ناراض ہوئی، ایسا کیا بڑا پاپ تھا کہ کالی ماتا سے برداشت نہ ہوسکا۔

بہر حال لوگ جس قدر سوچ رہے تھے وہ اس قدر الجھتے جارہے تھے پھر لوگوں نے سوچنا ترک کر دیا اور یہ سوچ کر اپنے من کو شانت کرلیا کہ ماتا نے بول دیا ہے کہ "سمے آنے پر ان سب کا پاپ لوگوں پر ظاہر ہو جائے گا۔"

دوسرے دن سے گاؤں کے لوگوں نے زیادہ سے زیادہ کالی ماتا کے مندر میں آنے لگے اور ماتا کا نام لے کر پرارتھنا کرنے لگے۔ سب کی خواہش تھی کہ ماتا ان سے خوش رہے، سب کی یہ کوشش ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ ماتا کے نام پر دان دیں۔ اور پھر گاؤں والوں نے آپس میں مشورہ کر کے سب نے چندہ کیا اور سات عدد کالے بکرے لائے گئے تاکہ ماتا کے نام کی بھینٹ دیں۔

مندر کے پنڈت کو بتا دیا گیا تو پنڈت نے جواب دیا کہ "پرسوں منگل وار ہے، اور اس کام کے لئے منگل وار ٹھیک رہے گا۔" لہٰذا ایک دن گذار کر منگل کے دن صبح ہی صبح کالی ماتا کے نام پر ساتوں بکروں کی بلی دے دی گئی۔

بکروں کی بلی دینے کے بعد گاؤں والوں نے اپنے آپ میں بہت سکون محسوس کیا، سب کا ذہن ہلکا ہو گیا۔ کیونکہ ماتا نے کہا تھا کہ اب اس طرح اس گاؤں میں کوئی بھی نہیں مرے گا۔" خیال کے تحت سارے لوگ بے فکر اور بے خوف ہو کر اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے۔

چھ راتیں آرام سے گزر گئیں۔ ساتویں رات آ گئی، موسم ٹھیک نہیں تھا۔ دن سے ہی بوندا باندی کا عالم تھا، لہٰذا لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے پڑے تھے۔

ٹھیک رات کے ساڑھے بارہ بجے ایسا لگا کہ پورے گاؤں پر کوئی بہت ہی مہلک بم گرا ہو، دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ لوگوں کے دل ہل کر رہ گئے، گھروں کے در و دیوار جیسے لرز کر رہ گئے۔ سارے لوگ ہڑبڑا کر گہری نیند سے اٹھ بیٹھے۔

"اے بھگوان .....! یہ کیا ہو گیا؟" ایک شخص بولا۔

ڈر اور خوف کی وجہ سے چھوٹے بچے چیخنے لگے، پورے گاؤں میں ہلچل مچ گئی اور پھر اسی پر اکتفا نہیں ہوا۔ دھماکہ ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی بجلی کی گڑ گڑاہٹ سنائی دینے لگی، بجلی کی گڑگڑاہٹ اس قدر زور دار تھی کہ لوگ تھر تھر کانپنے لگے۔

بجلی جب چمکتی تو ایسا لگتا کہ پورا گاؤں روشنی میں نہا گیا۔ وقفے وقفے سے یہ سلسلہ شروع ہوگیا بجلی کا یہ انداز اس سے پہلے لوگوں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا، جب بھی بجلی کی چمک اور گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تو یہی لگتا کہ بجلی پورے گاؤں پر اب گری۔ اور اس طرح پورا گاؤں جل کر خاک ہو جائے گا۔ ہر گھر میں لوگ بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگے تھے۔ ہر گھر میں ایسا ہو گیا تھا کہ گھر کے سارے لوگ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر ایک ہی کمرے میں سہم کر بیٹھ گئے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھی تھیں۔ بڑے لوگ چھوٹوں کو دلاسہ دینے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے کہ اچانک مندر میں سے گھنٹیاں بجنے کا شور سنائی دیا۔

مندر میں موجود ساری گھنٹیاں بہت بلند آواز سے بجنے لگی تھیں۔ ایک طرف بجلی کی گڑگڑاہٹ اور دوسری طرف گھنٹیوں کی آواز، گھنٹیوں کی آواز سن کر لوگ یہ تو جان گئے کہ ہو نہ ہو پورے گاؤں پر کوئی آفت آن پڑی ہے یا پھر کوئی بھٹکی ہوئی روح اور آتما نے اپنا قبضہ جما لیا ہے اور اس وجہ سے کالی ماتا کے مندر سے گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگی ہیں۔

مندر سے گھنٹیوں کی آوازیں ہمیشہ اس لمحے آتی ہیں جب بہت اہم ضرورت سامنے ہو پھر اچانک گاؤں کی مسجد سے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائیں آنے لگیں۔ مسجد سے اذان کی پرزور آواز سنائی، دینے لگی تھی۔ اور پھر یہ اذان کا سلسلہ متواتر سنائی دینے لگا۔ ایک گھنٹہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اچانک بجلی چمکنا بند ہوگئی اور ساتھ ہی بجلی کی گڑگڑاہٹ بھی بند ہوگئی تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔

اور پھر ایک گھنٹہ بعد آذان فجر کی آواز پورے گاؤں میں گونجنے لگی تو لوگوں کے پورے جسم میں اطمینان کی لہر دوڑنے لگی اور لوگ جان گئے کہ اب صبح ہونے والی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی صبح کا سپیدہ ہر طرف پھیلنے لگا۔

ویسے گاؤں میں ریت ہے کہ لوگ منہ اندھیرے ہی اٹھ کر اپنے کام کاج میں لگ جاتے ہیں مگر آج کسی میں بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر اپنے گھر سے باہر نکلے۔ جب مکمل اجالا پورے گاؤں پر پھیل گیا تو لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلے، اکثر گاؤں میں لوگ دودھ دینے والے جانور پالتے ہیں کھیتی باڑی کے لئے بیل بھی رکھتے ہیں اور بیلوں سے کھیت میں ہل جوتتے ہیں۔

پورے گاؤں میں لوگوں نے دیکھا کہ بیس کے قریب جانور اپنی زندگی ہار چکے تھے، یہی نہیں بلکہ گاؤں میں چھ کتے بھی مردہ پڑے تھے۔ یہ دیکھ کر گاؤں والوں پر خوف سوار ہوگیا۔ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ضرور کوئی نہ کوئی آفت رات کے وقت آئی تھی۔ جس کی وجہ سے یہ جانور مر گئے۔ بجلی چمکنے کے ساتھ ساتھ بجلی کی گڑگڑاہٹ، یہ سب اسی آفت کی وجہ سے تھا۔ گاؤں والوں کی عقل کام کرنے سے قاصر تھی۔

ہندو حضرات فوراً مندر میں جا کر پرارتھنا کرنے لگے، مسلمان مسجد میں پہنچ گئے اور پیش امام صاحب سے ملاقات کی۔ پیش امام صاحب نے بتایا کہ۔ "رات میں جو کچھ بھی ہوا۔ وہ یقیناً کسی غیر مرئی آفت کی وجہ سے ہوا، اور ایسا جب ہوتا ہے تو بابلند آواز سے اذان دی جاتی ہے، جس سے پریشانی دور ہو جاتی ہے، اور ہوا بھی یہی۔ بہر حال گھبرانے کی ضرورت نہیں، اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہے، اللہ اپنا فضل کرے گا، رات بارہ بجتے ہی میں اذان دینا شروع کر دوں گا، اور مجھے قوی امید ہے کہ گاؤں پر جو بھی کوئی آفت منڈلا رہی ہے وہ دور ہو جائے گی۔ آپ لوگ نماز پابندی سے ادا کریں۔ اور

www.pdfbooksfree.pk

اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر دعائیں کریں۔ ہم گاؤں والے سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ آپ لوگ تشریف لے جائیں اور اللہ کی رحمت پر نظر رکھیں اور دعاؤں میں مشغول رہیں۔'' یہ سن کر لوگ مسجد سے واپس آ گئے۔

مندر میں بھی لوگ کالی ماتا سے پرارتھنا کر کے واپس آ گئے اور ہر وقت بھگوان بھگوان کرنے لگے۔ رات کے بارہ بجتے ہی مسجد سے اذان کی آوازیں آنے لگی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ ہندو حضرات اپنے مندر میں گھنٹیاں بجانے لگے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح مندر میں گھنٹی بجا کر کالی ماتا سے مدد طلب کرتے ہیں اور کالی ماتا مدد کرتی ہے۔

بہر حال مسلمان اور ہندو دونوں ہی اپنے اپنے طریقے سے دنیا کے خالق و مالک سے مدد طلب کرنے لگے تھے اور اس طرح رات سکون سے گزرنے لگی تھی۔

دو ہفتے بعد ایک رات مندر کے سامنے جو پیپل کا درخت تھا اس پر شور شرابہ ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ کئی بدروحیں یا آتمائیں بین کر رہی ہوں۔ اب یہ ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی۔ مندر کے قریب جتنے بھی گھر تھے اس گھر کے مکین پریشان ہو گئے تھے۔ اور پھر وہ بین کرنے کی آوازیں دور دور تک پھیلنے لگیں۔ صاف سنائی دیتا تھا کہ کئی آتمائیں مل کر پہلے تو سسکتی ہیں اور پھر ان کی سسکیاں بین میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

گاؤں والے اس طرح کے آئے دن آفت اور پریشانیوں سے تنگ آ گئے تھے۔ گاؤں کے لوگ پنڈت کے پاس مندر میں پہنچ گئے۔ پنڈت کو بھی پتہ تھا کہ پیپل کے درخت پر رات کے سمے آتمائیں روتی ہیں اور اودھم مچاتی ہیں۔ کیونکہ پنڈت تو مندر میں ہی رات کے سمے موجود ہوتا تھا۔ پنڈت نے لوگوں سے کہا کہ۔ ''آپ لوگ شانت ہو جائیں۔ آج رات میں، میں ماتا کے نام کا اشلوک پڑھوں گا اور ماتا سے معلوم کروں گا کہ اب یہ نئی مصیبت ہم گاؤں والوں پر کیوں آ گئی ہے۔'' پنڈت کی بات سن کر لوگ واپس آ گئے۔

رات میں پنڈت نے کالی ماتا کے نام کا بھجن گانا شروع کر دیا۔ پنڈت رات بھر بھجن گاتا رہا اور اشلوک پڑھتا رہا مگر ماتا کی حاضری نہ ہوئی۔

صبح کے وقت لوگ مندر میں آئے اور پنڈت کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ لوگوں کو دیکھ کر پنڈت سمجھ گیا کہ لوگ مجھ سے کیا سوال کر رہے ہیں۔ پنڈت بولا۔ ''بھائیو! میں رات پھر اشلوک پڑھتا رہا مگر نہ جانے کیوں ماتا کی حاضری نہیں ہوئی۔ میں خود بھی بہت بیاکل ہوں کہ ماتا حاضر کیوں نہ ہوئی۔ یہ تو ماتا ہی بتا سکتی ہے، ماتا کی مرضی کے آگے کون کیا کر سکتا ہے، آپ لوگ چنتا نہ کریں، میں آج رات بھی ماتا کے چرنوں میں بیٹھ کر اشلوک پڑھوں گا۔ مجھے امید ہے کہ ماتا ضرور جواب دے گی۔''

ایک دن، دو دن، تین اور پھر چوتھی رات بھی مندر میں پنڈت اشلوک پڑھتا رہا کہ رات کے ڈھائی بجے لوگوں نے سنا کہ پیپل کے درخت پر کچھ زیادہ ہی شور ہونے لگا۔ آج رات کربناک چیخیں سنائی دینے لگیں، ایسا لگتا تھا کہ کوئی کسی کی گردن پر چھری پھیر رہا ہو، اور وہ تکلیف کی وجہ سے ڈکرا رہا ہو۔ آواز بالکل واضح تھی، کوئی اذیت سے چیخ رہا تھا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک زوردار دھماکہ لوگوں نے سنا کہ زمین پر کوئی وزن گرا ہو۔ اس آواز کو سن کر لوگ بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئے۔ ڈر اور خوف نے لوگوں کے جسم میں دوران خون تو جیسے منجمد کر کے رکھ دیا۔ اور پھر اس کرب و اذیت میں رات گزر گئی۔

صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا۔ ڈر اور خوف کھاتے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکلے۔ اور تھوڑی دیر میں ہی گاؤں کے سارے لوگ پیپل کے درخت کے قریب جمع تھے۔ لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ لوگوں پر سکتہ طاری تھا، لوگ سہمے ہوئے تھے، کچھ لوگوں پر تو جیسے کپکپی طاری تھی۔ سب کی نگاہیں پیپل کی جڑ پر مرکوز تھیں، کسی میں بھی سکت نہیں تھی کہ کوئی کسی سے کلام کرے۔ کیونکہ وہ منظر ایسا تھا کہ

لوگوں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔

پیپل کے درخت کی جڑ کے قریب ایک بہت بڑی چمگادڑ مردہ پڑی تھی۔ چمگادڑ بہت بڑی تھی، اتنی بڑی چمگادڑ لوگوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا وزن کم از کم پندرہ سیر کے لگ بھگ تھا۔ اس کی لمبی اور موٹی زبان باہر کو نکلی پڑی تھی۔ منہ سے ڈھیر سارا خون نکل کر پاس ہی زمین کو سرخ کر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اوہ! اتنی خوفناک تھیں، جو لوگوں پر خوف طاری کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی بھینس یا بیل کی بڑی آنکھیں ہوں۔ آنکھیں بالکل سرخ تھیں۔ ضعیف سے ضعیف لوگ اس جگہ موجود تھے ان لوگوں کا بھی کہنا تھا کہ اتنی بڑی چمگادڑ کے متعلق تو انہوں نے کبھی سنا تک نہیں اور دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

مسجد کے پیش امام صاحب نے کہا۔ ''بھائیو! آپ لوگ قریب سے ہٹ جائیں اس کا حل یہ ہے کہ اسے جلا دیا جائے، کسی میں ہمت نہیں ہے کہ اس چمگادڑ کو اٹھا کر کہیں اور لے جائے.....'' پیش امام صاحب کی بات سن کر لوگ فوراً قریب سے دور ہٹ گئے۔

پیش امام صاحب اپنے ساتھ ایک چھوٹی بوتل لائے تھے اس میں غالباً پانی تھا۔ انہوں نے بوتل کا ڈھکنا کھولا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پانی پر دم کیا اور پھر اس پانی سے چمگادڑ کے گرد ایک حصار کی صورت میں پانی ڈالا۔ اس سے فارغ ہو کر انہوں نے چمگادڑ پر مٹی کا تیل چھڑک کر ماچس کی تیلی اس پر پھینک دی۔ جلتی تیلی کا چمگادڑ پر گرنا تھا کہ چمگادڑ کے جسم کو شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

شعلے بلند سے بلند تر ہوتے رہے اور پھر اچانک چمگادڑ کے منہ سے ایک کریہہ اذیت ناک دل دہلا دینے والی آواز نکلی جسے سن کر اس جگہ موجود سارے لوگ گھبرا گئے۔ آواز کے نکلنے کے بعد چمگادڑ ساکت ہو گئی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایسا لگا کہ جیسے پوری کی پوری جلی ہوئی چمگادڑ کوزمین نے نگل لیا ہو۔ ایسا ہوتے ہی فوراً شعلے یکسر غائب ہو گئے۔

جب تمام آگ ٹھنڈی ہو گئی تو پیش امام صاحب نے کہا۔ ''یہ چمگادڑ نہیں بلکہ کوئی زبردست بلا تھی، اگر میں اس کے گرد قرآنی آیات سے دم کیا ہوا پانی حصار کی صورت میں چھڑکتا نہیں تو یقیناً یہ آگ اطراف میں پھیل سکتی تھی کیونکہ یہ اپنی جگہ سے اچھل کود کر سکتی تھی اور اس صورت میں اس جگہ موجود آگ سے متاثر ہوتے۔ اللہ نے بہت کرم کیا کہ یہ کمبخت بلا اپنے آخری انجام کو پہنچ کر غائب ہو گئی۔ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھر جا کر آرام کریں۔'' یہ بول کر امام صاحب مسجد کی طرف چلے گئے اور پھر سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ گھروں میں جا کر لوگوں نے سکھ کا سانس لیا اور اپنے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گئے۔

ادھر رمیش اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے ہنسی یکسر غائب ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت مالنی کے خیالات اسے گھیرے میں لئے رہتے تھے۔ وہ گاؤں میں موجود اپنے دوست یار میں بیٹھا رہتا مگر اس کا ذہن ہر وقت مالنی کے خیالوں میں الجھا رہتا۔ دوست یار لاکھ کوشش کرتے کہ اس کا دل بہلتا رہے مگر اندرونی طور پر اس کا دل بجھا بجھا رہتا تھا۔ کھانا پینا بھی اس کا بہت کم ہو کر رہ گیا تھا۔ جب اسے تنہائی ملتی تو وہ خلاؤں میں نہ جانے کیا گھورنے لگتا، نیند تو اس سے ویسے ہی کوسوں دور چلی گئی تھی۔ اس کی نیند اچاٹ ہو کر رہ گئی تھی۔

کئی بار ایسا ہی ہوا تھا کہ جب وہ اپنی حالت سے بے زار ہو جاتا، اسے کسی پل چین نہیں آتا، پھر اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن جاتیں اور پھر اپنے کمرے میں رات کے اندھیرے میں تکیہ میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگتا۔ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ روتے ہوئے وہ چیخ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ گھر میں گھر والے موجود ہوتے تھے۔

روتے روتے ایک وقت آتا کہ وہ بے سدھ ہو کر غنودگی کی حالت میں محو خواب ہو جاتا تو مالنی کی آتما تڑپ اٹھتی اور پھر وہ کمرے میں آ جاتی۔ اپنی مخروطی

www.pdfbooksfree.pk

انگلیاں رمیش کے بالوں میں پھیرنے لگتی، چونکہ رمیش بے سدھ ہوتا، اس میں ہلنے تک کی بھی سکت نہیں ہوتی، اس کی آنکھیں جاگنے کی وجہ سے سوج کر بوجھل ہو چکی ہوتیں اس صورت میں وہ اپنی پلکیں بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ لیکن اس کے محسوسات جاگتے رہتے تھے وہ محسوس کرتا کہ کوئی اپنی نرم و نازک انگلیاں اس کے بالوں میں پھیر رہا ہے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ جب مالنی کی آمد بالکل ہو کر رمیش کے پاس آئی اور اپنی نازک انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرنے لگی اور پھر جذبات سے بے قابو ہو کر اس کے آنسو کا ایک گرم قطرہ رمیش کے گال پر گر پڑا تو اچانک رمیش کی آنکھ کھل گئی اور وہ کمرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا پھر فوراً اٹھ کر اسنے کمرے میں موجود لالٹین جلا دی مگر کمرے میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

اس کے گال پر اب بھی آنسو کا قطرہ موجود تھا۔ اس نے گال پر اپنی انگلی پھیری تو آنسو انگلی میں لگ گیا جسے اس نے واضح طور پر دیکھا۔ اور پھر وہ اچنبھے میں پڑ گیا کہ اس اندھیری رات میں بند کمرے میں کون آیا تھا اور پھر اسے خیال آیا کہ کمرے کی کنڈی تو اندر سے بند ہے بھلا کوئی کمرے میں کیسے آ سکتا ہے؟

وہ سوچتا رہا اور اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ جب درد اس سے ناقابل برداشت ہو گیا تو وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ میلوں دور سے دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔

اتنے میں صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے گھر سے کافی دور کھیتوں کی طرف نکلتا چلا گیا۔ جب وہ سرسوں کے کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ سرسوں کے قد آور بڑے، بڑے پودے اپنے سروں پر پیلے پیلے پھول سجائے ہوا کے دوش پر جھوم رہے ہیں، صبح کا سہانا سماں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے بہت بھلے لگنے لگے تھے۔ وہ کھیت کے درمیان میں کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا، کہ اتنے میں تھوڑی دور اسے ایک نسوانی سایہ نظر آیا جو کہ اس کی طرف اپنی پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ اس نسوانی سایہ کو وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

اس کا تجسس اسے آگے بڑھنے پر مجبور کرنے لگا، لہٰذا وہ کسی انجانی قوت کے تحت اس طرف بڑھنے لگا۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور پھر جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں کہ وہ نسوانی وجود کھڑا تھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ، اب اس جگہ کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی نظروں کو چاروں اور گھمانے لگا اور پھر اس کے منہ سے بے ساختہ آواز نکل پڑی۔ ''اس جگہ کون موجود تھا.....؟ کون تھا؟ کون تھا اس جگہ.....؟'' وہ متواتر جیسے چیختا رہا لیکن اس کا چیخنا بے سود تھا۔ پھر اچانک اس کے دل میں خیال آیا۔ ''یہ میرا وہم تھا۔''

''میرا وہم.....'' وہ اپنے آپ سے بڑبڑایا۔

کہ اچانک تھوڑی دوری پر پھر وہی نسوانی وجود اسے نظر آیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا سفید لباس میں ملبوس تھا، اس کے کھلے بل کھاتے لمبے لمبے سیاہ بال ہوا کے دوش پر لہرانے لگے تھے۔

اب رمیش سے برداشت نہیں ہوا، اور وہ اس وجود کی طرف دوڑنے لگا، جب فاصلہ تھوڑا رہ گیا تو اس نسوانی وجود کی ایک اچٹتی سی جھلک نظر آئی۔ تو وہ پکار اٹھا۔

''مالنی..... مالنی..... میری بات سنو!''

مگر جب وہ اس جگہ پہنچا تو اس جگہ وہ نسوانی وجود موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے حواس سے بے گانہ ہونے لگا کہ اتنے میں پھر وہی وجود تھوڑے فاصلے پر سرسوں کے لہلہاتے ہوئے کھیت میں نظر آیا تو پھر سے وہ بے تحاشہ اس طرف دوڑنے لگا۔ دوڑنے کی اس کی رفتار بہت تیز تھی، وہ اپنی پوری قوت سے اس طرف دوڑ رہا تھا۔ اور پھر دوڑتے دوڑتے اسے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل سرسوں کے کھیت کے کنارے گر کر بے ہوش ہو گیا۔

یہ تو اچھا ہوا کہ وہ سرسوں کے کھیت کے درمیان نہیں گرا تھا، اگر وہ کھیت میں قد آور پودوں میں گرا ہوتا تو کسی کی بھی نظر اس پر نہیں پڑتی اور نہ جانے پھر وہ کب تک بے ہوش کھیت میں پڑا رہتا۔ چونکہ وہ کھیت سے باہر کنارے پر گرا تھا اس لئے اس طرف سے ایک گزرتے ہوئے شخص کی اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ شخص اس کے گاؤں کا تھا لہٰذا اس نے آناً فاناً آ کر اس کے پتا کو خبر کر دی۔

اس خبر کو سننا تھا کہ اس کے پتا، اس کے بھائی اور گاؤں کے مزید کئی لوگ دوڑتے ہوئے اس جگہ پہنچے تو دیکھا کہ رمیش کھیت سے باہر بے ہوش پڑا ہے۔

اسے بے ہوش پڑا دیکھ کر اس کے پتا کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ فوراً ان کے دماغ میں آیا کہ کہیں کسی سانپ نے تو اسے نہیں کاٹ لیا۔ کیونکہ اکثر گاؤں دیہات میں سانپ کھیتوں میں آزادانہ گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں اور خاص طور پر جب سرسوں کی فصل ہوتی ہے اور جب پھول کھلتے ہیں تو سرسوں کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبوں ہوا کو معطر کر دیتی ہے اور پھر اس خوشبو کے زیر اثر سانپ سرسوں کے کھیتوں میں نظر آتے ہیں۔

خیر رمیش کو کندھے پر اٹھا کر وہ لوگ گھر لائے۔ اسے چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ چار لوگ فوراً اس کی چارپائی کے پاس بیٹھ گئے اور تیزی سے اس کے دونوں ہاتھو ں اور دونوں پاؤں کے تلوؤں کو سہلانا شروع کر دیا۔ آدھا گھنٹہ سر توڑ کوشش کے بعد رمیش کو ہوش آ گیا۔ کسمساتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں اور فوراً اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔

اس کے پتا جی نے ایک لمبا سانس کھینچا اور پوچھا۔ ''بیٹا! اس کھیت میں تم کیسے پہنچے، اور ہوا کیا تھا کہ تم بے ہوش ہو گئے؟ یہ بھگوان کی کرپا تھی کہ تم کھیت سے باہر پڑے تھے اور اگر تم کھیت میں پڑے ہوتے تو.....؟'' اور انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اس جگہ موجود اور لوگوں نے بھی تابڑ توڑ کئی سوال کر ڈالے مگر رمیش پر تو جیسے خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اتنے میں گاؤں کہ حکیم صاحب آ گئے، آتے ہی انہوں نے اس کی نبض پر اپنی انگلی رکھ دی۔

تھوڑی دیر کے بعد حکیم صاحب بولے۔ ''بیٹا رمیش! تمہیں کیا ہوا تھا، کیا تمہیں کچھ اچانک نظر آیا تھا، یا تم کسی وجہ سے خوفزدہ ہو گئے تھے؟ بیٹا اندرونی طور پر تم بہت کمزور ہو رہے ہو، تمہارے جسم میں توانائی کی بہت کمی ہو گئی ہے۔ بیٹا! تم جوان ہو، اپنی صحت کا خیال رکھو، صحت اگر زیادہ خراب ہو گئی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ یہ دوا کی چند پڑیا ہیں انہیں وقت پر کھاتے رہنا، ویسے گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔''

''حکیم صاحب کچھ مجھے بھی بتائیں! ویسے یہ تو بالکل حقیقت ہے کہ رمیش بہت کمزور ہو گیا ہے کیا بتاؤں تنہائی کا شکار ہو گیا ہے، ہر وقت اپنے کمرے میں پڑا رہتا ہے اور چھت کو گھورتا رہتا ہے۔ اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اس کی ماں بہت زیادہ غمگین رہنے لگی ہے۔ میں نے تو اسے یہ مشورہ دیا ہے کہ کچھ دنوں کے لئے شہر اپنی موسی کے گھر چلا جائے۔ شہر کی بھیڑ اور گہما گہمی میں دل بہل جائے گا اور ویسے ہی اس کی موسی کے بچے بہت محبت کرنے والے ملنسار اور ہنس مکھ ہیں۔ ان کی اپنی موٹر کار ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ہم رمیش بھیا کو سیر کراتے رہیں گے اس کے علاوہ شہر میں اور بھی بہت سی مصروفیات ہوتی ہیں۔ مگر یہ ہے کہ شہر جانے کا نام نہیں لیتا۔ جوان اولاد کا اس طرح رہنا ماں باپ کے لئے اذیت ہے۔ میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ بھگوان اسے اچھا کر دے چاہے اس کے لئے ہماری جان ہی کیوں نہ لے لے۔'' یہ بولتے ہوئے رمیش کے پتا آبدیدہ ہو گئے تھے۔

''آپ گھبرائیں نہیں، اللہ نے چاہا تو یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں، دوا اسے وقت پر کھلاتے رہیے گا اور ہاں! اس وقت گرم گرم دودھ اسے پلائیں، دودھ پلانے کے ایک گھنٹہ بعد

www.pdfbooksfree.pk

اس کو ہلکی غذا دیجئے گا۔" یہ بول کر حکیم صاحب نے سب سے مصافحہ کیا اور چلے گئے۔

رات آئی۔ کھچڑی کھا کر رمیش اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ چھوٹی بہن نے دوا لا کر دی تو اس نے دوا کھالی۔ اس کے بعد دوبارہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ دبے قدموں رات اپنی منزل کی طرف محوِ سفر رہی مگر نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور چلی گئی تھی۔ آج آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے رات کاٹ دی۔ اور پھر ایک وقت آیا جب بستر اسے بے چین کرنے لگا تو وہ بستر سے اٹھ کر صحن میں آیا اور پھر باہر دروازے کی کنڈی کھول دی۔

"پتر اس وقت کہاں جا رہے ہو؟" پیچھے اسے اس کی ماں کی آواز سنائی دی۔

"ماں جی! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ کمرے میں بہت گھٹن ہے، ذرا ٹھنڈی ہوا میں رہوں گا تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ بولا۔

"پتر اکیلے نہ جاؤ، بھائی کو ساتھ لے لو۔ تمہارے پتا جی بول رہے تھے کہ اسے اکیلا نہیں جانے دینا۔" ماں نے کہا۔

"نہیں ماں جی! میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا، بس تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا آپ آرام کریں، فکر نہ کریں، میں ابھی آیا۔" یہ بول کر رمیش باہر نکل گیا، تو اس کی ماں نے دروازے کی کنڈی لگالی۔

رمیش کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اس کے قدم کسی انجانی قوت کے زیرِ اثر اس طرف اٹھ رہے تھے جدھر سرسوں کے کھیت تھے۔ وہ چلتا رہا..... چلتا رہا اور پھر اس کھیت میں پہنچ گیا جہاں کہ کل اسے ایک نسوانی وجود کا سایہ نظر آیا تھا، اور اس سایہ کو دیکھ کر اسے گمان گزرا تھا کہ وہ سایہ مالنی کا تھا۔"

سرسوں کے کھیت کے بیچ رمیش پہنچ گیا تو اسے جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ اس نے چاروں طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہا ہو کہ اتنے میں اسے اپنے پیچھے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "رمیش۔"

یہ سننا تھا کہ وہ فوراً پیچھے کو پلٹا۔ اور ٹکٹکی باندھے اس طرف گھورنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ اس طرف قدم بڑھانے لگا۔

"رمیش ادھر دیکھو۔" اب کی بار پھر پیچھے سے آواز سنائی دی۔ تو وہ فوراً پیچھے کی طرف پلٹا تو اسے پھر وہی وجود نظر آیا جو کہ کل اسے نظر آیا تھا۔ وہ وجود سفید لباس میں ملبوس تھا، ہوا کے دوش پر اس کے لمبے سیاہ بال لہرا رہے تھے اور وہ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہا تھا۔ یہ دیکھنا تھا کہ رمیش اس طرف کو دوڑ پڑا، جدھر وہ نسوانی وجود جا رہا تھا وہ بہت تیز دوڑا مگر اس جگہ پہنچ کر مایوس ہو گیا کیونکہ اس جگہ اب وہ وجود نہیں تھا۔

"رمیش..... میرے پاس آؤ..... میں بھی تم بن بیاکل ہوں....." جدھر سے آواز آئی تھی اس طرف رمیش تیزی سے پلٹا تو دیکھا کہ وہی وجود اب اس کی طرف منہ کئے کھڑا ہے۔

"مالنی..... مالنی....." یہ بول کر وہ اس طرف دوڑ پڑا، اس نے واضح طور پر پہچان لیا تھا کہ وہ نسوانی وجود کوئی اور نہیں بلکہ مجسم مالنی تھی۔ اس کی چاہت..... اس کی محبت..... حقیقت میں مالنی تھی۔

رمیش سے اس طرف دوڑ پڑا۔ جدھر مالنی کھڑی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ مگر پھر وہ بھی بڑی تیزی سے آگے کو دوڑنے لگی۔ وہ بھی بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ اس کے پیچھے رمیش اپنی پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا۔

اب مالنی کھیتوں سے نکل کر سڑک کی طرف دوڑ رہی تھی۔ صبح کا اجالا ابھی بالکل واضح طور پر ہر سو نہیں ہوا تھا۔ مالنی کا سایہ اس طرف تیزی سے دوڑ رہا تھا جس طرف پرانا کالی ماتا کا مندر تھا اور مندر کے قریب برگد کا درخت موجود تھا۔ مالنی وقفے وقفے سے پیچھے مڑ مڑ کر رمیش کو دیکھ بھی لیتی تھی۔

رمیش اپنے اردگرد سے بے نیاز اندھا دھند

سرپٹ دوڑ رہا تھا کہ پھر اچانک سڑک پر اسے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں گاؤں کے لوگ اپنے کام کاج کے لئے اس طرف سے گزرنے لگے تو انہوں نے سڑک پر رمیش کو بے ہوش پڑا پایا۔ اور پھر یہ خبر آناً فاناً پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ کل رمیش سرسوں کے کھیت کے باہر بے ہوش پڑا تھا اور آج چوڑی سڑک پر بے ہوش پڑا ملا ہے۔

گاؤں والے اسے دیکھنے کے لئے گھر میں جمع ہو گئے۔ آج بھی اس کو اس کے پتا اور گاؤں کے چند لوگ اٹھا کر لائے تھے۔ فوراً حکیم صاحب کو بلایا گیا۔ حکیم صاحب نے دوا دی اور چلے گئے، حکیم صاحب کا کہنا تھا کہ اس پر "کڑی نظر رکھی جائے۔"

جتنے منہ اتنی باتیں جتنے لوگ آتے گئے سب نے کوئی نہ کوئی سوال کیا۔ مگر رمیش تو ایسا ہو گیا تھا کہ جیسے وہ کسی کی بات سن ہی نہ رہا ہو۔ یا پھر سوال کرنے والے کسی اور بھاشا میں سوال کر رہے تھے۔ اس نے کسی کے بھی سوال کا کوئی بھی جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ اپنے پتا اور ماں کے سوال کا بھی اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

دودھ دیا گیا اس نے دودھ پی لیا۔ اس کے بعد دوا کھائی اور بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ آخر تھک ہار کر اس جگہ موجود لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اس کے پتا اور گھر والوں نے بھی اس سے سوال کرنا بند کر دیا۔

رات آئی اور کھانے کے بعد اسے گرم دودھ میں دوا کی ایک پڑیا ڈال کر دودھ اسے پلایا گیا۔ حکیم صاحب نے نیند کی دوا اسے دی تھی کہ اسے گرم دودھ میں ڈال کر پلا دیں۔ دودھ کے پیتے ہی چند منٹ میں رمیش نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔ اور پھر رات گزر گئی۔ صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا۔ گھر والے صبح ہی صبح اٹھ گئے۔ ابھی تک رمیش اپنے بستر پر محوِ خواب تھا۔ حکیم صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے نیند سے نہ اٹھایا جائے جب یہ خود نیند سے جاگے تو پھر اسے ناشتہ دیا جائے۔

رمیش سوتا رہا اور پھر دن کے ساڑھے آٹھ بجے اس کی آنکھ کھلی، اس نے کسمسا کر ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ اس کی نگاہوں میں جیسے اجنبیت تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آج اپنے گھر والوں کو پہچان نہیں رہا ہے۔ اسے جاگتا دیکھ کر اس کی ماں فوراً اس کے قریب آئی اور اس کے ماتھے پر اپنا ممتا بھرا ہاتھ پھیرا۔ "پتر طبیعت کیسی ہے اٹھا جاؤ۔ نہا دھو لو، میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔"

یہ بول کر رمیش کی ماں رسوئی میں چلی گئی۔ اور رمیش کے لئے ناشتہ تیار کرنے لگی۔ اس طرح آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر رمیش اپنے بستر سے نہیں اٹھا۔ یہ سوچ کر رمیش اب نہا دھو کر تیار ہو گیا ہو گا اس کی ماں جب اس کے کمرے میں آ کر اس کو دیکھا تو رمیش جوں کا توں ابھی تک بستر پر ہی پڑا تھا۔ رمیش کو دیکھ کر ماں کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ آج سے پہلے کبھی بھی رمیش نے اپنی ماں کی بات سنی ان سنی نہیں کی تھی۔

"پتر کیا بات ہے، تم ابھی تک اٹھے نہیں، میں نے تو تمہارے لئے ناشتہ تیار بھی کر لیا۔" رمیش کی ماں بولی۔ ماں کی بات سن کر رمیش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "رمیش پتر کیا ہوا؟ تم اس طرح کیوں پڑے ہو؟ ارے جلدی سے اٹھ جاؤ..... چلو فوراً اٹھو!" رمیش کی ماں دوبارہ بولی۔

مگر اس مرتبہ بھی رمیش ماں کی بات سن کر ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ بے سدھ پڑا رہا۔ یہ دیکھ کر ماں نے ذرا زور سے کہا۔ "پتر کیا بات ہے میں بولے جا رہی ہوں اور تم....." اور رمیش کی ماں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ کیونکہ اس مرتبہ رمیش کی ماں کا کلیجہ دہل کر رہ گیا تھا۔ "اے بھگوان یہ کیا..... پتر تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا..... ارے یہ تو بہت سرخ ہو رہی ہیں۔" رمیش کی ماں گھبراہٹ بھرے الفاظ میں بولی۔ رمیش کو دیکھ کر ماں کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔

وہ فوراً رمیش کے کمرے سے نکل کر اپنے پتی کے کمرے میں گئی اور بولی۔ "آپ چل کر تو دیکھیں نہ جانے رمیش کو کیا ہو گیا ہے؟ میں آواز پر آواز دیتی رہی

www.pdfbooksfree.pk

مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں ناشتہ بھی تیار کر چکی مگر وہ اپنی جگہ بے سدھ پڑا ہوا ہے، وہ اس کی آنکھیں تو دیکھ میں ڈر گئی اس کی آنکھیں ایسی ہو رہی ہیں جیسے آنکھوں میں خون بھر گیا ہو، آپ جلدی چلیں۔"

پتنی کی بات سن کر رمیش کے بابو جی فوراً اٹھ کر رمیش کے کمرے میں آئے اور آواز دی۔ "رمیش پتر چل اٹھ..... کتنی دیر سے تیری ماں آواز دے رہی ہے..... کیا ہوا..... چل اٹھ....." اور انہوں نے رمیش کا ہاتھ پکڑا اٹھانے کے لئے تو ان کے ہاتھوں کو ایک عجیب سا جھٹکا لگا اور انہوں نے فوراً رمیش کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگے۔

تشویش کی لہر ان کے پورے جسم میں سرایت کر گئی۔ کیونکہ ان کے ہاتھ کو جھٹکا ایسا لگا تھا کہ جیسے رمیش کا جسم نہ ہو بلکہ انہوں نے بجلی کے ننگے تار کو پکڑ لیا ہو۔ وہ ابھی تک اپنے ہاتھ کو سہلا رہے تھے۔ ان کے دماغ میں یہ بات آ کے نہیں دے رہی تھی کہ ایسا ہوا تو کیوں ہوا؟

انہوں نے ذرا زور سے آواز دی۔ "رمیش پتر..... کیا بات ہے؟"

اب جو رمیش نے اپنی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تو خوف کی ایک جھرجھری انہوں نے اپنے جسم میں محسوس کی کیونکہ رمیش کی آنکھوں میں اجنبیت تھی اور ساتھ ہی ایسا لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں نہ ہوں بلکہ خون بھر دیا گیا ہو اس کی آنکھوں میں۔ رمیش نے گھور کر انہیں دیکھا تو وہ سہم کر رہ گئے۔ وہ فوراً رمیش کے کمرے سے باہر نکل گئے اور بولے۔ "رمیش کی ماں باہر آؤ۔"

جب رمیش کی ماں باہر آ گئی تو وہ بولے۔ "رمیش کی ماں مجھے تو لگتا ہے رمیش کسی ہوائی چیز کے چکر میں آ گیا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو مجھے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہے۔ تم ابھی اس کے کمرے میں نہ جاؤ اور اس بات کا ذکر بچوں سے بھی نہ کرو، میں نے اس کی آنکھیں بھی دیکھی ہیں اور تم نے بھی..... مجھے تو شک بلکہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ کسی ہوائی چیز کے چکر میں آ گیا ہے۔ میں مندر جا رہا ہوں پنڈت جی کے پاس اور انہیں لے کر فوراً آتا ہوں۔"

یہ بول کر رمیش کے پتا بھاگتے ہوئے مندر پہنچ گئے، وہ بہت بدحواس ہو رہے تھے ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔ مندر میں پنڈت کا سامنا ہوتے ہی وہ بولے۔ "پنڈت جی ذرا تر نت میرے گھر چلیں، نہ جانے رمیش کو کیا ہو گیا ہے، رمیش کی آنکھیں دیکھ کر بہت ڈر لگ رہا ہے۔ وہ بے سدھ پڑا ہے کسی سے کوئی بات بھی نہیں کر رہا ہے۔ پنڈت جی آپ میرے ساتھ تر نت چلیں۔"

پنڈت ان کی بات سن کر گھبرا گیا۔ وہ فوراً اٹھا اور اپنے چیلے کو حکم دیا کہ اپنی جگہ بیٹھے رہنا، "میں فوراً آتا ہوں....." رمیش کے پتا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پنڈت ٹال دیتا مگر پنڈت رمیش کے پتا کی بات نہیں ٹال سکتا تھا کیونکہ گاؤں میں وہ کھاتے پیتے آدمی تھے دھن دولت اور کافی زمینیں بھی تھیں اور مندر میں وہ دان دکھشنا سب سے بڑھ کر دیا کرتے تھے اور یہی نہیں بلکہ الگ سے پنڈت کو بھی رقم دیا کرتے تھے۔

چند منٹ میں یہ دونوں گھر پہنچ گئے۔ کمرے میں رمیش بے سدھ پڑا تھا۔ کمرے میں آتے ہی پنڈت نے آواز لگائی۔ "رمیش پتر کیا بات ہے، چل جلدی سے اٹھ جا.....؟ چل آنکھیں کھول دیکھ کون آیا ہے....." یہ بول کر پنڈت نے بھرپور طریقے سے رمیش کا ہاتھ پکڑا۔

رمیش کا ہاتھ پکڑنا تھا کہ پنڈت کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور پنڈت دیوار سے جا ٹکرایا۔ پنڈت کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ پنڈت سہم کر رہ گیا تھا۔ اس پر جیسے کپکپی طاری ہو گئی تھی۔

پنڈت کو گرتا دیکھ کر رمیش کے پتا دوڑ کر پنڈت کے پاس پہنچے اور پنڈت کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ دونوں کے حالت میں تھے۔ پنڈت کی تو گھگھی بندھ گئی تھی۔

"اس پر کوئی زبردست آتما سوار ہو گئی ہے۔" پنڈت کے منہ سے نکلا۔ "یہ میرے بس سے باہر ہے۔"

"پنڈت جی اچانک یہ سب کیسے ہو گیا۔ رات تک تو یہ ٹھیک تھا۔" رمیش کے پتا نے کہا۔

پنڈت حیران و پریشان ایک طرف سہما ہوا کھڑا تھا۔ اور ٹکر ٹکر رمیش کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بہت شرمندہ تھا اس لئے کہ اگر گاؤں والوں کو معلوم ہو گیا کہ پنڈت کے ساتھ ایسا سلوک ہوا کہ آتما نے پنڈت کو حیران کر دیا اور ساتھ ہی پنڈت کو اٹھا کر دیوار سے دے مارا تو، پنڈت کی بہت جگ ہنسائی تھی۔ پنڈت کے دماغ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

اگر رمیش پر کوئی آتما سوار ہو گئی ہے تو اس آتما کو وہ کیسے چلتا کرے، اور اگر پنڈت اس آتما پر قابو پا لیتا تو پنڈت کی واہ واہ ہو جاتی۔

"پنڈت جی اب اس کا اپائے کیا ہے؟" رمیش کے پتا نے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، میں اس کا کوئی اپائے ضرور کروں گا۔" پنڈت نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

یہ بول کر پنڈت لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے نکلتا چلا گیا۔ رمیش کے پتا کی حالت بہت غیر تھی۔ وہ ایک طرف کھڑے بھرپور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اب ان کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ انہوں نے اپنی دونوں آنکھیں بھینچ لیں تو آنسوؤں کے دو قطرے ان کی آنکھ سے نکل کر زمین پر گر پڑے۔ اتنی دیر میں رمیش سوتے سے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

جب وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھا تو اس کی ماں اس کے قریب آئی اور بولی۔ "رمیش پتر ناشتہ لاؤں۔" یہ سن کر اس نے سر کا اشارہ کیا، اس کے معنی یہ تھے کہ ناشتہ لے آؤ۔ ہاں کا اشارہ ملتے ہی اس کی ماں دوڑی ہوئی گئی اور فوراً ناشتہ لے آئی۔ رمیش ناشتہ کرنے لگا۔

رمیش کو ناشتہ کرتا دیکھ کر اس کے پتا اچنبھے میں پڑ گئے، کیونکہ تھوڑی دیر پہلے جو اس کی حالت تھی وہ ناقابل بیان تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑتے ہی جو انہیں کرنٹ کا جھٹکا سا لگا تھا، اور اس پنڈت کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ پنڈت کو تو جھٹکا اتنا شدید لگا تھا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ خیر انہوں نے کچھ بولا نہیں اور کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر بیٹھ گئے۔

ان کی سوچوں میں طوفان برپا تھا۔ کسی صورت بھی انہیں یقین آ کے نہیں دے رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے جو رمیش کی حالت تھی وہ ناقابل یقین تھی۔ اور اب وہ بالکل نارمل حالت میں بیٹھا ہوا ناشتہ کر رہا تھا۔ اس کی ماں قریب بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی اور وہ ناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے برتن سامنے کو سرکا دیئے اور انگلی کے اشارے سے بولا۔ "اب لے جاؤ۔"

اس کی ماں اٹھی اور برتن اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ ماں کے جانے کے بعد وہ آرام سے اٹھا، چپل پہنی اور منہ ہاتھ دھو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اب اس کا رخ سرسوں کے کھیتوں کی طرف تھا۔ اس کو باہر نکلتا دیکھ کر اس کے پتا فوراً اپنے کمرے سے نکلے اور کافی فاصلہ اس سے رکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ وہ تیزی سے چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ سرسوں کے کھیت میں پہنچ گیا، اور کھیت میں چاروں طرف اس انداز سے دیکھنے لگا کہ جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ اس کی زوردار آواز ابھری۔ "مالنی..... مالنی..... میں آ گیا ہوں۔ مالنی میں آ گیا ہوں....." اس طرح کی آوازیں وہ متواتر نکالنے لگا تھا۔

"مالنی..... مالنی" کی آوازیں سن کر اس کے پتا چونک پڑے۔ وہ دوسرے کھیت میں چھپے ہوئے تھے۔ "یہ مالنی..... مالنی کی آوازیں لگا رہا ہے آخر کیوں؟" وہ یہ سوچنے لگے۔

رمیش متواتر کھیت میں کھڑا چاروں طرف گھوم گھوم کر "مالنی..... مالنی" کی ہی آوازیں لگا رہا تھا کہ پھر اچانک وہی سایہ تھوڑی دوری پر نظر آیا جو کہ اسے اکثر نظر آتا تھا..... سائے پر نظر پڑتے ہی وہ اسی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ "مالنی..... مالنی..... میں آ رہا ہوں..... مالنی رکو..... مالنی رکو....." اس کی اس آواز کو سن کر اس کے پتا اپنی جگہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور پھر ان کی نظروں نے بھی وہ منظر دیکھا تھوڑی دوری پر ایک لڑکی بڑی تیزی سے آگے کو دوڑ رہی تھی۔ وہ دوڑ رہی تھی بلکہ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہوا پر تیر رہی ہو۔ اور رمیش اس کے تعاقب میں

www.pdfbooksfree.pk

سرپٹ اس طرف دوڑتا جارہا تھا۔ یہ دیکھ کر رمیش کے پتا بھی اس کے پیچھے تھوڑا فاصلہ رکھ کر دوڑ پڑے۔ رمیش آواز پر آوازیں دیتا جارہا تھا۔ ''مالنی..... مالنی..... رکو..... مالنی مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔''

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بھاگتے بھاگتے رمیش کو ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے پتا فوراً اس کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ان کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ بے ہوش رمیش کو اپنے کندھے پر اٹھا کر لے جاتے۔ پہلے تو انہوں نے رمیش کو خوب ہلایا جلایا اور پھر زور سے جھنجھوڑ ڈالا تاکہ وہ ہوش میں آجائے مگر جب ان کی کوشش دم توڑ گئی تو وہ کھڑے ہو کر اردگرد دیکھنے لگے کہ شاید اس طرف سے کوئی گزر رہا ہو تو اسے آواز دیں۔ خیر چند منٹ بعد ہی ایک آدمی کو دیکھ کر انہوں نے آواز لگائی۔ ''جگدیش..... جگدیش.....'' اس شخص کا نام جگدیش تھا۔ اپنا نام سن کر وہ اس طرف دوڑتا ہوا آیا۔ اور جب قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ رمیش زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔

''جگدیش..... آج یہ پھر بے ہوش ہو گیا ہے۔ تم میری مدد کرو۔ اسے گھر لے چلتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔ جگدیش ہاتھ پاؤں کا بہت مضبوط تھا۔ اور جوان کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اس نے رمیش کو فوراً اپنے کندھے پر اٹھایا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ گاؤں میں قدم رکھتے ہی ایک کہرام مچ گیا۔ رمیش کو اس حالت میں دیکھ کر لوگ گھبرا گئے۔ کئی لوگوں نے کہا۔ ''نہ جانے بیچارے کو کیا ہو گیا ہے؟ اچھا بھلا تھا، نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ بھگوان اس پر اپنی کرپا کر۔''

گھر میں لے جا کر جگدیش نے رمیش کو چارپائی پر لٹا دیا۔

رمیش کو دیکھ کر اس کی بہنیں اور ماں رونے لگیں۔

''شانت رہو، رونے سے کیا فائدہ۔'' رمیش کے پتا جی بولے۔

خیر لوگوں کا اس کے گھر تانتا بندھ گیا۔ ویسے بھی گاؤں دیہات کے لوگ بہت محبت کرنے والے اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ اور اس کے بہ نسبت شہر میں لوگ زیادہ پتھر دل، کٹھور، اور اپنے کام کاج میں مصروف رہنے والے ہوتے ہیں۔ شہری لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں بہت کم ہی شریک ہوتے ہیں۔ اور جو زیادہ پوش علاقے میں رہتے ہیں، ان کو تو اپنے پڑوسیوں سے بھی شناسائی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھار ہی کسی خاص موقع پر ایک دوسرے سے علیک سلیک کرتے ہیں۔

بہرحال حکیم صاحب کو بلایا گیا۔ حکیم صاحب نے آتے ہی اسے دوا دی اور فرمایا۔ ''جناب آپ لوگ اس پر کڑی نظر رکھا کریں۔ اور میں نے جو دوا دی ہے رات میں دودھ کے ساتھ ضرور دیا کریں۔ وہ نیند کی دوا ہے لہٰذا نہ یہ صبح سویرے اٹھے گا اور نہ ہی کھیتوں کا رخ کرے گا۔ رات میں دوا دینا بالکل نہ بھولنا۔ آپ لوگوں کو کم از کم ایک ہفتہ پابندی سے دوا دینی ہے۔'' یہ بول کر حکیم صاحب چلے گئے۔

رمیش کو کسی نے بھی اٹھانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ حکیم صاحب نے کہا تھا کہ ''اسے اس حالت میں رہنے دیں۔ یہ مکمل بے ہوش نہیں ہے بلکہ یہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا ہے۔ مگر اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ بے ہوش ہے۔ میں نے دوا پانی میں گھول کر اس کے منہ میں انڈیل دی ہے۔ اس پر بے ہوشی کا غلبہ قطعی نہیں ہے۔''

چار گھنٹے تک رمیش اسی حالت میں پڑا رہا۔ ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جارہی تھی۔ جوان اولاد کا غم بہت زیادہ ہوتا ہے اور ماں کا غم ایک ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔

رمیش کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہو رہی تھی۔ وہ چارپائی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف اور صرف اپنی ماں کی بات پر وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا اور ماں اس کے سامنے کھانا رکھ دیتی تو وہ خاموشی سے کھانا کھاتا اور پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتا۔ ہر وقت اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی اور خون کی طرح سرخ نظر آتی تھیں۔ اکثر رات شروع ہونے سے پہلے اور پھر کبھی کبھی رات میں بھی مالنی کا نام لے کر فلک شگاف آواز لگاتا۔

دن میں اکثر سوتے سوتے غنودگی کی حالت میں بولتا۔ ''مالنی مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو..... مالنی مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ..... مالنی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہ لے گئی تو میں اپنا جیون تیاگ دوں گا۔ مالنی ٹھہرو..... میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' اور پھر اس طرح کی دیگر باتیں بھی وہ نیند کی حالت میں کرتا رہتا تھا۔

ایک دو بلکہ بے شمار سادھو، پنڈت، جوگی، اوجھا اور دیگر لوگوں کو رمیش کی حالت کے پیش نظر بلایا گیا، آنے والوں نے پیسے اینٹھے اور چلتے بنے۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ اس پر کوئی زبردست آتما سوار ہو گئی ہے۔ یہ مکمل طور پر اس آتما کے چکر میں آ گیا ہے۔ اگر جلد از جلد اسے اس آتما سے چھٹکارا نہ دلایا گیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ آتما اسے اپنے ساتھ لے جائے۔

بتانے والے اس طرح کی باتیں بتا تو دیتے تھے مگر کسی میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اس آتما سے رمیش کی جان چھڑا دے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ رمیش کا ہاتھ پکڑ پاتا یا پھر اس کے جسم کے کسی حصے کو اپنے ہاتھ سے چھو سکتا کیونکہ جو بھی ایسا کرتا تو اسے بجلی کا ایسا جھٹکا لگتا کہ وہ دور جا گرتا اور گھنٹوں اپنے ہاتھ کو سہلاتا رہتا تھا۔ آنے والے جھاڑ پھونک کرنے والے دور، دور سے اپنی باتیں کرتے، پھونک مارتے اور تھک ہار کر چلے جاتے۔

دن بدن رمیش کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر اس کے گھر والے خون کے آنسو روتے تھے۔ اس پر کسی قسم کی دوا اثر کرتی نہیں تھی کیونکہ اس کی بیماری جسمانی نہیں بلکہ ہوائی چیز کی تھی۔ وہ ہوائی چیز تھی ہی اس قدر طاقتور کہ اب تک کسی کے قابو میں آ کے نہیں دے رہی تھی۔ اس آتما کا اصل مقصد ابھی تک کھل کر سامنے نہیں آیا تھا کہ وہ آتما آخر چاہتی کیا ہے۔ وہ آتما رمیش کے ساتھ لگی کیوں؟

ابھی تک اس آتما نے کھل کر اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اور جب تک اس طرح کی کوئی آتما کھل کر اپنی خواہش کا اظہار نہیں کرتی اس وقت تک لوگوں کو سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے کہ وہ آتما ہے کون؟ وہ کہاں سے پیچھے لگی ہے؟ اس کی مرضی کیا ہے؟ جب کوئی آتما کھل کر سامنے آجاتی ہے تو اس کے حساب سے کوئی عامل اپنا پروگرام مرتب کرتا ہے اور اس حساب سے وہ اس آتما کا علاج کرتا ہے۔

رمیش کی گرتی ہوئی صحت سے پتا چلتا تھا کہ رمیش اب بہت دنوں کا مہمان نہیں رہا۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ اور حکیم صاحب کے بقول اس کی صحت بہت تیزی سے خراب ہو رہی تھی۔

ایک دن حکیم صاحب نے رمیش کی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر پریشان ہو کر کہا رمیش کے والد سے۔ ''دلی میں ایک مطب ہے جو کہ حکیم وقار کے مطب سے مشہور ہے۔ اس مطب میں ایک حکیم بنام حکیم کامل کے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ بہت بڑے بڑے مسئلے انہوں نے اللہ کے فضل سے ٹھیک کیے ہیں۔ میں نے ابھی تک اپنی زندگی میں ان جیسا کامل کسی اور کو نہیں دیکھا اور نہیں سنا۔ آپ اگر میری بات مان کر ان سے ملاقات کر لیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کر دیں گے، بہت ہی خدا ترس اور ہمدرد انسان ہیں۔ جو بھی آیا یا جس کے پاس بھی وہ گئے سب نے دل سے اپنی دعائیں دیں۔

دلی یہاں سے کوئی زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اگر گھوڑا گاڑی پر جایا جائے تو پانچ چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ میری بات مان لیں، اب وقت ضائع نہ کریں کیونکہ رمیش کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔ میں اس معاملے میں آپ کو جھوٹی تسلی اب نہیں دینا چاہتا۔ میری نظر میں کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ یہ یقینی روحانی علاج ہے۔ اور اس کا مکمل حل اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب کوئی پہنچا ہوا عامل کامل مل جائے۔ ایک مسئلہ میری نظروں کے سامنے کا ہے۔ یہ بہت پرانی بات ہے اس وقت میں حکیم وقار کے پاس ان کے مطب میں زیر تربیت تھا۔ جوانی کا دور تھا۔ شروع سے دوا علاج کا میرا یہ شوق رہا ہے۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ بہت ہی

www.pdfbooksfree.pk

پریشانی کی حالت میں آئے، اور انتظارہ گاہ میں مریضوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ جب ان کا نمبر آیا تو وہ بھی حکیم وقار کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ ان دنوں میں حکیم وقار کے برابر میں بیٹھتا تھا۔ میں مریض کے نام کی پرچی پر حکیم وقار کے فرمانے پر دواؤں کا نام لکھتا تھا۔

وہ بزرگ سامنے بیٹھتے ہوئے زار وقطار رونے لگے اور ان کی ہچکی بندھ گئی۔ حکیم وقار نے مجھ سے فرمایا کہ ”گلاس میں ٹھنڈا پانی لا کر انہیں پلاؤں۔“ میں فوراً اٹھا اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی لا کر انہیں پلایا۔ تھوڑی دیر میں ان کی حالت قدرے بہتر ہوگئی۔ تو حکیم وقار نے فرمایا! ”محترم آپ پریشان نہ ہوں، آپ اپنا مقصد بیان کریں اللہ کے فضل وکرم سے آپ کی پریشانی ہم دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کے لئے دوا پیدا کردی ہے۔ آپ اپنا مدعا بیان کریں۔“

یہ سن کر بزرگ نے فرمایا۔ ”جناب! میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ میری اور میرے گھر والوں کی زندگی عذاب میں گرفتار ہوگئی ہے، ہماری رات کی نیندیں اور دن کا سکون تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ حالات کے پیش نظر میں در در مارا مارا پھر رہا ہوں۔ جس نے بھی جہاں بتایا میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا گیا۔ جس نے بھی جتنا مانگا میں نے اس کی خدمت میں پیش کردیا۔ اب تو میں پائی پائی کا محتاج ہو کر رہ گیا ہوں۔ اب تو عزت داؤ پر لگ گئی ہے۔ حکیم صاحب آپ مجھے اللہ کے واسطے بچالیں۔ میں بہت امید وآس لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ بہتوں سے میں نے آپ کی شہرت سن رکھی ہے۔ ہر کسی کا کہنا ہے کہ آپ بڑے سے بڑا مسئلہ حل کردیتے ہیں۔

حکیم صاحب میری بچی پر کوئی جن عاشق ہوگیا ہے۔ نجانے کس طرح اس نے میری بچی کا پیچھا پکڑ لیا۔ میری جوان بچی اس کے نرغے میں آ گئی ہے۔ چھوٹے موٹے جھاڑ پھونک کرنے والوں کو تو وہ اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ بڑے سے بڑے عامل اپنا دامن بچا کر جاچکے ہیں۔

میری بچی اپنی خالہ کے بیٹے سے بچپن سے منگی ہوئی ہے۔ اگر انہوں نے سنا تو اور بھی بدنامی ہوگی، خالہ چونکہ بہت دور رہتی ہیں اس لئے انہیں اس بات کی خبر نہیں..... یہ مسئلہ کوئی دو ماہ سے ہوا ہے۔ ایک دن بچی آموں کے باغ میں چلی گئی تھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ۔ جب وہ واپس آئی تو اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔

اس جن کا کہنا ہے کہ ”اگر مجھے زیادہ چھیڑا گیا تو یہ لڑکی اپنی جان سے چلی جائے گی اور اس کی روح کو میں اپنے قبضہ میں کرلوں گا یا پھر کسی رات اسے لے کر اپنی دنیا میں چلا جاؤں گا۔ لہٰذا مجھے چھیڑا نہ جائے میں کسی صورت بھی اس لڑکی سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ اور اگر تم سارے گھر والے اپنی خیریت چاہتے ہو تو اپنا منہ بند کر کے بیٹھ جاؤ ورنہ.....“

”محترم آپ گھبرائیں نہیں۔ میرا نام حکیم وقار ہے، میں جسمانی بیماریوں کا علاج کرتا ہوں، اور میرے بھائی حکیم کامل ہیں جو کہ روحانی علاج کرتے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں، میں انہیں بلا لیتا ہوں، وہ اس وقت اپنے کمرے میں کسی کام میں مصروف ہیں۔ آپ ان سے مل لیں۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد آپ اس مسئلے سے چھٹکارا پالیں گے۔“

وہ بزرگ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اور چند منٹ ہی گزرے تھے کہ حکیم کامل کمرے میں داخل ہوئے۔ سب سے انہوں نے مصافحہ کیا اور حکیم وقار کے قریب بیٹھ گئے تو حکیم وقار نے ساری روداد بزرگ کی کہی ہوئی حکیم کامل کے گوش گزار کردی۔

بزرگ کی پریشانی سن کر حکیم کامل بہت افسردہ ہوئے، بزرگ کو تسلی دی اور بولے۔ ”آپ میرے کمرے میں تشریف لے چلیں وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ یہاں بیٹھ کر بات کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ اس طرح اور مریضوں کا وقت ضائع ہوگا۔“

یہ بول کر حکیم کامل اٹھ کھڑے ہوئے اور بزرگ ان کے پیچھے ہولئے، اپنے کمرے میں پہنچ کر بزرگ کو آرام سے بیٹھا دیا اور پوری روداد سننے کے بعد فرمایا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ اکثر ایسا جوان بچیوں کے ساتھ ہوجاتا ہے۔ ہوائی مخلوق پیچھے لگ جاتی ہے۔ اس لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی جوان بچی کا ایسی ویسی جگہ جانا اور وہ بھی خاص کر کھلے بال کے ساتھ جانا تو غضب ہوجاتا ہے اگر بچی زیادہ خوبصورت ہو تو اس کے لئے اور بھی زیادہ خطرہ منڈلانے لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے آپ کی بچی بھی یقیناً زیادہ خوبصورت ہے۔ خیر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر اپنے گھر جائیں۔ آپ اپنا پتا لکھوا دیں۔ میں رات میں اپنے تئیں معلومات کروں گا اور رات ہوتے ہی آپ کے گاؤں آپ کے مکان میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ دل میں بالکل بھی خیال نہ لائیں۔ میں خرچ وغیرہ بالکل بھی نہیں لیتا۔ اللہ نے مجھے بہت دے رکھا ہے۔ مخلوق خدا کی خدمت کر کے مجھے دلی خوشی ہوتی ہے۔“

یہ سن کر بزرگ نے اپنے گاؤں اور مکان کا اتہ پتہ لکھوا دیا اور بولے۔ ”جناب اس کا اجر اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور دے گا۔ بس آپ میری بچی کو بچالیں۔ میں اور میری نسل تاحیات آپ کو دعائیں دے گی۔ مرنے کے بعد بھی میری روح آپ کے لئے دعا گو رہے گی۔“ بزرگ نے آبدیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

بزرگ کی باتیں سن کر حکیم کامل نے فرمایا۔ ”آپ آرام سکون سے گھر جائیں۔ بالکل بے فکر ہوجائیں۔ اوپر والے پر بھروسہ رکھیں۔ آپ کا مسئلہ بہت جلد نمٹ جائے گا۔“

وہ بزرگ حکیم کامل کی باتیں سن کر مطمئن ہوگئے اور اطمینان وسکون سے اپنے گھر کے لئے روانہ ہوگئے۔ اس مسئلے سے فراغت کے بعد حکیم کامل نے بتایا حکیم وقار سے۔

”اس رات میں نے اپنے چند نادیدہ کارندوں کو بزرگ کے مکان کے چاروں طرف متعین کردیا اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں وہ جن بچی کو جانی نقصان یا پھر بچی کو مکان سے باہر نہ لے جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کردیا کہ وہ جن بھی اس مکان سے باہر نہ جاسکے یعنی پورے مکان کے گرد ایک مضبوط حصار کھینچ دیا۔

حصار کا کھینچنا تھا کہ اس جن کو پتا چل گیا کہ اس کے گرد مضبوط حصار کھینچ دیا گیا ہے اور پھر اس بچی کو بھی میرے کارندوں نے اٹھا کر کسی اور کمرے میں ڈال دیا۔ اب وہ جن اس کمرے میں مقید ہو کر رہ گیا تھا جس کمرے میں پہلے بچی موجود تھی۔ چاروں طرف سے اس کمرے کو جیسے ساؤنڈ پروف بنا دیا گیا کیونکہ ہوسکتا ہے وہ جن اودھم مچاتا اور خوفناک آوازوں سے گھر والوں کو ڈراتا دھمکاتا۔

وہ بے مذہب جن تھا۔ اس نے رات میں کافی اودھم مچانا شروع کردیا مگر اس کی ایک نہ چلی۔ میں صبح دس بجے کے قریب ان بزرگ کے مکان پر پہنچ گیا۔ بزرگ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور فوراً مجھے بیٹھک میں بیٹھایا۔ اور بولے۔ ”حکیم صاحب نہ جانے کس طرح رات میں ہماری بچی خود بخود ہمارے کمرے میں آ کر آرام وسکون سے سوگئی، حالانکہ آج رات سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

یہ سن کر میں نے فرمایا۔ ”آپ اطمینان رکھیں۔ آپ مجھے اس کمرے تک لے چلیں جو کہ بچی کا کمرہ ہے۔“ یہ سن کر بزرگ مجھے اس کمرے تک لے گئے جہاں کہ بچی رہا کرتی تھی۔

بزرگ سے میں نے کہا۔ ”فی الحال کمرے سے باہر ٹھہریں میں جب آواز دوں تو آپ کمرے میں آجائیں، جب تک میں آواز نہ دوں اس وقت تک آپ یا گھر میں سے کوئی بھی اس کمرے میں نہ آئے۔“

بزرگ نے کہا ”بالکل آپ کے حکم کی میں تعمیل کروں گا۔“

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا، اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس دھماکے کی آواز سن کر یقیناً اس کا دل پھٹ جاتا یا پھر دماغی طور پر وہ مفلوج ہوجاتا۔ وہ جن بہت ہی بھیانک شکل میں مجھے نظر آیا۔ اس کا غضبناک انداز بتا رہا تھا کہ اگر میں کمزور ہوتا تو وہ مجھے کچا ہی چبا جاتا۔ اس کی کریہہ آواز کمرے میں گونجی! ”مجھے جانے دے، نہیں تو تیرا بھی حشر نشر

www.pdfbooksfree.pk

ہوجائے گا، میں تو جان سے جاؤں گا مگر تو بھی زندہ نہیں بچے گا۔ تو نہیں جانتا کہ میں کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا قبیلہ بہت خونخوار ہے، ہمارا مذہب سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا ہم حرام حلال میں کوئی تمیز نہیں کرتے، تیرے ساتھ ساتھ اس گھر کے سارے افراد بھی مارے جائیں گے۔" وہ جن بولا۔

پھر میں نے کہا۔ "تو ہماری فکر نہ کر اور نہ ہی گھر والوں کی فکر کر، اور تو جس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے، میں رات میں تیرے قبیلے میں گیا تھا اور تیرے سردار سے مل کر آیا ہوں۔ تیرے سردار کا کہنا ہے کہ تو ضدی، عیاش، اوباش اور نافرمانوں میں سے ہے۔ تجھ سے ویسے بھی قبیلے والے نفرت کرتے ہیں، تو اچھے چال چلن کا نہیں۔ کسی نے بھی تیری حمایت نہیں کی۔ تیرے سردار کا کہنا ہے کہ ہم غیر مذہب سے ضرور تعلق رکھتے ہیں مگر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، ہمیشہ ہم نے اصل اور نقل میں فرق رکھا ہے۔ ہم نے ہمیشہ ظالم کی مخالفت کی ہے اور مظلوم کا ساتھ دیا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ مرنے کے بعد ہم نے حساب دینا ہے۔ ظلم ظلم ہوتا ہے اور ہر ظالم اور برے کا انجام برا ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ کی جو مرضی آپ اس کے ساتھ سلوک کریں، ہمیں کوئی رنج نہیں ہوگا۔"

یہ سن کر وہ جن پیچ و تاب کھانے لگا، وہ باتیں کرتا رہا کہ اچانک اس نے اپنی طرف سے میری جانب آگ کا ایک بہت بڑا گولا پھینکا، اگر میں ذرا سا بھی چوک جاتا تو میرا جانی نقصان ہوجاتا مگر میں بھی چوکس تھا، میں نے فوراً اپنے سیدھے ہاتھ کی سیدھی انگلی اٹھادی تو آگ کا وہ گولا فوراً درمیان میں ہی رک گیا۔ یہ دیکھ کر وہ بلبلا اٹھا، اس کی حالت بہت غیر ہونے لگی اس کی آنکھوں میں جیسے چنگاریاں کوندنے لگی تھیں۔

"اب بول تیرا کیا حشر کیا جائے.....؟ تجھے سسکا سسکا کر مارا جائے یا پھر فوراً تجھے خاکستر کردیا جائے۔" میں نے کہا۔ میری بات سن کر وہ قہقہہ لگانے لگا اور بولا۔ "تو اپنے آپے میں رہ، اپنی گیدڑ بھبکی مجھے نہ دے۔"

یہ سننا تھا کہ میں نے اس کے آگ کے گولے کی طرف دوبارہ اپنی انگلی اٹھادی تو آگ کا وہ گولا آناً فاناً اس جن کی جانب پلٹ گیا اور چشم زدن میں اس جن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آگ کے شعلوں میں وہ کراہنے لگا اس کی فلک شگاف چیخیں در و دیوار کو ہلانے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے پورے کمرے میں بھونچال آگیا ہو۔ مگر سب کچھ کمرے تک ہی محدود تھا۔ کمرے سے باہر کسی قسم کی کوئی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"ایک لمحہ بھی نہیں لگا اور وہ جن جل کر راکھ ہوگیا تو میں نے بزرگ کو آواز دی کہ آپ کمرے میں آجائیں۔ بزرگ کمرے میں آکر میرے قریب بیٹھ گئے تو میں نے کہا۔ اس جن کا خاتمہ ہوگیا ہے، وہ دیکھیے سامنے راکھ پڑی ہوئی ہے۔" راکھ کو دیکھ کر بزرگ بہت حیران ہوئے اور دعائیں دینے لگے اور پھر بولے۔ "حکیم صاحب ایسا تو نہیں کہ اس کے ساتھی یا اس کے خاندان والے بعد میں ہمیں پریشان کریں کیونکہ میں نے سن رکھا ہے کہ ایسی صورت میں اس کے خاندان والے پریشان کرتے ہیں۔"

بزرگ کی بات سن کر میں نے کہا۔ "آپ بے فکر رہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں نے پکا کام کردیا ہے۔ اب آپ کی بچی ہر طرح کے خطرے سے مبرا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ ہنسی خوشی اپنی فیملی کے ساتھ کھائیں پئیں اور بے فکر ہوجائیں۔ ویسے اگر کبھی کوئی اور ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں۔ اب آپ مجھے اجازت دیں۔"

پھر میں نے انگلی سے اس راکھ کی طرف اشارہ کیا تو ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا اور اس راکھ کو اپنی لپیٹ میں لے کر کمرے سے باہر کو نکلتا چلا گیا، اور آسمان کی اونچائی پر جا کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اور اس طرح حکیم کامل بزرگ سے اجازت طلب کر کے حکیم وقار کے مطب میں واپس آگئے۔

اس واقعہ کے کافی عرصہ تک میں حکیم وقار کے مطب میں زیر تربیت رہا۔ ایک دن حکیم وقار نے مجھ سے کہا۔ "اب آپ حکمت میں مکمل ہوگئے ہیں، میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، آپ اب بصد شوق اپنے گاؤں جاسکتے ہیں اور اپنا مطب کھول سکتے ہیں۔"

اور پھر اس طرح میں دلی سے واپس آگیا۔ وقت گزرتا رہا اور پھر میں نے مکمل طور پر سکونت اس گاؤں میں اختیار کرلی۔ "اور اب آپ کے سامنے موجود ہوں۔ آپ میری بات مان کر فوراً دلی روانہ ہوجائیں۔ اور جب حکیم وقار کے مطب میں جائیں تو انہیں میرا حوالہ دے سکتے ہیں۔" حکیم صاحب نے کہا۔

یہ باتیں سن کر رمیش کے والد فوراً بولے۔ "حکیم صاحب جب آپ اتنی مہربانی کر رہے ہیں تو ایک احسان اور کردیں کل صبح اجالا پھیلنے سے پہلے ہی ہم دونوں گھوڑا گاڑی پر دلی کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں۔ آپ میری بات مان لیں، یہ آپ کا ہم لوگوں پر بہت بڑا احسان ہوگا۔"

اب رمیش کے والد کے سامنے حکیم صاحب سے انکار نہیں ہوسکا۔ اور یہ بات طے ہوگئی کہ کل علی الصبح دونوں بذریعہ گھوڑا گاڑی دلی روانہ ہوجائیں گے۔ حکیم وقار کے مطب کے لئے۔

دوسرے دن ساڑھے گیارہ بجے ان دونوں کی گھوڑا گاڑی حکیم وقار کے مطب کے سامنے جا کر رک گئی، دونوں گاڑی سے اترے اور کوچوان کو بول دیا کہ گاڑی کو مطب سے تھوڑی دور کنارے لگادے اور واپسی کا ہمارا انتظار کرے۔ کوچوان نے اثبات میں سر ہلادیا۔

دونوں مطب کے انتظار گاہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد انتظار گاہ میں جب ایک ضعیف ملازم اپنے ہاتھ میں جگ اور گلاس لے کر داخل ہوا تو اس کی نظر اچانک حکیم نعیم پر پڑی تو وہ بولا۔ "حکیم صاحب خیریت! آپ اور اس وقت۔"

ویسے مطب کا اصول تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی ملازم جگ میں ٹھنڈا پانی اور گلاس لے کر انتظار گاہ میں داخل ہوتا اور اس جگہ بیٹھے ہوئے ضرورتمندوں کو پانی پلاتا۔

"جمال بابا! بس ایک ضرورت آن پڑی ہے اور

اردو افسانوں کا عطر، راجندر سنگھ بیدی کے زندہ افسانے

راجندر سنگھ بیدی کے

شاہکار افسانے

قیمت =/150

انتخاب: ڈاکٹر اختر ہاشمی

سعادت حسن منٹو کے مشہور اور منفرد افسانوں کا دلآویز مجموعہ

منٹو کے

شاہکار افسانے

قیمت =/150

انتخاب: ڈاکٹر اختر ہاشمی

کامیاب بک ڈپو اردو بازار کراچی

www.pdfbooksfree.pk

حکیم کامل سے ملنا ضروری تھا اس سلسلے میں انتظار گاہ میں بیٹھے ہیں۔ اور یہاں کا یہ اصول ہے کہ ہر وہ ضرورتمند اپنا نمبر آنے پر اندر جاتا ہے۔"

"ویسے خیریت تو ہے ناں.....!" جمال بابا نے پوچھا۔

"جی خیریت ہی ہے، یہ میرے گاؤں کے ساتھی ہیں، ان کا ایک مسئلہ ہے اس سلسلے میں مجھے بھی ساتھ لے آئے ہیں۔ ہم گاؤں والے سب کے سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں اس لئے میں ان کے ساتھ آیا ہوں۔ ان کے جوان بیٹے کے ساتھ کوئی پراسرا رمسئلہ ہوگیا ہے۔" حکیم نعیم نے کہا۔

تھوڑی دیر میں ان کا نمبر آ گیا تو وہ دونوں اندر حکیم وقار کے سامنے حاضر ہوگئے۔ حکیم نعیم کو دیکھ کر حکیم وقار نے انہیں گلے سے لگایا اور کرسی پر بیٹھایا اور گویا ہوئے۔ "آپ کس سلسلے میں تشریف لائیں ہیں.....؟"

"یہ سن کر حکیم نعیم نے کہا۔ "یہ محترم میرے گاؤں کے رہائشی ہیں ان کے جوان بیٹے کے ساتھ کسی ہوائی مخلوق کا چکر ہوگیا ہے۔ بے چارے بہت پریشان ہیں، اس سلسلے میں ان کے ساتھ چلا آیا کہ حکیم کامل سے ان کی ملاقات کرادوں گا۔"

رولوکا نے دونوں کو اپنے سامنے کرسی پر بیٹھایا اور بولا۔ "حکیم نعیم چلئے اس بہانے آپ سے ملاقات تو ہوگئی۔ ورنہ آج کل کے حالات کے پیش نظر لوگوں کی اتنی مصروفیات ہوگئی ہیں کہ لوگوں کا اپنے معمولات سے ہٹ کر کہیں آنا جانا بہت مشکل ہوگیا ہے۔

اور سنایئے کہ آج کل آپ کی مصروفیات کیا ہیں اور گزر بسر کس طرح چل رہا ہے۔"

رولوکا کی بات سن کر حکیم نعیم نے کہا۔ "حکیم صاحب گاؤں میں تھوڑی بہت زمینیں ہیں اور پھر اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا مطب کھول رکھا ہے، قرب وجوار کے تین چار گاؤں ہیں وہاں کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں جس سے تھوڑی بہت آمدنی ہوجاتی ہے۔ بس اللہ کا فضل ہے گزر بسر ہورہا ہے۔"

"چلئے یہ اچھی بات ہے ورنہ انسان کی خواہشات لامحدود ہیں، خواہشات کی تکمیل ہونا ممکن نہیں۔ زیادہ آمدنی اور دولت کی ریل پیل کی وجہ سے انسان اپنے پیدا کرنے والے کے احکام اکثر بھلا بیٹھتا ہے۔ شادی بیاہ سے پہلے ایک آدمی اپنے مستقبل کے لئے کوشاں رہتا ہے اور جب شادی ہوجاتی ہے تو بیوی بچوں کے لئے تگ ودو میں لگا رہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی ہوس اسے اندھا کردیتی ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ وہ جائز کررہا ہے یا ناجائز۔ بلکہ انسان کو سوچنا چاہیے کہ دین ودنیا کا جو خالق ومالک ہے وہی سب کا پالن ہار ہے، اور وہی سب کو روزی دینے والا ہے، وہی ضروریات زندگی کا پورا کرنے والا ہے، لیکن انسان سوچتا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے مجھے کرتا ہے، اپنی دولت اور اپنے کاروبار میں وسعت اور یہی نہیں بلکہ اپنی شہرت کے لئے لوگوں کا گلا کاٹنے لگتا ہے، دوسروں کے بچوں کی ضروریات کا گلا دبا کر اپنے بچوں کا پیٹ بھرتا ہے بلکہ کسی کسی مقام پر تو ایک طاقتور انسان یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اسے اپنے فائدے کے لئے کسی کا خون نہیں بہانا چاہیے مگر وہ دوسروں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ چند روزہ زندگی کے لئے اپنی طاقت، عہدہ، بڑائی اور دولت کے بل بوتے پر دوسروں کے منہ سے نوالے تک چھین لیتا ہے۔

وہ اپنی ضرورت سے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرتا ہے، ایک گھر کے علاوہ کئی گھر بناتا ہے اور پھر ان گھروں کو کرائے پر دے دیتا ہے۔ مگر دنیا کے خالق ومالک کا یہ فرمان ہے کہ "اے انسان تو ضرورت سے بڑھ کر مکان پر مکان بنا رہا ہے، اس میں تو ہمیشہ نہیں رہے گا، اس سے دوسرے عیش کریں گے مگر یوم حساب صرف تو پکڑا جائے گا، تو ہی جوابدہ ہوگا، تیرے عزیز واقارب تیرے بھائی بند، تیرے بچے اور تیری بیوی تیرے کام نہیں آئیں گے، اپنے کرتوتوں کی سزا صرف تو ہی بھگتے گا۔ اور وہ جگہ جہاں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں، وہ جگہ تیرے حصے میں آئے گی۔"

خیر یہ انسانی فطرت ہے لیکن صبر وشکر کرنے

والے اور قناعت پسند افراد صرف اتنا ہی کوشش کرتے ہیں کہ جس سے آرام وسکون سے زندگی گزاریں، جب سب کا پالن ہار اوپر بیٹھا ہے وہی بیوی، بچے اور ہمیں دینے والا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں اپنی جان مارنے والے اور دوسروں سے چھین کر اپنا گھر بھرنے والے، بہرحال انسان کو قناعت پسند ہونا چاہیے اور صبر وشکر سے زندگی گزارنی چاہیے۔

ارے میں کیا لے کر بیٹھ گیا، اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں، آپ سنائیں، مسئلہ کیا ہے.....؟" حکیم نعیم بولے۔ حکیم صاحب مسئلہ بہت گھمبیر لگتا ہے۔ ایک طویل عرصہ سے ہمارے گاؤں کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے ہمیں اس گاؤں میں بہت آرام وسکون تھا۔ گاؤں کے سارے لوگ شیر وشکر کے مانند تھے، ہنسی خوشی زندگی گزر رہی تھی، گاؤں کا نام رام پور ہے، لوگ ڈرے ڈرے، سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے کہ جس سے دل دہلتا رہتا ہے، ایسے ایسے انہونے واقعات رونما ہوجاتے ہیں کہ کبھی نہ دیکھے ہوں اور نہ ہی کسی نے سنے ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ پورے گاؤں پر اندیکھی ہوائی مخلوق کا قبضہ ہوچکا ہے۔ اس مسئلے کے لئے آئے ہیں۔ یہ بے چارے بھی وقت کے ستائے ہوئے ہیں۔ حالات سے مجبور ہوکر یہ میرے ساتھ آئے ہیں، آپ انہی کی زبانی سن لیں تو بہتر ہوگا۔" حکیم نعیم نے کہا۔

اس کے بعد رمیش کے پتا گویا ہوئے۔ "حکیم صاحب! میں تو کسی قابل نہیں آپ کی ہمدردی اور تعاون کا اجر آپ کو ایشور دے گا، میں اپنی بپتا کیا سناؤں یہ سمجھیں کہ میرا کلیجہ پھٹا جارہا ہے۔" ان کی آواز رواہنسی ہوئی اور آنکھوں سے آنسو کے قطرے نکل پڑے اور وہ سسک پڑے۔

یہ دیکھ کر رولوکا نے جلدی سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی منگوا کر انہیں پینے کو دیا۔ جب وہ پانی پی چکے تو رولوکا بولا۔ "آپ گھبرائیں نہیں، اوپر والے پر بھروسہ رکھیں، جب آدمی اس پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ انسان کے دکھ درد اور تمام تکلیفیں دور کردیتا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں اور بتائیں۔"

رولوکا کی بات سن کر انہوں نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر بولے۔ "حکیم صاحب جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، یہ حالات وہاں سے شروع ہوئے اور اب میرا جوان بیٹا مرنے جیسا ہوگیا ہے۔ اب وہ نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی اس پر کسی آتما کا قبضہ ہوگیا ہے۔

میرا بیٹا اچھا بھلا تھا، لندن سے چھٹیاں گزارنے آیا تھا، وہ لندن میں زیر تعلیم تھا، لندن میں ہی اس کی دوستی ایک لڑکی مالنی سے ہوگئی، دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ خیر دونوں یہاں آ گئے، وہ لڑکی اپنے گاؤں چلی گئی اور میرا بیٹا اپنے گاؤں آ گیا۔

جبکہ میں یہ کہوں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ میرے بیٹے اور اس لڑکی نے پروگرام بنایا تھا کہ دونوں شادی کرلیں گے آپس میں۔ دونوں گھرانوں میں کسی کو بھی اعتراض نہیں تھا۔

جب میرا بیٹا اپنے گاؤں آیا تو بقول اس کے کہ اس نے مالنی سے وعدہ کیا تھا کہ آنے کے تیسرے چوتھے دن وہ مالنی سے رابطہ کرے گا مگر ایک ہفتہ گزر گیا میرا بیٹا جس کا نام رمیش ہے۔ اس نے مالنی سے کوئی بھی رابطہ نہ کیا۔

لہٰذا مالنی نے ہمارے گاؤں آنے کا فیصلہ کرلیا اور پھر وہ ہمارے گاؤں آنے کے روانہ ہوگئی۔ وہ اسٹیشن پر اتری اور بقول تانگے والے کے اس نے اس لڑکی کو رام پور کے پارک کے پاس اتارا تھا۔ اس وقت پورے علاقے میں رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس کے بعد اس لڑکی کا کوئی پتا نہ چلا کہ لڑکی گئی تو کہاں گئی۔ چند دن بعد اس کے گاؤں سے ایک آدمی ہمارے گاؤں آیا کہ اس کا پتا کرے مگر اسے اور ہم سب یہ سن کر سکتے میں آ گئے کہ لڑکی تو یہاں پہنچی نہیں۔ اسٹیشن پر کھڑے تانگے والوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو ایک تانگے والے نے تصدیق کردی کہ اس نے اس دن رات کے سے لڑکی کو پارک کے پاس

www.pdfbooksfree.pk

اتارا تھا۔ اور پھر وہ تانگے والا اگلے گاؤں اپنے گھر چلا گیا تھا۔

پولیس والوں نے تانگے والے پر بہت سختی کی مگر تانگے والا ایک تو ضعیف اور کردار کا ایسا نیک آدمی ہے کہ ہر آدمی نے اس کی نیک نامی کی گواہی دی تو پولیس نے اس کی جان چھوڑ دی۔

بہر حال ہم سب اور اس لڑکی کے گھر والے رو دھو کر خاموش ہو گئے۔ اور میرے بیٹے کو چپ لگ گئی، اس دن سے اس کی زندگی میں ویرانی آ گئی۔ اس کے بعد ہم نے اس کے ہونٹوں میں آج تک ہنسی نہیں دیکھی۔

اس لڑکی کے غائب ہونے کے بہت تھوڑے دنوں بعد ہی گاؤں کی ایک بہت مضبوط جسم و جان رکھنے والا نوجوان موت کے منہ میں چلا گیا۔ اس کی موت بہت بھیانک طریقے سے ہوئی تھی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے چار نوجوان اپنی جان گنوا بیٹھے۔ اور سب سے اچنبھے اور سکتے میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ وہ گاؤں کے سرے پر ایک پرانا مندر ہے اور اس مندر کے قریب برگد کا ایک بہت بڑا درخت ہے، اس درخت کے پاس ہی وہ چاروں وقفے وقفے سے مردہ پائے گئے اور صرف اماوس کی راتوں میں۔

اس کے بعد ایک سادھو کی موت واقع ہو گئی۔ سادھو اس رات مندر میں تھا اس نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ گاؤں میں موجود آتما کو گاؤں سے بھگا دے گا۔ مگر اسی رات وہ سادھو مندر کے قریب پیپل کے درخت پر لٹکا ملا، وہ مردہ تھا۔ ایک چھوٹی اسی میں پیپل کے درخت پر اس کی لاش جھول رہی تھی۔ پیپل کا درخت بہت موٹا اور لمبا ہے۔ وہ سادھو بہت بوڑھا تھا اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ پیپل کے درخت پر چڑھتا اور خود کو پھانسی لگا لیتا۔ اس عرصے میں میرے بیٹے کی صحت دن بدن گرتی چلی گئی، اس کی وجہ سے یہ حکیم نعیم بھی بہت دکھی ہوئے رہے ہیں۔ آئے دن انہوں نے ہر طرح کی دوا دی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب تو وہ ایسا ہو گیا ہے کہ اس سے چارپائی پر سے اٹھنا بھی محال ہے۔" یہ کہتے وہ آبدیدہ ہو گئے۔

تو رولو کا نے انہیں تسلی دی اور کہا، "آپ فکر نہ کریں، یہاں تک آئے ہیں تو میری کوشش ہو گی کہ آپ کی پریشانیاں دور ہو جائیں۔ آدمی کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔"

"حکیم صاحب! آپ کی بات صحیح ہے مگر اب مجھ میں جوان بیٹے کو دیکھ دیکھ کر حوصلہ رہا نہیں۔ اب تو بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ اسے کچھ ہونے سے پہلے بھگوان مجھے اٹھا لے۔" یہ بول کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو رولو کا نے پھر ایک گلاس ٹھنڈا پانی منگوا کر انہیں پلایا۔

پانی پی کر وہ کچھ شانت ہوئے اور پھر بولے۔

"چند دن پہلے رمیش منہ اندھیرے ہی گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کی خبر ہم گھر والوں کو نہیں تھی۔ جب ہر طرف اجالا پھیل گیا تو ہم سو کر اٹھے اور دیکھا تو رمیش اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ ہم نے سمجھا کہ صبح سویرے اٹھ کر کہیں باہر گیا ہو گا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ وہ سرسوں کے ایک کھیت کے باہر بے ہوش پڑا ہے۔ ہم بھاگے بھاگے گئے تو دیکھا کہ وہ واقعی سرسوں کے کھیت کے کنارے بے حس و حرکت بے ہوش پڑا تھا۔

یہ سلسلہ اس کے ساتھ کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔ ایک دن میں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا، اسی سرسوں کے کھیت میں چلا گیا جہاں بے ہوش پڑا تھا۔ کھیت میں وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا، ایسا لگتا تھا کہ شاید کسی کو تلاش کر رہا ہو، چونکہ میں اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہا تھا۔

پھر تھوڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "مالنی ٹھہرو..... مالنی ٹھہرو..... مالنی مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔" اور وہ ایک طرف کو دوڑ پڑا۔

اس آواز پر میں چونکا اور پھر میں نے اس طرف غور سے دیکھا جس طرف وہ دوڑ کر جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس سے تھوڑے فاصلے پر کسی لڑکی کا واضح وجود نظر آیا۔ اس لڑکی نے سفید لباس پہن رکھا تھا، اس کے کالے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور اس کا انداز ایسا تھا آگے بڑھنے کا کہ جیسے وہ ہوا کے اوپر چل رہی ہو۔ اس کا

قدم زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ میں بھی تھوڑا فاصلہ رکھ کر رمیش کے پیچھے بھاگا۔ مگر کھیت کے کنارے پہنچتے پہنچتے اس لڑکی کا وجود غائب ہو گیا اور پھر رمیش کو ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔

حکیم صاحب آپ سے بنتی ہے میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، میرے بیٹے کو بچا لیں اس میں جتنا بھی خرچ آئے گا میں اپنے آپ کو بیچ کر بھی دوں گا۔" اور یہ بول کر انہوں نے اپنی گردن جھکا لی اور سسکنے لگے۔

رولو کا اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان کے قریب آیا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دینے لگا۔ تھوڑی دیر تک رولو کا کے تسلی دینے پر وہ شانت ہو گئے تو رولو کا بولا۔

"آپ غم نہ کریں، دل میں اچھی امید رکھیں، مالک نے چاہا تو بہت جلد آپ کا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا، مجھ سے جہاں تک ہو سکا کوشش کروں گا۔ اور خرچ ورچ سے بے فکر رہیں، کسی قسم کا کوئی خرچ نہیں ہو گا، میں جو بھی کرتا ہوں اوپر والے کی خوشی کے لئے کرتا ہوں۔ یہ اوپر والے کی مرضی اور مہربانی ہے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ اور لوگوں کا دکھ درد ختم ہو جاتا ہے۔ ورنہ میں کس قابل ہوں، مجھ میں کوئی کمال نہیں، بس یہ سب اوپر والے کا کمال ہے۔

"حکیم نعیم! آپ اپنے مطب اور ان کے گھر کا پتا لکھوا دیں۔ آج رات میں، میں حالات کا جائزہ لوں گا، معلوم کرتا ہوں کہ اصل معاملہ کیا ہے اور اس مسئلے کا پائیدار حل کیا ہے۔ میں آپ کے دیئے ہوئے پتہ پر ضرورت کے مطابق پہنچ جاؤں گا۔ آپ لوگ بے فکر ہو کر جائیں۔ دل میں کوئی اندیشہ نہ لائیں۔ بلکہ مسکراتے ہوئے جائیں، میں بہت جلد آپ کے گاؤں میں آؤں گا۔" یہ بول کر رولو کا نے ان دونوں سے مصافحہ کیا اور انہیں رخصت کر دیا۔

دونوں خوش خوش رولو کا سے رخصت ہو کر تانگے کی طرف بڑھے اور تانگہ میں بیٹھ گئے۔ اور اس کے بعد تانگے والے کو اشارہ دیا کہ وہ تانگہ آگے بڑھائے۔ تانگے والے نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ چند گھنٹے میں وہ دونوں اپنے گاؤں رام پور پہنچ گئے۔

ادھر شام ہوئی اور پھر شام کے بعد اندھیرے نے پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اتفاق سے آج بھی اماوس کی رات تھی۔

رولو کا اپنے کمرے میں موجود تھا کہ اس کے دل میں آیا کہ کیوں نہ رام پور چلا جائے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ارادہ کیا رام پور کا، پلک جھپکتے میں وہ رام پور میں موجود تھا۔ وہ غائب حالت میں اب پورے گاؤں کا چکر لگا رہا تھا۔ اس نے گاؤں کے سرے پر کالی ماتا کا پرانا مندر اور اس کے قریب برگد کے درخت کے نیچے تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بڑے غور سے کسی چیز کا اندازہ کر رہا ہو، پھر وہ مندر کے دروازے کے سامنے بھی گیا۔ اس کے بعد وہ گاؤں کے بیچ کالی ماتا کے مندر کے پاس آ گیا۔ اس جگہ اور پھر پیپل کے درخت کے پاس بھی آ کر وہ چند منٹ کھڑا رہا، اس کے بعد وہ رمیش کے گھر کی طرف چل پڑا، رمیش کے دروازے پر چند سیکنڈ کھڑا، اس کے بعد رولو کا غائب حالت میں ہی اس کمرے میں آ گیا جہاں رمیش بے سدھ پڑا تھا۔

رولو کا ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اور اپنی نظریں رمیش پر مرکوز کر دیں۔

اچانک اسے ایک ہلکی سرگوشی سنائی دی کسی لڑکی کی آواز میں۔ "رمیش تم میرے لئے کتنا بیاکل ہو، تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے، تم مجھے بھی تو دیکھو کہ میں تم سے کہیں بڑھ کر بیاکل تھی اور اب بھی بیاکل ہوں، میری آتما کو کسی پل چین نہیں، تمہاری چاہت میں تو میری جان چلی گئی۔ تم گھبراؤ نہیں، اب سے بہت کم رہ گیا ہے، کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی، تم بن میری آتما بھٹک رہی ہے، اب مجھ سے بھی تمہاری دوری برداشت نہیں ہو رہی ہے اسی کارن اب میں پل پل تمہارے پاس رہتی ہوں بلکہ اب تو میں تم میں سما گئی ہوں، اب زیادہ وقت نہیں رہا کہ ہم دونوں کی آتما ایک ساتھ رہیں گی، ہم آزاد فضاؤں میں اڑتے پھریں گے، ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے

www.pdfbooksfree.pk

والا نہیں ہوگا، رمیش تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔" اور پھر وہ سرگوشی یکدم معدوم ہوگئی۔

رولوکا نے ارادہ کیا اپنے کمرے میں آنے کا اور پھر چشم زدن میں وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھوئے اور اپنے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

لیکن رولوکا نے اپنے اندیکھے چند کارندے رام پور میں چھوڑ دیئے تھے، اور انہیں حکم دیا تھا کہ وہ ہر وقت رمیش پر نظر رکھیں اور اس کے اردگرد رہیں اور پل پل کی خبر یں اس تک پہنچاتے رہیں، لہٰذا سارے کارندے رولوکا کا حکم بجالانے پر لگ گئے تھے۔ اور پل پل کی رمیش کی ذات کی خبریں رولوکا تک پہنچا رہے تھے اور اس طرح رولوکا رمیش کی ذات سے باخبر تھا۔

ادھر رمیش کے بابو جی پل پل رولوکا کو یاد کررہے تھے، ان کے دل میں آیا تھا کہ پتا نہیں حکیم صاحب آئیں گے کہ نہیں، ان کا دل بہت زیادہ اندیشے میں تھا، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ پریشان حال آدمی بہت سہا سہا اور ڈرا ڈرا سا رہتا ہے، یہی حالت ان کی بھی تھی۔ وہ ہر وقت خلاؤں میں گھورتے رہتے تھے، ان کی نظریں رمیش پر پڑتی تو وہ بہت زیادہ دکھی ہوجاتے تھے۔ لیکن اپنی پریشانی اور دکھ کو گھر والوں پر ظاہر نہیں کرتے تھے کہ اس طرح گھر والے اور بھی دکھی ہوجائیں گے۔ وہ ہر وقت اپنے گھر والوں کو تسلی اور دلاسہ دیتے رہتے تھے کہ "بھگوان کی کرپا سے ہمارا رمیش بہت جلد ٹھیک ہوجائے گا۔"

تیسرے دن رولوکا ساڑھے دس بجے رام پور حکیم نعیم کے مطب کے سامنے موجود تھا۔ وہ آگے بڑھا تو دیکھا کہ حکیم نعیم دوا کی پڑیاں باندھنے میں مصروف ہیں، رولوکا نے بلند آواز سے حکیم نعیم کو مخاطب کیا تو فوراً حکیم نعیم نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر دوڑ کر وہ آئے اور رولوکا کے گلے لگ گئے۔

"حکیم صاحب! آپ اور اس وقت، کوئی اطلاع تو دی ہوتی، آپ نے اس دن بھی نہیں فرمایا تھا کہ آپ کس دن آئیں گے۔"

"خیر میں آج آ گیا۔"

اس کے بعد حکیم نعیم نے رولوکا کو مطب میں بیٹھایا اور بولے۔ "حکیم صاحب گرم چلے گا یا ٹھنڈا.....؟"

رولوکا بولا۔ "گرم چلے گا اور نہ ٹھنڈا بلکہ میں خود چلوں گا۔" یہ سن کر حکیم نعیم مسکرانے لگے۔

"اچھا ایک گلاس ٹھنڈا پانی آپ پلا دیں۔" رولوکا بولا۔

"جی اچھا! ابھی لایا۔" یہ بول کر حکیم نعیم فوراً گھر کے اندر گئے اور گھڑے کا ٹھنڈا پانی شیشے کے گلاس میں لے آئے۔

رولوکا نے پانی پیا اور بولا۔ "حکیم نعیم! رمیش کے گھر چلنا ہے، آپ جلدی سے فارغ ہوجائیں، وہاں تھوڑا وقت لگے گا، آپ اس کو ذہن میں رکھیں۔"

"حکیم صاحب! کوئی بات نہیں، اگر زیادہ وقت بھی لگ جائے تو کوئی بات نہیں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی، اگر آپ اجازت دیں تو یہ چند ضرورت مند بیٹھے ہیں انہیں دوا دے کر آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" حکیم نعیم نے کہا۔

"ارے اس میں زحمت کی کوئی بات نہیں، آپ دوا دیں، میں آرام سے بیٹھا ہوں۔" رولوکا بولا۔

دوا دے کر حکیم نعیم آدھے گھنٹے میں فارغ ہوگئے تو رولوکا سے بولے۔ "حکیم صاحب میں فارغ ہوگیا، آپ تشریف لے چلیں۔"

یہ سن کر رولوکا کھڑا ہوگیا تو حکیم نعیم نے اپنے بڑے صاحبزادے کو آواز دی۔ وہ فوراً باہر آیا تو انہوں نے کہا۔ "بیٹے اگر کوئی ضرورت مند آئے تو اس سے کہنا کہ وہ میرا انتظار کرے، میں تقریباً دو گھنٹے میں واپس آؤں گا، پھر وہ دوپہر کے بعد تشریف لے آئے۔"

"جی ابو! آپ جائیں میں بیٹھا ہوں۔" بچے نے کہا۔

چند منٹ میں دونوں رمیش کے گھر کے پاس پہنچ گئے، حکیم نعیم نے دروازے کو کھٹکھٹایا تو رمیش کے بابو جی باہر نکلے اور پھر رولوکا کو دیکھ کر جیسے اچھل پڑے اور مصافحے

کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے حکیم نعیم سے بھی ہاتھ ملایا۔

علیک سلیک کے بعد رولوکا بولا۔ "میں رمیش کے کمرے میں چلنا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر رمیش کے بابو جی فوراً گھر کے اندر گئے اور چند منٹ میں باہر آ کر بولے۔ "آپ اندر تشریف لے چلیں، رمیش اپنی چارپائی پر بے سدھ پڑا ہوا ہے۔"

ان کے ساتھ رولوکا اور حکیم نعیم دونوں رمیش کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ رمیش آنکھیں بند کئے اپنی چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

رولوکا اسے چند منٹ تک غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "میں آپ کے آنگن میں بیٹھنا چاہتا ہوں یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ آنگن میں سایہ دار بادام کا درخت لگا ہوا ہے۔ آپ کا آنگن کافی بڑا ہے آپ ایک چارپائی درخت کے نیچے بچھا دیں جس پر رمیش لیٹے گا اور چارپائی سے تھوڑا ہٹ کر ایک چٹائی بھی ڈال دیں جس پر میں اور آپ لوگ بیٹھیں گے۔"

یہ سن کر رمیش کے بابو جی تیزی سے اندر گئے اور درخت کے نیچے چارپائی اور چٹائی بچھا کر فوراً اندر آئے اور بولے۔ "حکیم صاحب میں نے دونوں چیزیں درخت کے نیچے رکھ دی ہیں۔"

"ٹھیک ہے آپ باہر چلیں، میں رمیش کو لے کر آتا ہوں۔" رولوکا بولا۔

"حکیم صاحب! آپ ہٹیں میں اٹھا کر لاتا ہوں، آپ باہر چلیں۔" رمیش کے بابو بولے۔

"ارے جناب! یہ اس حالت میں ہے کہ آپ کی قطعی نہیں سنے گا اور نہ ہی یہ آپ کے اٹھانے پر اٹھ کر آپ کے ساتھ باہر آئے گا۔" رولوکا بولا۔

"ٹھیک ہے آپ بہتر جانتے ہیں۔" یہ بول کر وہ اور حکیم نعیم دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

پھر رولوکا بولا۔ "آپ اپنے پاس پڑوس کے چند لوگوں کو بلا لائیں تاکہ ان کے سامنے تمام حقیقت کھل کر آجائے اور انہیں بھی پتا لگ جائے کہ اصل معاملہ کیا ہے.....؟"

یہ سنتے ہی رمیش کے بابو جی تیزی سے باہر نکل گئے اور پلک جھپکتے میں اپنے پاس پڑوس کے چند لوگوں کو لے کر اپنے آنگن میں بادام کے درخت کے سائے میں کھڑے ہوگئے۔

کمرے میں رولوکا نے رمیش کا سیدھا ہاتھ پکڑا تو رمیش روبوٹ کی طرح اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا، پھر رولوکا نے ہاتھ کا اشارہ دیا تو وہ چارپائی سے نیچے اتر کر کھڑا ہوگیا، اور پھر بے چوں و چراں رولوکا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اس دوران رمیش کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ رمیش کا ہاتھ پکڑے ہوئے رولوکا درخت کے نیچے آیا اور پھر رمیش کو چارپائی پر بیٹھا دیا۔ جب رمیش چارپائی پر بیٹھ گیا تو رولوکا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی سیدھی انگلی اس کی پیشانی پر رکھ کر یہ اشارہ دیا کہ وہ چارپائی پر لیٹ جائے۔

ایسا ہی ہوا، رمیش بے حس و حرکت چارپائی پر لیٹ گیا۔

درخت کے نیچے کھڑے ہوئے چند لوگوں سے رولوکا بولا۔ "آپ لوگ برائے مہربانی خاموشی سے چٹائی پر بیٹھ جائیں۔ آپ لوگ خاموش بیٹھے رہیں گے، کوئی اپنی جگہ سے اٹھے گا نہیں اور نہ ہی کوئی کسی قسم کا سوال کرے گا اس کے علاوہ ایک ضروری بات ہے کہ سامنے جو بھی منظر رونما ہوگا اسے دیکھ کر کوئی ڈرے گا نہیں، کیونکہ وہ منظر دیکھنے والوں کو صرف نظر آتا رہے گا، اس کا اثر کسی کی ذات پر نہیں پڑے گا۔ بلکہ اس منظر سے یہ پتا چلے گا کہ گاؤں میں جتنی بھی پریشانیاں، جتنے بھی انہونے واقعات رونما ہوئے ہیں وہ کیوں ہوئے.....؟ اور ان کے رونما ہونے میں کس کے ہاتھ تھے؟ کس نے اپنی نفسانی خواہشات کے پیش نظر ظلم و زیادتی کی۔ اب آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔"

رولوکا کی بات سن کر اس جگہ درخت کے نیچے جتنے بھی لوگ تھے ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر خاموشی کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ گئے۔

www.pdfbooksfree.pk

رولو کا رمیش کی چارپائی کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اپنے ایک طرف حکیم نعیم کو بیٹھایا اور دوسری طرف رمیش کے پتا کو بیٹھا لیا۔ ابھی تک چارپائی پر رمیش آنکھیں بند کئے بے سدھ اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔

رولو کا نے اپنے سامنے مٹی کا ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں صاف پانی موجود تھا۔ رولو کا نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پانی پر پھونک ماری۔ اس جگہ بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی نظریں رمیش پر مرکوز تھیں۔

رولو کا نے پیالے میں موجود تھوڑا سا پانی اپنے چلو میں لیا اور رمیش پر چھڑک دیا۔ پانی کا رمیش پر پڑنا تھا کہ رمیش اچانک کپکپانے لگا کہ اتنے میں رولو کا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی سیدھی انگلی سے فوراً اشارہ کیا۔ انگلی کا اشارہ ایسا تھا کہ جیسے وہ کسی کو تنبیہ کر رہا ہو کہ فوراً شانت ہو جا۔ رمیش اب بالکل شانت ہو چکا تھا۔

اس کے بعد رولو کا نے دوبارہ چلو میں پانی لیا اور چارپائی کی دوسری جانب پانی کو پھینکا۔

چند سیکنڈ بھی نہ لگے اور ایسا لگا کہ چارپائی سے لگ کر ایک چادر سی تن گئی۔ اس دوران رولو کا منہ ہی منہ میں متواتر کچھ پڑھتا رہا۔

اب اس چادر پر جو چارپائی سے لگ کر تنی تھی اس پر ایک منظر ابھرا۔ ایسا لگتا تھا کہ پردے پر پروجیکٹر سے فلم دکھائی جا رہی ہو۔

ایک تانگہ نظر آیا، اس تانگے میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ تانگہ رام پور کے قریب گنیش پارک کے پاس آ کر رک گیا تو تانگے میں سے وہی خوبصورت اور حسین لڑکی اتری۔ اس کے کندھے پر ایک بڑا سا بیگ لٹک رہا تھا۔ لڑکی نے بیگ میں سے چند روپے نکالے اور تانگے والے کو دیئے اس کے بعد تانگہ آگے کو بڑھ گیا۔ اس وقت چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔

لڑکی نے پارک کی طرف دیکھنا شروع کر دیا پھر وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی پارک کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ پارک کے اندر چلی گئی۔ پارک میں موجود بینچ پر چار نوجوان بیٹھے تھے۔

لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ”آپ لوگ یہیں رام پور میں رہتے ہیں، اور کیا رمیش بابو کو جانتے ہیں.....؟“ حال ہی میں لندن سے آئے ہیں۔“

ان چاروں نوجوانوں میں سے ایک بولا۔ ”جی ہم تو رمیش بابو بلکہ پورے گاؤں والوں کو بھی جانتے ہیں ہم بھی اسی گاؤں میں رہتے ہیں، آپ نے رمیش بابو کے گھر جانا ہے.....؟“

”جی! میں رمیش بابو کے گھر جاؤں گی۔“ وہ لڑکی بولی۔ ”میرا نام مالنی ہے۔“

مالنی کا نام سننا تھا کہ رمیش کے پتا چونک پڑے۔

”آپ ہمارے ساتھ چلیں، ہم آپ کو رمیش بابو کے گھر پہنچا دیں گے۔ ان میں سے ایک نوجوان بولا۔

ان چاروں کو دیکھ کر درخت کے نیچے بیٹھے لوگ چونک پڑے تھے۔ ان چاروں میں سے ایک کا نام چندر، دوسرے کا نام رامو، تیسرے کا نام گنیش اور چوتھے کا نام سنیل تھا۔

ان چاروں کے ساتھ لڑکی آگے کی طرف چلنے لگی۔ دو نوجوان آگے آگے اور دو لڑکی کے برابر میں چل رہے تھے، جب وہ چاروں کالی ماتا کے پرانے مندر کے پاس پہنچے جہاں کہ برگد کا درخت تھا۔ ان نوجوانوں میں سے ایک بولا۔ ”دیوی جی آپ ہمیں خوش کر دیں نہیں تو.....؟“

اور پھر انہوں نے لڑکی سے دست درازی شروع کر دی، اس کے بعد انہوں نے اس لڑکی کو دبوچ لیا اور پھر زور زبردستی سے اس لڑکی کے کپڑے پھاڑ دیئے۔

وہ لڑکی چیختی چلاتی رہی، دہائیاں دیتی رہی، مگر ان چاروں پر لڑکی کے رونے اور اس کی آہ و زاری کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ پھر وہ چاروں لڑکی کے ساتھ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کرنے لگے۔ کرب و اذیت اور تکلیف سے لڑکی کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ ان میں سے ایک نے لڑکی کا گلا گھونٹ کر مار دیا۔ لڑکی کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

(جاری ہے)

بھیانک انجام

صائمہ حمید-راولپنڈی

دوپھر کا وقت سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہڈیوں کا پنجر بھڑکتے شعلے میں جل کر راکھ ہوگیا تو اچانک ایک عورت کا ہیولہ فضا میں نمودار ہوا، اور آواز آئی "دھنے واد" اب میں جارہی ہوں۔

بے وفائی اور دھوکہ دہی کی داستان حیرت جو کہ خوف کے لبادے میں لپٹی ہوئی ہے

میں تقریباً انیس بیس سال کے عرصے کے بعد اس گاؤں میں آیا تھا۔ یہ میرا آبائی گاؤں تھا جو دریائے جہلم کی پچھلی جانب کے بہت سارے گاؤں میں سے ایک گاؤں تھا لیکن میں اپنے والدین کے ساتھ ان کے روزگار کی خاطر شہر میں جا بسا تھا۔ جہاں میں نے اپنے والدین کے ساتھ زندگی کا کچھ حصہ گزارا تھا۔

اس گھر کو ہمارے والدین نے کسی سے خریدا تھا اور مکان خریدنے کے بعد بہت عرصے اس میں رہے اور پھر وہ شہر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں ہمارا یہ آبائی گھر کبھی خالی پڑا رہا اور کبھی ہم خود کچھ دنوں کے لئے کسی خوشی غمی کے موقع پر وہاں چلے آتے۔ اور دو مرتبہ یہاں ہماری اجازت سے کچھ ضرورت مند خاندانوں نے بھی وقت گزارا تھا۔ ہم ایک ہی کمرہ استعمال کرتے تھے اور جاتے وقت تالا لگا جاتے تھے اور

www.pdfbooksfree.pk

باہر گیٹ کی چابیاں ہمسائے کو دے جاتے تھے۔ یہاں کا رخ کئے ہوئے ہمیں ایک لمبی مدت گزر چکی تھی۔ اب بھی یہاں آ کر آباد ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا اگر ملازمت کی مجبوری نہ ہوتی۔

مجھے یہاں پاس ہی گاؤں میں اچھی سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن تاحال میں اکیلا ہی یہاں آیا تھا تاکہ گھر کو اچھی طرح دیکھ بھال لوں اور صفائی وغیرہ کا کام کروادوں، کچن کا ضروری سامان اور سلنڈر وغیرہ کا انتظام کرلوں کیونکہ یہاں گیس کی سہولت موجود نہ تھی۔ اس کے علاوہ کئی اور ضروری لوازمات پورے کرنے تھے۔ جو یہاں پھر سے فیملی کے ساتھ آباد ہونے کے لئے ضروری تھے۔

میرا آج اس آبائی گھر میں کافی مدت بعد پہلا دن تھا۔ کافی لمبا سفر طے کر کے آیا تھا۔ لہٰذا آج کا دن تو تھکن دور کرنے میں ہی گزر جانا تھا۔ اس لئے میں نے سرسری سارے گھر کا جائزہ لیا۔ گھر کی حالت کافی خستہ تھی۔ تالا بھی ساتھ والے پڑوسیوں سے چابیاں لے کر کھولا تھا جو کہ کافی تگ ودو کے بعد کھلا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی عجیب عجیب طرح کی باتیں کررہے تھے۔ لیکن میں نے پروانہ کی اور تالا کھول کر گھر میں داخل ہوا۔ تین چار کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے اور باقی صحن تھا جہاں گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں سخت تھک چکا تھا۔ میں نے اپنے استعمال والا کمرہ کھول کر سامان ایک طرف رکھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی کھلی چھوڑنے کی وجہ سے اندر حبس اتنا زیادہ نہ تھا۔ میں نے ساری کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے تاکہ اندر سے بو وغیرہ ختم ہوجائے۔

ایک پرانی سی چارپائی پڑی ہوئی تھی اسے جھاڑ کر میں بغیر تکیہ کے اس پر لیٹ گیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب مجھے اپنے پاؤں پر اچانک گدگدی محسوس ہوئی۔ میں گھبرایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ شام ہورہی تھی۔ گاؤں کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گیا اور وہاں سے کھانا کھا کر واپس آ گیا۔

رات ہورہی تھی۔ میں نے موم بتی جلائی، بجلی کا نام ونشان نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے لمبے عرصے بعد کسی جگہ آؤ تو وہاں پہلے والے انسان نہیں ملتے یہ تو پھر بجلی تھی۔ تقریباً ٹھنڈ کا ہی موسم تھا۔ اس لئے پنکھے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ میں نے تھوڑا بہت ماحول کا جائزہ لیا لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ خاص نظر نہ آیا اور ویسے بھی موم بتی سے اتنی روشنی ہوئی بھی نہیں کہ چیزوں کا بغور جائزہ لیا جاسکے۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور آئندہ کے لئے سوچنے لگا کہ یہاں سیٹلمنٹ کیسے کرنا ہے۔ شفٹ کرنے کے دوران میں، میں نے کام سے دس دن کی چھٹیاں لی ہوئی تھیں۔ ابھی میں مستقبل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

میں نے بہت ڈراؤنا خواب دیکھا کہ کوئی مرد کسی عورت کو تیز دھار چھرے سے بڑی بے رحمی سے قتل کررہا ہے۔ اتنا دہشت ناک منظر تھا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اردگرد کا جائزہ لیا۔

موبائل پر ٹائم دیکھا تو رات کے دو بج رہے تھے یعنی میں نے کافی آرام کرلیا تھا۔ باہر صحن کی طرف عجیب سی سرسراہٹ محسوس ہوئی، مجھے لگا کہ درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ ہے۔

لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے عجیب سی سسکیوں کی آوازیں محسوس ہوئیں۔ میں حیران ہوا کہ ”یہ سب کیا چکر ہے؟ آدھی رات کے وقت صحن میں کون رو رہا ہے؟“

میں تھوڑا گھبرایا لیکن پھر ہمت کر کے باہر صحن میں آ گیا، صحن کے بائیں طرف کونے میں اوپر چھت پر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس جگہ مجھے ہلکی روشنی اور دھواں دھواں سا محسوس ہوا۔ پہلی موم بتی تو ختم ہوچکی تھی۔ لہٰذا میں نے نئی موم بتی جلائی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

اور جب سیڑھیوں کے قریب پہنچا تو میں حیران رہ گیا۔ لمبے سیاہ بال، سفید ساڑی میں ملبوس ایک عورت

گھٹنوں پر سر رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔ خوف سے جیسے مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا، ایسا لگا کہ میرے قدم زمین میں گڑ گئے ہوں۔ پھر میں نے اپنے حواس پر قابو پایا۔ اور ہمت کر کے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

میں مشکل سے اتنا ہی بول سکا اور میری زبان جام ہوگئی۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے دھیرے سے سر اٹھایا تو میرا دل بہت تیزی سے دھڑک اٹھا۔ خوبصورتی اور حسن وجمال کا پیکر وہ عورت جہاں کا حسن اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا پھر وہ بولی۔

”میرا نام روپالی ہے، میں ایک ہندو لڑکی ہوں، ایک طویل عرصہ سے یہاں مقیم ہوں۔“ میں سن ہو کر حیران رہ گیا۔

”بھگوان کے لئے میری مدد کرو، میں بہت دکھی ہوں، میری مدد کرو۔“ وہ پھر سر جھکا کر رونے لگی۔ اس کے رونے میں بے پناہ معصومیت تھی۔

مجھ سے رہا نہ گیا اور بے اختیار میں اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا تو یکدم مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی بلا نے مجھے اپنے پنجوں میں دبوچ لیا ہے۔ مجھ سے ہلنا دوبھر ہورہا تھا۔ لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ آدھی رات کو ایسی معصومیت کسی انسانی وجود کی نہیں بلکہ کسی چڑیل کی ہی ہوسکتی ہے۔ میں نے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی بڑی کوشش کی، لیکن اتنی مضبوط اور بھاری گرفت تھی کہ چھڑانا تو الگ بات میں تو ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ میری گردن پر دباؤ بڑھا رہی تھی جیسے میرا خون چوسنا چاہتی ہو۔ لیکن شاید میری زندگی ابھی باقی تھی۔

اللہ نے میری مدد کی اور بے اختیار میری زبان پر آیت الکرسی کا ورد جاری ہوگیا۔ میں نے اونچی آواز میں آیت الکرسی پڑھنا شروع کردی تو اس نے مجھے ایک جھٹکے سے پیچھے کو دھکیل دیا اور گرج کر بولی۔

”یہ جو کچھ تم پڑھ رہے ہو اس کو پڑھنا بند کرو..... ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ ویسے بھی مجھے بہت پیاس لگی ہوئی ہے۔“ وہ سخت جنونی ہورہی تھی۔ میں لگاتار پڑھائی کرتا رہا۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ نشے میں ڈول رہی ہو۔

”ر.....رک..... رکو..... رکو..... بھگوان کے لئے رکو۔“ وہ بولی۔

”کون ہو تم اور آدھی رات کو یہاں کیا کررہی ہو؟“ میں نے حوصلہ جمع کیا اور کہا۔

”م.....م..... میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔“

میں خاموش رہا لیکن دل ہی دل میں ورد جاری تھا۔ وہ بھی اس بات سے بخوبی واقف تھی۔ اب دل میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں نے ٹھیک ٹھاک غور سے اس کا جائزہ لیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اب وہ سر سے پاؤں تک بھیانک شکل کی کوئی بلا تھی۔ اس کی انتہائی خونخوار آنکھیں تھیں۔ میرا دل کانپ کے رہ گیا پھر وہ بولی۔

”میرا نام روپالی ہے۔ میں ایک ہندو لڑکی ہوں۔ میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں جوان ہوئی تو میری بے پناہ خوبصورتی نے نوجوانوں کی نیندیں منتشر کر کے رکھ دیں، جو بھی مجھے دیکھتا تو دل پکڑ کر آہیں بھرنے لگتا، پھر ایک جگہ میری سیٹھ کمال سے ملاقات ہوئی ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ ہم نے شادی کا پروگرام طے کرلیا مگر اس کے اور میرے گھر والے راضی نہ تھے کیونکہ وہ مسلمان تھا اور میں ایک ہندو لڑکی تھی۔

سب ہمارے خلاف ہوگئے پھر ہم دونوں نے اپنے گھر والوں سے چھپ کر شادی کرلی۔ وہ مجھے بیاہ کر یہاں اس گھر میں لے آیا۔ ہم خوش باش رہنے لگے۔ مجھے کمال سے محبت نہیں تھی، وہ بہت پیسے والا تھا جب کہ میں ایک متوسط طبقے سے تھی۔ میں سیٹھ کمال کی دولت طریقے سے ہتھیانا چاہتی تھی اور وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا اور مجھ پر اندھا اعتماد کر بیٹھا تھا۔ وہ چوری چھپے باپ کی دولت میں سے میرے اوپر پیسہ خرچ کرتا رہا مجھے کئی قیمتی زیورات بنوا کر دیئے۔ میں نے مزید اسے اپنے اعتماد میں لینے کے لئے مسلمان ہونے کا ناٹک کیا۔ میں اس کے سامنے وضو کرتی اور مصلّی بچھا کر جھوٹ موٹ کی نماز پڑھتی۔ وہ بہت خوش ہوتا۔

www.pdfbooksfree.pk

کچھ عرصہ یہی سلسلہ چلتا رہا اور میں اس کی دولت اڑاتی رہی۔ لیکن برے انسان کی شامت جب آتی ہے تو اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی۔

جب کمال کام پر چلا جاتا تو میں اس کے جانے کے بعد ساڑی پہن کر ایک مخصوص طریقے سے اپنی پوجا کرتی۔ انہی دنوں میں ایک اور پیسے والے آدمی میں دلچسپی لینے لگی جو کہ کمال سے بھی زیادہ پیسے والا تھا۔ کسی نہ کسی طریقے سے کمال کو اس بات کا پتہ چل چکا تھا۔ میں اس کے جانے کے بعد اس آدمی سے ملتی تھی۔

ایک دن کمال مجھے کام کا بتا کر چلا گیا اور اپنا موبائل گھر پر ہی چھوڑ گیا۔ دو گھنٹے بعد موبائل کے بہانے سے واپس آیا تو میں اس آدمی کے ساتھ داد عیش میں مصروف تھی، وہ آدمی جو میری طرح ہندو ہی تھا۔ کمال کو دیکھ کر وہ کہیں چھپتا، اس سے پہلے ہی کمال نے اسے دیکھ لیا۔ وہ آدمی تو اپنی جان چھڑا کر بھاگ گیا لیکن میری شامت آ گئی۔

کمال کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ اس نے فوراً مجھے پیٹنا شروع کر دیا اور بولا۔ ”مسلمان ہونے کا ناٹک کرنے والی ڈائن تو واقعی ایک بدکردار عورت ہے۔“ اس نے مجھے بہت مارا پیٹا لیکن اس کے اندر کی آگ پھر بھی نہ بجھی اور گھر میں موجود ایک تیز دھار چھرے سے میری گردن اور میرے جسم پر وار کرنے لگا، جس سے میرا جسم چھلنی ہو گیا اور میں اس کی دانست میں مر گئی۔ پھر اس نے اس جگہ زمین کھودی اور ایک گہرا گڑھا بنا دیا۔ اس نے صحن میں لگے کیکر کے درخت کے نیچے زمین کی طرف اشارہ کیا۔

”پھر اس نے اس گڑھے میں مجھے ڈال دیا۔ میں سب کچھ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں اس قدر نڈھال اور ادھ موئی ہو چکی تھی کہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس نے مجھے گڑھے کے اندر ڈالا اور اوپر مٹی ڈالنے لگا۔ میں نے ہلنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ تیزی سے مٹی اوپر ڈالتا گیا۔ یہاں تک کہ میں گڑھے میں بالکل دفن ہو گئی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ گڑھا بند ہونے کے بعد دم گھٹنے سے میں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ انتم سنسکار کے بغیر، میں بیاکل بھٹکتی ہوئی آتما بن گئی۔ میں مر کے بھی نہیں مری۔

سیٹھ کمال مجھے مارنے کے بعد باہر ملک چلا گیا۔ میری عام دنیا کے لوگوں کی طرح آخری رسومات نہیں ہوئیں۔ میری آتما اس کے لئے آج تک تڑپ رہی ہے۔ میں دوسری دنیا تک نہ جا سکی۔ اور اس طرح میں انسانوں کا خون چوس کر اپنی پیاس بجھاتی ہوں۔

”یہاں تک بول کر وہ سسکیاں لینے لگی، اس کی آنکھوں سے آنسو روانی سے گرنے لگے تھے۔

”تو اب اس سارے مسئلے کا کیا حل ہے؟ تم کس طرح یہ جگہ چھوڑ سکتی ہو۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ وہ ایک دم سیڑھیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی اور نیچے اتر آئی۔ میں ڈر کے مارے دو قدم پیچھے ہو گیا اور پھر سے آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا۔

”ڈرو مت، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ اگر تم میری مدد کرو گے تو اس میں میرا ہی بھلا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں نے بہت سارے لوگوں کو مدد کا کہا لیکن کسی نے میری مدد نہ کی اور میں نے ان کا خون چوس لیا۔“

”تم چاہو تو میری مدد کر سکتے ہو۔“

”کیا مطلب میں سمجھا نہیں.....؟“ میں حیرت سے بولا اور وہ کیکر کے درخت کے نیچے ایک جگہ آ کھڑی ہوئی۔ اور بولی.....

”یہاں..... زمین کے نیچے میں دفن ہوں اور ایک زندہ لاش کی مانند ہوں۔ کیونکہ میرا انتم سنسکار نہیں ہوا۔ میری بھیانک موت نے میرا یہ حلیہ بنا دیا ہے۔ میں نے اپنے پتی کو دھوکہ دیا اور اس نے مجھے یہ سزا دی۔“

”تو اب مجھے کیا کرنا ہے.....؟“ میں حیران و پریشان کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد جاری تھا۔ میں نے ایک اور بات بھی محسوس کی کہ میری جان بچنے کی وجہ آیت الکرسی کے ساتھ میرے گلے میں پڑا ہوا اللہ کے نام کا لاکٹ تھا۔

”اب تمہیں یہ کرنا ہے کہ جب صبح ہو جائے،

اور سورج نکل آئے اور جب سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہو تو اس جگہ کو کھودنا اور یہاں سے میری لاش نکالنا، اور پھر کچھ لکڑیاں لے کر ان پر اس کو رکھنا، پھر اس کو آگ لگا دینا۔ جیسے ہی میری لاش کی راکھ بنے گی۔ میرا اس دنیا سے واسطہ ختم ہو جائے گا اور میں موت کے بعد کی دنیا میں چلی جاؤں گی۔ مجھے اس کربناک زندگی سے رہائی مل جائے گی۔ اور لوگوں کی زندگیاں بھی محفوظ ہو جائیں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ اس دائرے کے اندر آہستہ آہستہ زمین کے اندر سماتی ہوئی غائب ہو گئی۔ کچھ دیر تک رونے اور سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں۔

بالآخر آوازیں آنا بند ہو گئیں ہر طرف اندھیرا چھا گیا صرف میرے پاس موجود موم بتی کی روشنی باقی تھی۔ وہ بھی اب بجھنے کو تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ بجھتی، میں جلدی سے کمرے میں آیا اور ایک دوسری موم بتی جلا دی۔ ساتھ ہی فجر کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ میرے دل کو تھوڑا سکون ہوا۔

اذان کے بعد میں نے وضو کر کے فجر کی نماز ادا کی۔ کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کی۔ اتنے میں پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ بھی اپنے گھونسلوں سے باہر نکل آئے تھے اور صبح کا والہانہ استقبال کر رہے تھے۔

میں نے صبح ہوتے ہی یہ سوچتے ہوئے کہ مذہب چاہے کوئی بھی ہو یا انسان چاہے کیسا بھی ہو۔ اس کے مذہب کا احترام، اس کی رسومات کا احترام اور خاص طور پر اس کی موت کے بعد لازم ہے کہ مذہب کے اعتبار سے اس کی آخری رسومات ادا کی جائیں۔

خیر اب یہ ضروری تھا کہ روپالی کی مشکل حل کی جائے۔

میں نے گھر میں موجود پرانی لکڑیوں کو اکٹھا کیا اور انہیں ترتیب سے اوپر نیچے رکھا اور پھر ہمت کر کے وہ جگہ جہاں روپالی نے نشاندہی کی تھی، وہاں کھودنا شروع کر دیا۔ واقعی کھدائی کرنے کے ساتھ ساتھ اندر سے ایک ڈھانچے کا وجود ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔ میرا دل کانپ کر رہ گیا۔

لیکن میں نے اپنی کوشش جاری رکھی کیونکہ روپالی نے کہا تھا کہ سورج جب پوری آب و تاب پر ہو تو اسے جلایا جائے کیونکہ اس وقت اس کی پوری قوت سلب ہو چکی ہوتی ہے۔ میں کھدائی کرتا گیا اور بالآخر ایک پورا انسانی ڈھانچہ میرے سامنے تھا۔ ڈھانچہ کی حالت بہت خستہ تھی، کئی جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا، خیر میں نے تمام ہڈیوں کو یکجا کر کے ایک صاف کپڑے پر رکھا، اس کے بعد اس کپڑے کو اٹھا کر لکڑیوں پر رکھ دیا۔

دوپہر کا وقت اور سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ لکڑیوں پر میں نے مٹی کا تیل ڈالا اور ماچس جلا کر ڈھانچے کو آگ لگا دی۔ کچھ ہی دیر میں سب کچھ جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

فضا سے ایک آواز آئی۔

”دھنے واد..... تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔“ اور آسمان پر ایک ہیولا اڑتا ہوا دور فضا میں جاتا دکھائی دیا۔ اور پھر آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔ میں نے نہا دھو کر تھوڑا آرام کیا۔ یونہی شام ہو گئی۔ میں نے ہوٹل جا کر کھانا کھایا چائے پی اور گھر آ کر سو گیا۔

لیکن روپالی کا خوف اب بھی میرے ذہن پر سوار تھا۔ سونے سے پہلے ایک دو مرتبہ میں سیڑھیوں کی جانب گیا لیکن وہاں روپالی کا نام و نشان نہ تھا۔ رات بھی خیر و عافیت سے گزر گئی اور پھر واقعی کئی راتیں خیر خیریت سے گزر گئیں۔ مجھے کسی قسم کا خوف وڈر کا بالکل بھی احساس نہ ہوا۔ روپالی چلی گئی تھی۔

میں چند دنوں بعد گھر کی صفائی ستھرائی کروانے کے بعد اپنی فیملی کو یہاں لے آیا۔ میں نے روپالی کے حوالے سے ان سے کوئی ذکر نہیں کیا اور اللہ کے فضل سے کوئی مسئلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ میری فیملی اور میں اس مکان میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

www.pdfbooksfree.pk

قاتل مردہ

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

کمرے میں ایک عجیب و غریب کتاب موجود تھی جس میں حقیقت میں موت چھپی ہوئی تھی، اس کتاب کے پڑھتے ہی لڑکی کی ایک خوفناک لرزا دینے والی چیخ بر آمد ہوئی اور وہ موت سے ہمکنار ہو گئی۔

خوف کی وجہ سے رگوں میں خون منجمد ہوتی اپنی نوعیت کی.....نا قابل فراموش کہانی

جب میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تو وہ میری طرف کمر کئے کھڑا تھا۔ میں نے بھی اس پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ گلی بالکل سنسان تھی اور اس وقت اس کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی چلتا ہوا گلی کے سرے پر بنے چرچ میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنے اسٹوڈیو کی کھڑکی بند کر دی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جلد ہی وہ شخص میرے ذہن سے محو ہو گیا۔

دوپہر تک موسم خاصا گرم ہو چکا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھولے اور باہر جھک کر تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ پھر مجھے نظر آ گیا وہ چرچ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اب مجھے اس میں کچھ دلچسپی ہونے لگی، لیکن اس وقت میرا ذہن اپنے کام کے متعلق ان گنت خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

میں دوبارہ ایزل پر لگے کینوس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جونہی میں مڑا، غیر ارادی طور پر میری نظریں دوبارہ اس سے ٹکرائیں۔ وہ بھی میری جانب متوجہ تھا۔ میں اسے غور سے دیکھنے کے لئے جونہی تھوڑا سا آگے جھکا، اس نے میری طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ لہرا دیا..... ''اوہ خدایا.....!'' خوف کی ایک سرد لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ اس کا استخوانی ہاتھ دیکھ کر میرے ذہن میں مردہ کیکڑے کا تصور ابھرنے لگا۔ اس کا چہرہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے ہڈیوں کے ڈھانچے پر محض کھال منڈھ دی ہو..... میں سمجھ نہیں سکا کہ مجھے اس سے خوف کیوں محسوس ہو رہا تھا، لیکن کچھ عجیب ضرور تھا۔ کہیں نہ کہیں کچھ گڑ بڑ تھی..... لیکن کہاں.....؟ میرا ذہن اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ سب میرا وہم بھی ہو سکتا تھا.....اس دوران وہ مڑ کر چرچ میں داخل ہو گیا۔

میں بھی اسے ذہن سے جھٹک کر دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہو گیا اور اپنی ماڈل کو ہدایات دینے لگا کہ وہ دوبارہ اسی حالت میں بیٹھ جائے جیسے کہ وہ پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر برش چلانے کے بعد مجھے احساس ہونے لگا کہ میں کینوس پر ماڈل کے صحیح زاویے اور نقوش ابھار نہیں پا رہا ہوں۔ حالانکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج ہر چیز غلط ہو رہی تھی۔ میں چاقو کی مدد سے کینوس پر لگے رنگ کھرچ کر درست کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا اور میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ماڈل کے خوبصورت اور پر گوشت چہرے کو میں نے کینوس پر منتقل کرتے وقت ہڈیوں کا

www.pdfbooksfree.pk

ڈھانچہ کیوں بنا دیا تھا۔

میں نے اپنی ماڈل ٹیزی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اسی پوز میں بیٹھی تھی۔ اپنے میکسیکن حسن، اسی حسین چہرے، صراحی دار گردن، لمبے خوبصورت بالوں اور زندگی کی رعنائیوں سے دمکتے گالوں کے ساتھ.....

''کیا..... مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''نہیں..... کچھ رنگ غلط لگ گئے تھے۔'' میں نے جواب دیا اب میں اسے کیسے بتاتا کہ میں نے کیا بنا ڈالا تھا۔

''کیا میرے پوز میں کچھ گڑبڑ تھی.....؟'' وہ دوبارہ پوچھنے لگی۔

''ایسی کوئی بات نہیں.....''

''اس کا مطلب ہے کہ میرا کوئی قصور نہیں.....''

''نہیں..... یہ سب میری اپنی غلطی ہے.....''

''اوہ..... مجھے بہت افسوس ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے اسے کہا وہ کچھ دیر آرام کرسکتی ہے۔ اس وقت تک میں کینوس کو کھرچ کر تصویر درست کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ٹیزی نے اٹھ کر اپنے کپڑے پہنے اور سگریٹ سلگاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

میں نہیں جانتا کہ کینوس خراب تھا یا رنگوں میں کوئی نقص تھا کیونکہ جتنا میں کینوس کو رگڑتا، رنگ اس پر اتنے ہی پھیلتے جاتے۔ میں کسی اودھ بلاؤ کی طرح مسلسل اپنے کام میں جٹا ہوا تھا۔ لیکن جتنا میں اسے درست کرنے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی بگڑتا چلا جاتا۔

تنگ آ کر میں نے اسے رگڑنا بند کردیا۔ لیکن اس وقت تک رنگ پورے کینوس پر پھیل چکے تھے۔ میں بری طرح تھک چکا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ کینوس میں کوئی نقص نہیں ہے اور نہ رنگ خراب ہیں، تو پھر یہ سب کیوں ہو رہا تھا؟

میں نے ٹیزی کو پکارا۔ وہ کمرے میں آ کر کرسی پر دراز ہوگئی اور ہوا میں سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے پوچھنے لگی ''کچھ بنا.....؟''

''نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ سب اس تیل کا قصور ہے جو میں نے رنگوں میں ملایا تھا۔''

''کتنے واہیات رنگ ہیں یہ.....!'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

''کیا تم نے پہلے کبھی مجھ سے ایسی غلطی سرزد ہوتے دیکھی ہے.....'' میں غصے سے بولا۔

''نہیں.....''

''تو پھر.....؟''

وہ کچھ نہ بولی اور اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا لیکن مجھے مسلسل ناکامی ہو رہی تھی۔ تنگ آ کر غصے سے میں نے سارے برش زور سے کینوس پر دے مارے۔

آواز سن کر وہ مڑی اور طنزیہ انداز میں مسکرانے لگی۔ ''واہ کتنے بڑے تخلیق کار ہو تم..... تین ہفتے اس پر محنت کی اور نتیجہ یہ رہا.....'' وہ کینوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

میں بے انتہا شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے خراب کینوس کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ٹیزی نے برش صاف کرنے میں میری مدد کی اور پھر گھر جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ اس دوران وہ مجھے غصے کے نقصانات پر لیکچر بھی پلاتی رہی لیکن پھر میرے چہرے پر غصے کے تاثرات دیکھ کر اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔

''میرا خیال ہے یہ سب گڑبڑ اس وقت ہوئی جب صبح تم نے کھڑکی کھولی تھی اور پھر کتنی ہی دیر اس عجیب و غریب اور خوفناک شخص کے بارے میں گفتگو کرتے رہے تھے جسے تم نے چرچ کے سامنے دیکھا تھا۔'' وہ اپنا خیال ظاہر کرنے لگی۔

''ہاں.....! ہوسکتا ہے اس نے تصویر پر جادو کردیا ہو.....'' میں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے مزاحاً بولا۔

''چھے بج چکے ہیں.....'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''میں جانتی ہوں.....'' وہ آئینے کے سامنے اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی۔

''میں تمہیں زیادہ دیر روکنا نہیں چاہتا.....'' میں کھڑکی پر جھکتا ہوا بولا لیکن پھر فوراً ہی بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ کیڑے جیسا آدمی پھر گلی میں موجود تھا۔ ٹیزی نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا اور برا سا منہ بناتی ہوئی وہ بھی کھڑکی پر جھک گئی۔

''کیا..... یہی وہ آدمی ہے جس نے تمہیں صبح سے خوفزدہ کر رکھا ہے.....؟'' وہ سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگی۔ میں نے کچھ بولے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت تک وہ بھوت نما شخص مڑ کر گلی کی دوسری سمت جانے لگا تھا۔

''میں نے اس کا چہرہ تو نہیں دیکھا لیکن وہ اچھا خاصا لگتا ہے.....'' ٹیزی نے میری طرف توجہ کئے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس کو دیکھ کر مجھے اپنا ایک خواب یاد آ گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے میں نے کیا خواب دیکھا.....؟''

''میں کیسے جان سکتا ہوں.....'' میں نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''تم بھی اس خواب میں ہو..... اس لئے یقیناً جانتے ہوگے.....'' وہ بولی۔

''ٹیزی.....! کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تمہارے خوابوں میں آتا ہوں.....'' میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''پہلے سنو تو.....'' وہ جھنجھلا کر بولی۔

''سناؤ.....'' میں کھڑکی سے ہٹ گیا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

ٹیزی دوبارہ کھلی کھڑکی کی چوکھٹ پر جھک کر کھڑی ہوگئی اور بڑی سنجیدگی سے بولنے لگی۔

''چند دن پہلے ایک رات جب میں اپنے بستر میں لیٹی تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میری سوچیں آوارہ ہو رہی تھیں، میں کسی ایک خاص موضوع کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ اگرچہ میں تمہارے لئے سارا دن پوز بنا کر تھک چکی تھی اور میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا مگر نجانے کیوں نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور پھر میں یقیناً سو گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ خواب تھا، مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ میں آنکھیں بند کئے لیٹی ہوں اور کوئی طاقت مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہو جاؤں۔ میں اٹھی اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ حد نظر تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی مجھے اندھیرے سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ باہر ہر چیز تاریکی کے سیاہ پردے میں لپٹی ہوئی تھی تب مجھے اچانک پہیوں کی چرچراہٹ سنائی دی۔ میں متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی یہ کیا ہے۔

کافی دیر آواز آتی رہی لیکن تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر مجھے ایک گھوڑا گاڑی دکھائی دی جو اسی گلی میں آ رہی تھی۔ ایسی گھوڑا گاڑی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور پھر یہ زمانہ ان گاڑیوں کا تھا بھی نہیں۔ وہ آہستہ آہستہ نزدیک آتی جا رہی تھی، پھر وہ میری کھڑکی کے نیچے سے گزری، میں نے دیکھا کہ وہ ایک میت گاڑی تھی۔ میں خوف اور دہشت سے کانپنے لگی۔ گاڑی بان نے آہستہ سے اپنا سر گھمایا اور وہ اپنی بالکل سفید بے نور آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا..... اس کی آنکھوں کی پتلیاں بالکل سفید تھیں۔ ایک دم میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں واقعی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور سردی سے کانپ رہی تھی لیکن گلی بالکل خالی تھی، میت گاڑی جا چکی تھی۔

یہی خواب میں نے دوبارہ چند دن پہلے دیکھا، اس دفعہ بھی جب میری آنکھ کھلی تو میں اسی طرح کھلی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس کے بعد کل رات بھی میں نے یہی خواب دیکھا۔ تمہیں یاد ہوگا، کہ کل رات کتنے زوروں کی بارش ہوئی تھی۔ جب میں جاگی تو حسب معمول کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور میرا شب خواب کا لباس بارش کے پانی سے پوری طرح بھیگ چکا تھا۔''

''لیکن میں اس سارے خواب میں کہاں

www.pdfbooksfree.pk

ہوں.....؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا میں گاڑی بان ہوں.....؟'' میں نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

''تم..... تم اس گاڑی میں رکھے تابوت کے اندر تھے..... لیکن زندہ تھے.....'' ٹیزی کا لہجہ حد درجہ خوفزدہ تھا۔

''تابوت میں.....'' میں چیخ اٹھا۔

''ہاں.....'' اس کی سرسراتی آواز سنائی دی۔

''تمہیں کیسے معلوم..... کیا تم نے بند تابوت کے اندر جھانک لیا تھا.....؟'' میرے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''نہیں..... جھانکا تو نہیں تھا..... لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ تابوت کے اندر تم ہو..... میرے ذہن میں یہ بات ایسے موجود تھی جیسے میں پہلے سے جانتی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ تم نے رات کو زیادہ کھانا کھا لیا ہوگا.....'' میں نے اپنے خوف کو جھٹکتے ہوئے ہنس کر کہا۔ لیکن اسی لمحہ ٹیزی کی دلخراش چیخ نے میرے قہقہے کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ کھڑکی میں دہشت سے کانپے جا رہی تھی۔

''کیا ہوا.....؟'' میں فوراً اس کی طرف لپکا۔

''نیچے گلی میں وہ آدمی..... موجود ہے.....'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''کون..... کون سا آدمی.....؟''

''وہی جو میت گاڑی چلاتا ہے.....'' اس کی آنکھیں دہشت کے مارے حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ میں نے فوراً بے اختیاری میں آگے بڑھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ ساری گلی سنسان پڑی تھی۔

''بے وقوف لڑکی.....! میرا خیال ہے تم بہت زیادہ تھک چکی ہو.....''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں وہ چہرہ پہچانتی نہیں.....'' وہ بڑبڑائی..... ''میں نے اسے تین دفعہ میت گاڑی میں اپنی کھڑکی کے نیچے سے گزرتے دیکھا ہے اور ہر دفعہ گاڑی بان نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بے انتہا سفید اور سپاٹ تھا۔ جیسے کہ وہ مردہ ہو اور اسے مرے ایک مدت گزر چکی ہو.....'' میں نے سہارا دے کر ٹیزی کو ایک کرسی پر بٹھا دیا اور پانی کا گلاس اسے پکڑاتے ہوئے دلاسہ دینے کے لئے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''دیکھو..... ٹیزی..... بہتر ہے کہ تم چند دن آرام کر لو۔ سارا دن ایک ہی پوز میں بیٹھے بیٹھے تم تھک جاتی ہو۔ اس لئے رات بھر بے تکے خواب دیکھتی رہتی ہو۔ میرا خیال ہے کہ جب تم چھٹیاں گزار کر واپس آؤ گی تو پھر ایسے بے سروپا خواب نہیں دیکھو گی۔ یہ سب تمہارا واہمہ ہے۔'' وہ ہلکے سے بولی..... ''اور اس آدمی کے بارے میں کیا خیال ہے جو گلی میں کھڑا تھا.....؟''

''وہ صرف ایک کمزور سا عام آدمی ہے.....''

''مسٹر فرہاد.....! میں قسم کھا سکتی ہوں کہ یہ وہی آدمی ہے جسے میں خواب میں میت گاڑی چلاتے دیکھتی ہوں.....'' ٹیزی اپنے رومال کو بری طرح اپنی انگلی پر لپیٹے جا رہی تھی۔ چند لمحے وہ خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے اپنے دستانے اٹھائے اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

دوسری صبح میں اخبار پھینکنے والے کی دستک پر نیند سے جاگا، اور اخبار ہاتھ میں پکڑ کر بے خیالی میں جا کھڑا ہوا۔ وہی کیکڑا نما بدصورت اور خوفناک شخص گلی میں ایک پول کے نیچے کھڑا تھا۔

''بتا سکتے ہو یہ آدمی جو نیچے گلی میں کھڑا ہے..... یہ کون ہے.....؟'' میں نے اخبار والے سے پوچھا۔

''یہ سامنے والے چرچ میں رات کا چوکیدار ہے۔ اسی خبیث کی وجہ سے مجھے چند دن پہلے تمام رات باہر گزارنا پڑی.....''

''کیا ہوا تھا.....'' میں چونک گیا۔

''اس رات میں نئی فلم کا آخری شو دیکھ کر

واپس آ رہا تھا، میرے ساتھ میری گرل فرینڈ جین بھی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ یہ منحوس چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہے۔ میری گرل فرینڈ چرچ میں دوران عبادت چندہ اکٹھا کرنے پر مامور ہے۔ اس شخص کی نگاہیں مسلسل جین کے جسم پر جمی ہوئی تھیں اور پھر اس نے ہمیں یوں حقارت سے دیکھا کہ مجھے غصہ آ گیا، ویسے بھی لڑکی ساتھ ہو تو مردانگی دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے اس لئے میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''سوکھے کیڑے.....! کیا دیکھ رہے ہو.....؟''

لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ بس طنزیہ انداز میں ہمیں دیکھتا رہا۔

''ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں تمہارا یہ پیالے جیسا سر توڑ دوں گا.....'' مجھے غصہ آ گیا۔ لیکن وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھا بے ہودہ انداز میں ہمیں دیکھتا رہا۔ میں غصے سے بے قابو ہو گیا اور آگے بڑھ کر اسے ایک گھونسا جڑ دیا۔ اف میرے خدایا..... اس کا سر برف کی مانند سرد اور پلپلا تھا۔

''پھر اس نے کیا کیا.....؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے کچھ نہیں کیا.....''

''اور..... تم نے.....؟''

وہ کھسیانے انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''میں بزدل نہیں ہوں..... لیکن اس وقت میں نجانے کیوں خوفزدہ ہو گیا تھا، بس پاگلوں کی مانند بھاگ نکلا۔''

''کیوں.....؟'' میں نے پوچھا۔

''نجانے کیوں.....'' اس نے کہا۔ ''خوف مجھ پر بری طرح طاری ہو گیا تھا۔''

جب تھامس چلا گیا تو میں نے دوبارہ کھڑکی سے جھانکا وہ استخوانی کیکڑا نما شخص ابھی تک چرچ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اب مجھے بھی اس سے ایک انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

''صبح بخیر مسٹر فرہاد.....'' ٹھیک نو بجے ٹیزی بھی آ گئی۔

جتنی دیر میں وہ پوز بنا کر ماڈل اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی، میں نے نیا کینوس تیار کر لیا۔ کافی دیر میں اس کا اسکیچ بناتا رہا۔ وہ بالکل خاموش تھی، لیکن جونہی میں دم لینے کو رکا اس نے بھی ادھر ادھر کی ہانکنا شروع کر دی۔

''کل رات بہت مزے کا وقت گزرا۔''

''وہ کیسے.....؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور ایک بلند قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''وہ میری دوست لیزا کا بھائی ہے۔ اس کا نام ایڈورڈ ہے، بہت دلآویز شخصیت کا مالک ہے۔'' اس کے بعد اس نے ایڈورڈ سے ملاقات کی لمبی چوڑی داستان چھیڑ دی اور جوشیلے لہجے میں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

''چلو اب ختم کرو.....'' میں نے رنگ تیار کرتے ہوئے جھنجھلا کر کہا، اور وہ کسی معصوم چڑیا کی طرح مسکراتی ہوئی پوز بنا کر کھڑی ہو گئی۔ دوپہر تک میں نے اپنا کام تقریباً مکمل کر لیا۔ ٹیزی کینوس دیکھتے ہوئے بولی۔

''اب تو یہ بہت بہتر ہے۔''

میں بھی اپنے کام سے کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ اس لئے اپنا لنچ میز پر سجا کر بیٹھ گیا۔ ٹیزی بھی اپنا کھانا لے کر آ گئی۔ ہم دونوں نے مل کر کھانا کھایا، ایک ہی بوتل سے مشروب پیا اور پھر ایک ہی لائٹر سے سگریٹ سلگایا۔ ٹیزی پچھلے تین سال سے میرے ساتھ کام کر رہی تھی اور اپنی تمام ماڈلز میں سے مجھے وہ سب سے زیادہ پسند تھی۔

ٹیزی صرف وہ کام کرتی تھی جسے وہ پسند کرتی یا جو اسے اچھا لگتا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے علیحدہ ہو جائے۔ اپنی اس خودغرضی کی وجہ سے میں اس کی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو نظر انداز بھی کر دیتا تھا۔

اب ہر وہ شخص جو میری طرح تنہا رہتا ہے۔ اسے وہی شخص اچھا لگتا ہے جو اس کے ساتھ باتیں کرے کچھ وقت دے۔ سلویا میں بھی یہ سب خوبیاں

www.pdfbooksfree.pk

تھیں لیکن ٹیزی اس سے بالکل مختلف تھی۔ وہ سلویا سے زیادہ پرخلوص تھی مگر اپنی اس حسین اور دلکش ماڈل سے مجھے خوف آتا تھا کہ کہیں وہ کسی کے عشق میں گرفتار نہ ہو جائے اور اگر ایسا ہو جائے تو میری تمنا تھی کہ تقدیر اسے اپنا فیصلہ خود کرنے دے۔ کیونکہ ارد گرد کے نوجوان اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

اب ٹیزی کرسی پر بیٹھے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا رہی تھی۔

''جانتی ہو کل رات میں نے بھی خواب دیکھا تھا.....'' میں نے اسے متوجہ کیا۔

''اسی پراسرار آدمی کے بارے میں.....؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں.....'' میں نے اسے خواب سنانا شروع کر دیا۔

''میں رات کو تقریباً دس بجے ہی سو گیا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جاگ گیا ہوں۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو سوئیاں آدھی رات کا اعلان کر رہی تھیں۔ درختوں کے پتوں میں سرسراتی ہوا گردش کر رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں ایک شیشے کے تابوت میں لیٹا ہوں اور یہ تابوت ایک گھوڑا گاڑی میں رکھا ہے جو پتھریلے راستے پر ہچکولے کھاتی چلی جا رہی ہے۔ میں اپنے قریب سے گزرتے لیمپ پوسٹ بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔ تابوت اتنا تنگ تھا کہ میں بالکل بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھے تھے اور میں باوجود کوشش کے انہیں ہلا نہیں سکتا تھا۔ میں سن سکتا تھا لیکن گویائی میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میں گاڑی میں جتے گھوڑوں کی ٹاپیں سن سکتا تھا حتیٰ کہ گاڑی بان کے سانس لینے کی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی۔ تب میرے کانوں میں کسی کھڑکی کے کھلنے کی آواز آئی۔''

''میں نے انتہائی کوشش کر کے سر کو ہلکا سا ایک سمت موڑا، اب میں اس جانب صاف دیکھ سکتا تھا، نہ صرف شیشے کے تابوت کے پار بلکہ گاڑی سے باہر بھی ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ خالی اور خاموش مکان مجھے نظر آ رہے تھے۔ روشنی تھی نہ کہیں زندگی کے آثار، لیکن ایک گھر کی پہلی منزل پر صرف ایک کھڑکی کھلی تھی۔ جس میں سفید لباس پہنے کوئی کھڑا نیچے گلی میں دیکھ رہا تھا اور..... وہ تم تھیں۔''

ٹیزی نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور آگے کو جھک آئی۔ اس کی خوبصورت چمکیلی آنکھوں میں حیرت کا سمندر تھا مگر وہ کچھ نہ بولی۔

''میں تمہارا چہرہ صاف پہچان سکتا تھا.....'' میں دوبارہ بولا۔ ''تمہارے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ پھر گھوڑا گاڑی آگے بڑھ گئی اور ایک تنگ و تاریک گلی میں مڑ گئی۔ تھوڑی دور جا کر گاڑی رک گئی، میں آنکھیں بند کئے کسی کا منتظر رہا۔ خوف اور بے قراری مجھ پر پوری طرح غلبہ پا چکی تھی۔ ہر طرف قبر کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھنٹوں اسی طرح گزر گئے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے قریب آ رہا ہے اور میری بند آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تب میں نے دیکھا کہ آٹے کی طرح سفید چہرے والا گاڑی بان، تابوت کے شیشے میں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔''

ٹیزی کی سسکیوں نے مجھے چونکا دیا وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

''کیا ہوا.....؟'' میں نے پوچھا پھر کہنے لگا..... ''دیکھا ٹیزی! تمہارے اس بے سروپا خواب نے میرے اعصاب پر بھی برا اثر ڈالا ہے جس کی وجہ سے میں نے واہیات خواب دیکھا، لیکن تم کیوں کانپ رہی ہو۔ چرچ کے اس چوکیدار سے نفرت کو ذہن پر اس طرح سوار کر لیا تھا کہ اب وہ ہمیں خوابوں میں بھی تنگ کرنے لگا ہے۔''

ٹیزی نے اپنا سر دونوں بازوؤں میں چھپا لیا اور یوں سسکیاں بھرنے لگی جیسے اس کا دل پھٹ جائے۔ میں اس کے قریب پہنچا اور اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر بولا

www.pdfbooksfree.pk

"مجھے معاف کردو ٹیزی.....! میرا ارادہ تمہیں خوفزدہ کرنے کا نہیں تھا۔ تم بہت حساس لڑکی ہو۔ لگتا ہے تم خوابوں پر بہت زیادہ یقین رکھتی ہو۔"

وہ آہستگی سے مجھ سے لپٹ گئی اور اپنا سر میرے شانے پر ٹیک دیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"کم آن ٹیزی.....! اب بس بھی کرو..... آنکھیں کھولو اور ذرا مسکرا دو۔" میں اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

اس نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھولیں اور عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے گلنار ی ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

"کیا بات ہے..... تم ابھی تک خوفزدہ ہو.....؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں..... لیکن اپنے لئے نہیں....."

"کیا..... میرے لئے؟" میں نے نامعلوم خوشی سے پوچھا۔

"ہاں..... تمہارے لئے....." اس نے سرگوشی کی۔ اس کے ریشمی لب میرے کانوں کی لو کو چھو رہے تھے۔ میں بے ساختہ ہنسنے لگا لیکن جیسے ہی اس کے مفہوم سمجھا، کسی پتھر کی مانند اپنی جگہ پر جامد ہو گیا۔ میں اس کے اس اظہار کو ہنسی میں بھی اڑا سکتا تھا اس کو سمجھا سکتا تھا کہ مجھ سے محبت اس کی حماقت ہوگی لیکن میرا جواب میرے خیالات سے زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا اور میں نے بولنے کے بجائے اس کے اس احساس کا جواب اپنے ہونٹوں سے دیا۔

☆.....☆.....☆

شام کو میں اپنے معمول کے مطابق چہل قدمی کے لئے پارک میں نکل گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں یا ٹیزی کو۔ محبت کے جذبے کو تو میں بہت پہلے اپنے ماضی میں دفن کر چکا تھا لیکن کیا ہمیشہ کے لئے.....؟ میرے دل میں کسی شک نے سر ابھارا۔

"نہیں.....!" امید کی آواز سنائی دی۔

پچھلے تین سال سے میں یہ آواز سن رہا تھا اور اپنے گھر کی دہلیز پر اس کی آہٹ کا منتظر تھا۔

"کیا..... سلویا مجھے بھول گئی ہے.....؟"

"نہیں....." امید نے دوبارہ پکارا۔

میں ایک بے کیف زندگی بسر کر رہا تھا۔ تنہا صرف اپنے مصوری کے شوق کے ہمراہ باقی سب کچھ ماضی کے جنگل میں کھو چکا تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب تو میں دن والی حرکت پر پچھتا بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن افسوس اور شرمندگی کے خیالات رہ رہ کر میرے دل میں ابھر رہے تھے۔ یہ میرے غرور کی تسکین تھی یا کوئی حیوانی جبلت، میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا اب میں چاہتا تو اس کا دل نہیں توڑ سکتا تھا۔ اس نے میرے لئے کوئی متبادل راستہ چھوڑا ہی نہیں تھا۔

میں ایک ایشیائی ہوں، اس وقت میں بہت چھوٹا تھا جب اپنے ایک چچا کے ہمراہ میں انگلستان چلا آیا کیونکہ وہ یہاں ایک متمول گھرانے میں ملازمت کرتے تھے۔ مگر اپنے والدین کی کوئی یاد باقی نہیں ہے۔ بس اتنا یاد ہے جتنا چچا نے بتایا اور بقول ان کے اس دنیا میں والدین کے بعد وہی میرا سہارا تھے۔ یہاں انہوں نے ایک چینی نژاد مصور یو انگ وان کے ہاں مجھے بھی ملازمت دلا دی۔ وہ چینی بھی اس دنیا میں تنہا تھا اس نے مجھے مصوری کے تمام اسرار اور رموز سکھا دیئے۔ چینی مصور کے مرنے کے بعد اس کے اسٹوڈیو اور چند کتابوں کا میں مالک بن گیا اور تصویریں بنا کر اپنا روزگار کمانے لگا۔

شاید میں بزدل انسان ہوں کہ کسی کا دل نہیں توڑ سکتا۔ میں اس جلد بازی کی محبت سے بچنا بھی چاہتا تھا لیکن اس کی میں جرات نہیں کر پا رہا تھا۔

میں اسے کیسے سمجھاتا کہ "ایڈورڈ" اس کے لئے بہترین ساتھی ثابت ہو سکتا ہے مگر مجھے یقین تھا کہ وہ میری ایک نہ سنتی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کا وطیرہ یہی رہا تو وہ کبھی شادی نہیں کر سکے گی۔ میں اسے پیار سے

راہ پر لا سکتا تھا لیکن مجھے یہ بھی علم تھا کہ یہ کس قدر مشکل کام ہے۔

اگر میں اس کے ساتھ شادی کر لوں تو وہ یقیناً ہمیشہ ناخوش رہے گی کیونکہ سلویا کے بعد میں کسی عورت کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتا تھا۔

بے شمار خیالات میرے ذہن میں امڈ رہے تھے۔ میں نیم دائرے میں درختوں کے ساتھ ساتھ پارک میں ٹہل رہا تھا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کا ساتھ دوں گا..... میں گھر پہنچ گیا اور کپڑے بدلنے لگا تو میز پر پڑے کاغذ پر میری نگاہ پڑی۔ یہ ایک نئی فلم کے پریمیئر شو کی ٹکٹ تھی جو سنیما کی انتظامیہ نے مجھے بھی بھیجی تھی۔ ذہنی تناؤ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔

اس وقت صبح کاذب نمودار ہو رہی تھی، جب میں سنیما سے واپسی پر گھر کے لئے روانہ ہوا۔ اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے میں گنگناتا ہوا پیدل ہی چلتا جا رہا تھا۔ راستے بالکل سنسان تھے ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ کہیں کسی ذی روح کا نشان نہیں تھا۔ میں درختوں کے بیچ میں سے گزرنے لگا۔ جیسے ہی چرچ کے قریب پہنچا مجھے ایک ہیولہ سا سیڑھیوں پر بیٹھا دکھائی دیا۔ جونہی میں اس کے قریب سے گزرا وہ کچھ بڑبڑایا۔ نجانے مجھ سے مخاطب تھا یا خود کلامی کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ کوئی پتھر مار کر اس کی کھوپڑی کھول دوں لیکن میں چلتا رہا۔

اپنے ڈپارٹمنٹ میں پہنچ کر بستر پر گر گیا۔ وہ عجیب بڑبڑاہٹ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ آواز واضح ہونے لگی اور میں اس کی بڑبڑاہٹ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ الفاظ میری سمجھ میں آنے لگے۔

"کیا تم زرد پھول حاصل کر چکے ہو.....؟"

"کیا تم زرد پھول حاصل کر چکے ہو.....؟"

"کیا تم زرد پھول حاصل کر چکے ہو.....؟"

میں جھلا گیا آخر اس کا کیا مطلب ہے پھر میں اس پر لعنت بھیج کر سو گیا۔ خواب میں، میں نے وہی منظر دیکھا جو میں پہلے بھی دیکھ چکا اور ٹیزی کو سنا چکا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، صبح ہو چکی تھی سورج، خاصا اوپر آ چکا تھا۔ میں کپڑے بدل کر اپنے اسٹوڈیو آ گیا۔ ٹیزی اپنے کام پر آ چکی تھی اور اب کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ والہانہ انداز میں اٹھی اور بل کھاتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ چند لمحوں کے لئے ہم دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے..... اس کے احمریں لب پہلے کی طرح گرم اور زندگی کی حرارت سے بھرپور تھے۔ کچھ لمحوں بعد میں نے آرام سے اسے اپنے آپ سے علیحدہ کیا اور بولا۔

"آؤ..... آج میں تمہیں ایک نئی چیز دکھاؤں گا۔" اور اسے لے کر وارڈ روب کے قریب پہنچ گیا اور ایک لباس نکالا جو مسلمان خواتین پہنتی ہیں۔ میں نے اپنے چچا کے پاس ایک خاتون کی تصویر دیکھی تھی جو بقول ان کے میری چچی تھیں، اس خاتون نے ایسا لباس پہن رکھا تھا۔ جو بعد میں مجھے لندن میں لگنے والی ایک ایشیائی لباس کی نمائش میں دکھائی دیا اور مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے فوراً خرید لیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنی کسی ماڈل کو یہ لباس پہنا کر اس کی ایک شاہکار تصویر بناؤں گا مگر مجھے کوئی ایسی ماڈل ملی ہی نہیں جو اس لباس کی شان کے قابل ہو۔ اس لباس پر گوٹے کناری کا کام کیا ہوا تھا۔ ٹیزی اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی۔ اس نے کپڑے میرے ہاتھ سے جھپٹ لئے اور اوٹ میں جا کر اسے پہننے لگی۔ جب وہ سامنے آئی تو میں ششدر رہ گیا لمبے سیاہ خوبصورت بال۔ اس کے پاؤں میں بہترین سوزن کاری سے مرصع جوتے تھے جو لباس کے ساتھ ہی میں نے خریدے تھے۔ لباس کے گھیرے پر چاندی کے تاروں سے پھول بنے ہوئے تھے۔ چھوٹی سی مراکشی جیکٹ اس کا نمکین حسن دوبالا کر رہی تھی۔ وہ میرے قریب آن کھڑی ہوئی اور مسکرانے لگی۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سونے کی زنجیر نکالی جس میں دل کی شکل کا ایک لاکٹ تھا۔ اسے میں نے اس کے

www.pdfbooksfree.pk

گلے میں ڈال دیا۔

"یہ تمہارے لئے ہے ٹیزی.....!"

"میرے لئے.....؟" اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

"ہاں تمہارے لئے..... اور..... اب جاؤ اور پوز بنا کر کھڑی ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک دلفریب مسکراہٹ سے مجھے نوازا اور بھاگ کر ایک ڈبہ اٹھا لائی جس پر جلی حروف میں میرا نام لکھا تھا۔

"میرا ارادہ تھا کہ شام کو واپسی کے وقت میں تمہیں یہ دوں گی لیکن اب مجھ سے انتظار نہیں ہوتا....." اس نے ڈبہ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

میں نے ڈبہ کھولا تو سرخ ریشمی کپڑے میں لپٹے دو خوب صورت موتی میرے سامنے تھے، جن پر کسی اجنبی زبان کے حروف لکھے ہوئے تھے۔

"یہ میں ایک یادگار کے طور پر تمہیں دینا چاہتی تھی....." اس نے کہا اور جلدی سے ان موتیوں کو میرے کوٹ کے کالر پر ٹانک دیا۔

"یہ کیا ہے..... کاہے کو اتنی قیمتی چیز خریدی....." میں بولا۔

"میں نے اسے خریدا نہیں ہے....." وہ ہنسنے لگی۔

"پھر..... کہاں سے لیا....."

تب اس نے مجھے بتایا کہ کیسے موتی اسے سرراہ گرے ہوئے ملے تھے۔ ہر جگہ اشتہارات دیئے۔ لیکن کسی نے ان کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا۔

"یہ چند دن پہلے کی بات ہے، اسی دن میں نے میت گاڑی کا خواب پہلی دفعہ دیکھا تھا۔" اس نے وضاحت کی۔

☆.....☆.....☆

وہ دن میرے لئے بہت برا ثابت ہوا کیونکہ جب میں کینوس کو ایزل سمیت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر رہا تھا تو چکنے فرش پر سے میرا پاؤں پھسل گیا اور میں دونوں کلائیوں کے بل گر گیا۔ بری طرح موچ آئی اور میں برش تھامنے سے بھی معذور ہو گیا۔ میں وقت گزاری کے لئے اپنے اسٹوڈیو میں ادھر ادھر بے مقصد پھرنے لگا اور ادھوری تصاویر اور اسکیچوں کو دیکھنے لگا۔ حتیٰ کہ میں تھک کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگایا اور قالین کو پاؤں کے انگوٹھے سے کھجانے لگا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اس کی بوندیں کھڑکی کے شیشے پر جلترنگ بجا بجا کر میری اکتاہٹ میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ٹیزی کھڑکی کے پاس بیٹھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں میرے لئے ہمدردی تھی۔

جلد ہی میں اکتا کر کسی ایسی چیز کو تلاش کرنے لگا جو وقت گزاری میں میری معاون بن سکے۔ اپنی لائبریری کی تمام کتابیں میں پڑھ چکا تھا۔ یہ میرے اسی چینی استاد کی تھیں اور زیادہ تر فن مصوری پر تھیں مگر کئی ایک چینی دیومالائی ادب پر بھی تھیں۔ کسی انجانی ترغیب سے متاثر ہو کر میں کتابوں والی الماری کے قریب آ گیا اور کہنی سے دھکیل کر اس کے پٹ کھول دیئے۔ ہر کتاب کو میں اس کے رنگ اور جسامت و ضخامت سے بھی پہچان سکتا تھا۔ کتابوں پر نظر دوڑاتے ہوئے بوریت دور کرنے کے لئے میں سیٹی بجانے لگا۔

میں ڈرائنگ روم میں جانے کے لئے مڑا تو میری نگاہیں اچانک اس سے ٹکرائیں وہ کتاب سانپ کی کھال میں مجلد تھی اور الماری میں سب سے اوپر والے ریک میں سب سے آخر میں پڑی ہوئی تھی۔ میں اسے پہچان نہ پایا۔

اتنی بلندی کی وجہ سے اس کی پشت پر لکھے زرد رنگ کے الفاظ بھی میرے لئے ناقابل فہم تھے۔ میں نے ٹیزی کو پکارا۔

"یہ کیا ہے.....؟" میں نے پوچھا۔

اس نے ریک پر چڑھ کر نام پڑھا اور پھر بولی..... "زرد شہنشاہ....."

میں ایک لمحے کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ اسے یہاں کون لایا۔ یہ یہاں کیسے آئی؟ کافی عرصہ

پہلے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کبھی اس کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میرے چینی استاد نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ مجھے نصیحت کی تھی کہ میں اس کے بعد کبھی اس کتاب کو نہ کھولوں اور نہ پڑھوں کیونکہ یہ قدیم چینی منتروں کا وہ مجموعہ ہے جو روحوں کو اس دنیا میں بلانے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے اور ان کی مدد سے لوگ اپنے حریفوں اور دشمنوں سے بدلے لیا کرتے تھے مگر یہ روحیں اپنا عوضانہ اور ہرجانہ وصول کئے بغیر نہیں جاتیں اور اگر ان کی یہ شرط پوری نہ ہو تو وہ کسی نہ کسی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ میں اس کتاب میں چھپی ٹریجڈی سے بخوبی واقف تھا۔ مگر اپنے استاد کی نشانی سمجھ کر میں کتاب کو تلف کرنے یا کہیں پھینکنے کی ہمت تو نہ کر سکا مگر اس تہ خانے میں پرانے کباڑ کے نیچے دور چھپا دیا۔ اس کتاب کی سیاہ دھبوں والی زہریلی جلد پر میری نظریں جم سی گئی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی ناگ کو دیکھ رہا ہوں۔

چند دن پہلے یہ مجھے تمہارے تہ خانے سے ملی تھی۔ میں نے لاکر اس الماری میں رکھ دی کہ شاید تم نے غلطی سے اسے نیچے تہ خانے میں چھوڑ دیا تھا۔ یہ کافی قیمتی اور قدیم لگتی ہے۔" ٹیزی نے وضاحت کی۔

"کیا تم نے اسے کھول کر دیکھا....." میں نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

"صرف پچھلا صفحہ....." وہ بولی۔

"اسے مت چھوؤ..... ٹیزی نیچے اتر آؤ....." میں چلا اٹھا۔

میرے اس انتباہ سے اس کا اشتیاق مزید بڑھ گیا اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا، اس نے کتاب اٹھالی اور قہقہے لگاتے ہوئے پورے اسٹوڈیو میں گویا ناچنے لگی۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ میرے زخمی ہاتھوں کی پہنچ سے باہر تھی۔

"ٹیزی.....! میں تقریباً چیخ پڑا۔" میں پوری طرح سنجیدہ ہوں۔ خدارا اس کتاب کو پرے پھینک دو، اس کو مت کھولو....." یہ کہتے ہوئے میں لائبریری میں

کنجوس

ایک کنجوس آدمی کو بجلی کا کرنٹ لگا۔

وہ دھڑام سے نیچے فرش پر گر گیا۔ اس کی بیوی نے پوچھا کہ۔ "تم ٹھیک تو ہو۔"

کنجوس:۔ "مجھے چھوڑو، اور یہ دیکھو کہ یونٹ کتنے گرے ہیں۔"

(مجاہد لیاقت۔ ملتان)

داخل ہوا لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ لائبریری بالکل خالی تھی۔ میں نے اسے بیڈ روم، ڈرائنگ روم، کچن، باتھ روم، غرضیکہ ہر جگہ ڈھونڈا لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ میں واپس لائبریری آ گیا اور دوبارہ سے ایک ایک کمرے میں تلاش کرنے لگا۔ بالآخر نصف گھنٹے بعد میں اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا وہ اوپر اسٹور میں ایک الماری کے پیچھے دبکی بیٹھی تھی..... "زرد شہنشاہ" اس کے قدموں میں کھلی پڑی تھی۔

میں نے ٹیزی کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ "زرد شہنشاہ" کو کھول چکی تھی۔ میں نے ٹیزی کو بدقت تمام اٹھایا اور اسے لاکر اسٹوڈیو میں لٹا دیا۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی اور جب میں نے اسے لیٹ جانے کو کہا تو وہ کوئی لفظ کہے بغیر صوفے پر ڈھیر ہو گئی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں اس کا سانس آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگا پتا نہیں وہ سو گئی تھی یا ویسے ہی آنکھیں موندے لیٹی تھی۔

کافی دیر میں اس کے پہلو میں خاموش بیٹھا رہا لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ بالآخر میں اٹھا اسٹور میں گیا اور ادھ کھلی کتاب کو بدقت تمام اٹھایا۔ میرے زخمی ہاتھوں کو وہ بے حد وزنی محسوس ہو رہی تھی میں اسے اٹھا کر اسٹوڈیو میں لے گیا اور صوفے کے پاس قالین پر بیٹھ گیا، کتاب کو کھولا اور اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ اس کے الفاظ پر غور کرتے رہے۔ لفظ جو کہ روشن

www.pdfbooksfree.pk

اور نمایاں تھے جن پر نغمگی تھی جو کہ زہریلے ہیروں کی مانند چمکتے تھے۔ جنہیں عقلمند اور بے وقوف یکساں طور پر سمجھ سکتے تھے جو کہ ہیروں سے زیادہ قیمتی تھے موسیقی سے زیادہ نغمہ بار اور موت سے زیادہ افسوس ناک تھے۔

ٹیزی نے کراہ کر آنکھیں کھولیں، میں نے جلدی سے کتاب کو بند کیا اور جھک کر ٹیزی کو دیکھنے لگا۔ ٹیزی کی نظریں میرے کوٹ کے کالر پر ٹنکے موتیوں پر پڑی تو وہ خوفزدہ ہوگئی اور مجھ سے التجا کرنے لگی کہ میں دونوں زرد موتی نوچ کر باہر پھینک دوں لیکن نجانے کیوں میں نے اس کی بات نہ مانی۔

پورے مکان پر سناٹا چھایا ہوا تھا حتیٰ کہ گلی بھی سنسان تھی۔ ٹیزی اندھیرے میں سیاہ دھبے کی مانند دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں کی گرفت میں تھے مجھے پتا تھا کہ وہ میرے احساسات کو ایسے ہی جانتی اور پڑھ سکتی ہے جیسے کہ میں خود..... ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں الجھے ہوئے تھے کہ اچانک گلی میں بہت دور کوئی آواز سنائی دی۔

آواز آہستہ آہستہ نزدیک آنے لگی۔ یہ پہیوں کی چرچراہٹ تھی، نزدیک..... اور نزدیک حتیٰ کہ یہ آواز گھر کے دروازے کے سامنے آگئی اور خاموش ہوگئی میں فوراً کھڑکی کی طرف لپکا، باہر ایک سیاہ میت گاڑی کھڑی تھی۔ اس کا دروازہ کھلا پھر بند ہوگیا میں نے فوراً آگے بڑھ کر گھر کا دروازہ بند کردیا اور اندر سے چٹخنی چڑھادی لیکن میں جانتا تھا کہ کوئی چٹخنی، کوئی تالا، کوئی دروازہ اس حیوان کے راستے میں حائل نہیں ہوسکتا تھا جو کہ ''زرد پھول'' لینے آیا تھا اور اب میں اس کے قدموں کی آواز سن سکتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ دروازے کے عین قریب آگیا۔ چٹخنی ایک جھٹکے سے ٹوٹ کر نیچے گر گئی اور وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔

وہ مجھے ایک ہیولے کی مانند نظر آرہا تھا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی فضا ایک دم سرد ہوگئی۔ اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کا جسم انتہائی سرد تھا۔ میں چیخنے لگا اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ لیکن میرے زخمی ہاتھ میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس نے میرے کوٹ کے کالر پر سے زرد موتی بے دردی سے نوچ لئے اور مجھے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔

جیسے ہی میں نیچے گرا، اس نے ٹیزی کی چیخ سنی اور پھر اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی..... زرد شہنشاہ اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ آن موجود ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں لیٹا ہوا سب سن اور دیکھ سکتا تھا مگر میری گویائی میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میں ان ڈاکٹروں کو دیکھ سکتا تھا جو میرے آس پاس کھڑے تھے ان کے خیال میں مجھے اب دوا کی نہیں بلکہ کسی مذہبی پیشوا کی ضرورت تھی۔

میں جانتا تھا کہ سب جاننے کے لئے بے تاب ہو رہے ہیں کہ اس گھر میں کیا سانحہ پیش آیا ہے۔ انہیں میڈیا کی ضرورت پوری کرنے کے لئے انتہائی سنسنی خیز مواد مل گیا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ ٹیزی مر چکی ہے اور میں مر رہا ہوں..... جب لوگوں نے چیخیں سنیں اور وہ اس گھر میں داخل ہوئے تو انہیں ایک بے ہوش آدمی اور دو لاشیں نظر آئیں ایک ٹیزی اور ایک چرچ کے چوکیدار کی..... ڈاکٹروں نے جب دونوں لاشوں کا معائنہ کیا تو وہ چرچ کے چوکیدار کی لاش کا معائنہ کرتے ہوئے حیرت سے چلا اٹھے ڈاکٹروں کے اندازے کے مطابق چوکیدار کی لاش کئی سو سال پرانی تھی یعنی اسے مرے کئی سو سال گزر چکے تھے۔

یہ آخری بات تھی جسے میں سمجھا، میرے ذہن پر تاریکی چھا رہی ہے ہر سو تاریکی کی دبیز چادر پھیلتی جا رہی ہے..... میرا خیال ہے کہ میں مر رہا ہوں، میں مر رہا ہوں.....

دھوکا

اقصیٰ رباب۔اوکاڑہ

رات کے گھپ اندھیرے میں سامنے جلتی ہوئی آگ میں اچانک شعلے بڑھکنے لگیں اور پھر چشم زدن میں سامنے موجود عامل کے گرد پھیل گئے، عامل کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا بھی بھیانک انجام ہوا جو اس جگہ موجود تھے۔

حرص و لالچ میں مبتلا دولت کے متلاشی لوگوں کا انجام بھیانک ہوتا ہے، ثبوت کہانی میں موجود ہے

وہ چاروں بچپن سے ہی گہرے دوست تھے۔ حماد، احمد، مہرین اور مدیحہ۔ مہرین اور احمد ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، اتنے سالوں پرانا ساتھ تھا۔ انہوں نے تعلیم بھی ساتھ ہی مکمل کی تھی اور اب ان چاروں کا ارادہ تھا کہ کوئی بزنس بھی مل کر کیا جائے۔ چاروں نے پارٹنر شپ کی اور ایک گارمنٹس فیکٹری لگالی۔ چاروں اپنا کام تندہی سے سرانجام دیتے مگر فیکٹری خسارے میں جارہی تھی۔ ان کی فیکٹری کے سامنے ایک بہت قدیم برگد کا درخت تھا اور اس کے نیچے ایک بزرگ بیٹھا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ انہیں بھگانے کے بہت سے طریقے اختیار کر چکے تھے مگر وہ پہاڑ کے مانند اپنی جگہ ایستادہ تھے۔ مہرین اور احمد منگنی کر چکے تھے۔ مدیحہ حماد کو بہت پسند کرتی تھی اور اس بات کی خبر حماد کو تھی۔ مگر حماد نجانے کیا سوچتا تھا کہ سب کچھ جان کر بھی انجان بن رہا تھا۔ مدیحہ اکثر حماد کے بارے میں سوچتی تو اس کا انداز اسے الجھن میں مبتلا کر دیتا۔ نجانے حماد کے دل میں کیا تھا۔

حماد ایک دن فیکٹری پہنچا تو نجانے اس کے دل میں کیا بات آئی۔ وہ برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھے بزرگ کے پاس جا بیٹھا۔ بزرگ کی آنکھیں بند تھیں، حماد کچھ دیر کشمکش کی کیفیت میں بیٹھا رہا، تھوڑی دیر بعد اٹھا اور واپس پلٹنے لگا کہ ایک دم اسے بزرگ کی آواز سنائی دی۔ ''بس! اتنا سا ہی انتظار کرنے کی ہمت تھی؟'' وہ چونک کر واپس پلٹا اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا جواب دے۔ بزرگ کی آنکھیں ویسے ہی بند تھیں۔ ''آؤ ہمارے پاس بیٹھو حماد! بہت پریشان ہو.....''

حماد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بزرگ کے منہ سے اپنا نام سن کر۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ میرا نام حماد ہے؟ اور یہ کیسے پتا چلا کہ میں پریشان ہوں.....؟'' حماد نے حیرت سے سوال کیا۔ اب بزرگ آنکھیں کھول کر حماد کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ ''ہمارا علم ہمیں سب کچھ بتا دیتا ہے کہ کون کیا ہے.....؟ اس لئے ہمیں تمہارا نام معلوم ہے اور جہاں تک تعلق ہے تمہارے پریشان ہونے کا! ہم جیسے لوگ جو دنیا کو تیاگ بیٹھے ہیں جنہوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ ہماری طرف یہ دنیا والے اسی وقت آتے ہیں جب پریشان ہوں۔''

حماد بزرگ کے پاس بیٹھ گیا۔ ''آپ نے بالکل سچ فرمایا میں بہت پریشان ہوں۔ میرے پاس اب پیسہ نہیں ہے۔ فیکٹری خسارے میں جارہی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

مجھے دولت کی ضرورت ہے۔"

"دولت چاہیے تمہیں تو اس کے لئے قربانی بھی دینی پڑے گی۔" بزرگ نے سفاکی سے کہا۔

"میں تیار ہوں۔ آپ بتایئے مجھے کیا قربانی دینی پڑے گی مجھے ہر قیمت پر دولت چاہیے۔" حماد نے پختہ عزم کے ساتھ جواب دیا۔

"ایک قبرستان میں کسی تازہ قبر پر بیٹھ کر تمہیں چلہ کاٹنا پڑے گا۔ کرلو گے؟" بزرگ نے حماد سے پوچھا۔ حماد نے حیرت سے بزرگ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر چلا گیا۔ بزرگ کے لبوں پر تبسم پھیل گیا۔

فیکٹری خسارے میں جارہی تھی۔ لگتا تھا شاید اسے بند کرنا پڑے۔

دو دن بعد بہت سوچنے کے بعد حماد اس بزرگ کے پاس چلا گیا۔ "مجھے قبرستان میں چلہ کاٹنا منظور ہے آپ مجھے طریقہ بتادیں۔" حماد نے سر جھکا کر کہا۔

"سوچ لو اچھی طرح۔ جان بھی جاسکتی ہے۔" بزرگ نے حماد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔" حماد نے بھی بزرگ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

بزرگ نے اسے سارا طریقہ سمجھا دیا کہ "تازہ قبر پر جاکر اپنے گرد ایک دائرہ بنالینا اور کچھ بھی ہوجائے جو عمل میں نے تمہیں بتایا ہے نہ تو اس کا ورد کرنے اور نہ تم اس دائرے سے نکلنا ورنہ تم مارے جاؤ گے۔"

حماد کو خوف محسوس ہوا مگر دولت کی ہوس خوف کے مقابلے میں جیت گئی۔

حماد آدھی رات کو ایک قبرستان کی طرف چل پڑا۔ رات کا وقت، قبرستان کی جان لیوا خاموشی، دل کو تہہ وبالا کرتی قبریں۔ کئی بار اس کے دل نے کہا کہ واپس بھاگ جاؤ مگر دماغ بضد تھا کہ مجھے دولت چاہیے۔ ذرا سی آہٹ پر کانپتا لرزتا وہ ایک تازہ قبر پر پہنچ ہی گیا۔ اس نے ایک گول دائرہ بنایا اور اس دائرے کے درمیان بیٹھ کر وہ ورد شروع کردیا جو اسے بزرگ نے بتایا تھا۔ تھوڑی دیر تو سکون سے گزر گئی اور اس کے دل کو بھی ذرا سہارا ملا مگر اس کے بعد اسے زمین سے سانپ نکلتے نظر آئے۔ جہاں بھی دیکھتا سانپ نکل کر اس کی طرف آرہے ہیں۔ پہلے تو وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگنے لگا مگر ایک دم سے اسے بزرگ کی کہی ہوئی بات یاد آگئی کہ کچھ بھی ہوجائے اس دائرے سے باہر مت نکلنا۔ وہ خود کو سمجھا کر بڑی مشکل سے بیٹھ گیا۔

سانپ تیزی سے اس کے دائرے کی طرف بڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی اس کا دل جیسے اپنی پوری رفتار لگا رہا تھا دھڑکنے کے لئے۔ اسے دل دھڑکنے کی آواز بہت واضح سنائی دے رہی تھی۔ عجیب وسوسے آرہے تھے کہ اگر وہ دائرے کے اندر آگئے تو اس کا کیا بنے گا؟ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ اسے برگد والے بزرگ نے مروایا ہے۔ اسے اب اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا کہ دولت کے لالچ میں وہ موت کے منہ میں چلا آیا۔ اتنی بڑی حماقت کر بیٹھا کہ شاید دنیا کو بتا بھی نہ سکے۔

مگر یہ کیا سانپ دائرے سے ٹکرا کر ختم ہوتے جارہے تھے اس نے مزید جوش سے ورد شروع کردیا۔

ایک چیخ بلند ہوئی اور انسانی کھوپڑیاں اس کی طرف تیزی سے آآ کر گرنے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو بہت مشکل سے روکے ہوئے تھا ورنہ اس کے اندر سے تو خوف کے باعث یہی آواز تھی کہ دوڑو۔ اگر یوں عمل بیچ میں چھوڑ کر جانے سے اس کی موت کا امکان نہ ہوتا تو وہ نجانے کب کا چلا جاتا وہاں سے۔ مگر اب وہ پھنس چکا تھا۔

دفعتاً ہیبت ناک شکلیں نمودار ہونے لگیں۔ کسی نے اپنا سر کاٹ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ کسی کی زبان اس کے پاؤں تک لٹکی ہوئی تھی کسی کی شکل اتنی بھیانک تھی۔ کسی کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ حماد کو تو اپنی موت کا پختہ یقین ہوگیا کہ وہ صبح کا سورج نہیں دیکھ سکے گا۔

ورد اس کی زبان پر جاری تھا۔ اب اسے اپنی آنکھیں کھولنا دشوار تھا۔ نیند اس پر غالب آنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کی پوری توانائی نیند کو بھگانے میں صرف ہورہی تھی۔

وہ تو قبرستان میں تھا، اس نے حیران ہوکر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ تو کوئی خوبصورت سا گھر تھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے کچی مٹی کے بجائے سنگ مرمر کا دیدہ زیب فرش تھا۔ سامنے بیش قیمت صوفہ تھا اور اس پر ایک خوبصورت حور برا جمان تھی۔ اس کے حسن نے حماد کی آنکھیں خیرہ کردیں۔ وہ لڑکی بھی حماد کی طرف دیکھ کر اندازِ دلربائی سے مسکرائی اور اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ حماد کسی پروانے کی طرح لڑکی کی طرف بڑھنے لگا مگر دفعتاً اسے کچھ یاد آیا اور وہ وہیں بیٹھ گیا اور ورد کرنے لگا، اسی پل اس لڑکی کی شکل بہت مکروہ ہوگئی سب کچھ بدل گیا۔ حماد وہیں قبرستان میں تھا اور صبح کی کرن نمودار ہورہی تھی۔ صبح کے آثار ظاہر ہوتے ہی حماد کو بزرگ کی آواز سنائی دی کہ اب تم باہر آسکتے ہو تمہارا چلہ پورا ہوگیا۔ حماد کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اب وہی چڑیل اس کی غلام تھی۔

اور حماد جو چاہتا اس سے کرواسکتا تھا۔ حماد بہت دولت مند ہوگیا۔ اس نے دو فیکٹریاں اور بنالیں۔ اب مہرین، احمد کے بجائے حماد کی طرف زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ احمد نے پہلے تو اسے اپنی نظر کا دھوکہ سمجھا۔ اپنا وہم قرار دیا۔ مگر کب تک وہم قرار دیتا۔ ایک دن وہ مہرین کو لے کر اوپر ٹیرس پر گیا۔ "مہرین ہماری منگنی کو کافی وقت گزر گیا۔ ہمیں اب شادی کرلینی چاہیے۔" احمد نے مہرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مہرین نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ کرلیں گے شادی بھی۔ ابھی مجھے بزنس پر پورا دھیان دینا ہے۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے نیچے اتر گئی۔ احمد حیران اسے جاتا دیکھتا رہا۔ یہ وہ مہرین تو نہیں تھی جسے وہ جانتا تھا یہ جو کوئی بھی تھی احمد کے لئے اجنبی تھی۔

کچھ دن بعد ہی مہرین نے احمد پر اور حماد نے مدیحہ پر یہ بتا کر بم پھوڑ دیا کہ حماد مہرین سے اور مہرین حماد سے شادی کررہے ہیں۔ دونوں نے سنگدلی کی انتہا پر پہنچ کر احمد اور مدیحہ کو اپنے نکاح پر مدعو بھی کرلیا۔ مدیحہ کو تو حماد سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں تھا مگر احمد تو مہرین سے پوچھ سکتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اتنی بے وفائی کیسے کرسکتی تھی۔ مگر وہ خاموش تھا۔ جب زیادتی کرنے والے کو خود احساس نہ ہو تو کہہ کر احساس نہیں دلایا جاسکتا۔ دونوں بڑے حوصلے سے مہرین اور حماد کی شادی پر گئے۔ انہیں خوشیوں کی ڈھیروں دعائیں دے کر اپنے اپنے غم خانے میں پلٹ گئے۔

حماد نے مہرین سے کہا۔ "چلو میرے ساتھ، ہمیں کہیں جانا ہے۔" مہرین نے حیرت سے بھنویں اٹھا کر پوچھا کہ کہاں.....؟ "ہمیں ایک وظیفہ کرنا ہے اس کے بعد ہم دونوں کے پاس اتنی دولت ہوگی کہ ہماری آنے والی کئی نسلیں بیٹھ کر کھاسکتی ہیں۔" حماد نے جوش اور خوشی سے بتایا۔

مہرین کی آنکھوں میں بھی لالچ کی چمک جاگی۔ دونوں برگد والے بزرگ کے پاس پہنچ گئے۔ برگد والے بزرگ آگ کا الاؤ جلا کر بیٹھے تھے۔ وہ دونوں بھی پاس آکر بیٹھ گئے۔

بزرگ نے اپنا عمل شروع کردیا۔ ابھی عمل کرتے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ نجانے کہاں سے بادلوں کا ٹکڑا آگیا اور اس کی بارش سے الاؤ بجھ گیا۔ بزرگ کا چہرہ سیاہ ہوگیا۔ وہ چلائے "بدبخت تو نے اپنے ساتھ مجھے بھی تباہ کردیا۔ تیرا ستیاناس ہو۔ میں نے کہا بھی تھا کہ لڑکی وہ ہو جو تجھ سے شدید محبت کرتی ہو تبھی عمل کامیاب ہوگا۔ تو نے مجھے دھوکا دیا۔"

تھوڑی دیر بعد ہی ان کے گرد شیاطین کا ہجوم اکٹھا تھا جو انہیں نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان کا وجود ایسے ختم ہوگیا جیسے وہ دونوں کبھی روئے ارض پر تھے ہی نہیں۔ لالچ کی سزا دونوں کو مل گئی تھی۔ اور جتنی دولت پیچھے بچ گئی تھی وہ احمد اور مدیحہ کے لئے بہت تھی۔ وہ اپنی انتھک محنت کے بل بوتے پر اپنے بزنس کو آسمان تک لے گئے اور ملک کے امیر ترین لوگوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

www.pdfbooksfree.pk

بلیک ٹائیگر

ایم الیاس

قسط نمبر 1

دھشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بہاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاھکار کھانی۔

تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیں گے

آخر سات دنوں کی بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد جانو حیدر تارا کو اغوا کرنے میں کامیاب ہوگیا جس کی امید نہیں تھی کہ وہ کامیاب اور کامران ہوجائے گا۔

سات دنوں میں تارا نے جانو حیدر اور اس کے گروہ کے چار آدمیوں کو نگنی کا ناچ نچایا تھا۔ وہ ان کے ہاتھ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس نے ان خطرناک اور جرائم پیشہ گروہ کے چاروں بدمعاشوں کو چکمہ دے دیا تھا..... اور بے وقوف بنایا تھا۔ انہیں اندازہ نہ تھا کہ تارا جتنی حسین ہے اس سے کہیں اس قدر ذہین اور ہوشیار ہے کہ کوئی بھی سوچ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی انہیں معلوم تھا کہ وہ انہیں بے وقوف بنائے گی..... ایک طرح سے الو بنا کر رکھ دے گی۔ وہ کسی صحرائی لومڑی کی طرح ہوشیار اور چالاک ہے۔ کسی بلا سے کم نہیں ہے۔

آج تک کوئی عورت تو کیا مرد ایسا نہیں تھا جسے انہوں نے اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس میں زیادہ سے زیادہ ایک یا دو گھنٹے لگے ہوں۔ وہ ایسا جال بچھاتے کہ شکار ان سے بچ کر نہ جانے پاتا۔

انہوں نے بھی قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ تارا کو اغوا کر کے یرغمال نہیں بنالیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے..... اس لیے کہ یہ ان کی شکست تھی۔ اس لڑکی نے تو ان کی ناک کاٹ کر رکھ دی تھی۔

اسے سہ پہر کے وقت اغوا کیا تھا اور اپنے اڈے پر لا کر بالائی منزل کے کمرے میں قید کر دیا تھا۔ انہیں رات گیارہ بجے کا انتظار تھا تاکہ اس کی نامناسب قسم کی فلم بنائی جائے۔

تارا نہایت، ذہین، پرکشش اور بیس برس کی لڑکی تھی۔ کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی تھی..... اس کا کزن تارا سے شادی کا خواہش مند تھا۔ وہ بھی بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ تارا اس سے شادی کر لیتی اگر اس کی حرکتیں شرمناک نہ ہوتیں..... لڑکیاں اور عورتیں اس کی کمزوری تھیں۔ ایک مشہور و معروف ماڈل گرل اس کی داشتہ بنی ہوئی تھی۔ تارا آخر ایسے مرد سے کیوں اور کس لیے شادی کرتی اس نے اپنے کزن جعفر سے کہہ دیا تھا کہ ''وہ اس سے شادی کرنے کے بجائے راستے کے کسی عام آدمی سے شادی کرنے کو ترجیح دے گی..... اسے مرنا پسند ہے لیکن شادی کرنا نہیں..... اس کی دنیا میں کروڑوں کی جائیداد، کاروبار اور لاکھوں کی آمدن تھی۔ لیکن ماں باپ اور کوئی بھائی بہن نہیں تھا..... جب اس کا باپ ایک عام آدمی تھا۔ دولت مند نہ تھا تب کوئی رشتہ دار نہ تھا..... اب وہ دولت مند تھا..... اب

www.pdfbooksfree.pk

تارا نے ایک شخص کو پسند کرلیا تھا جسے دولت کی ہوس نہ تھی۔ وہ اس کی فرم میں ہی ملازمت کررہا تھا۔ آئندہ ماہ دونوں شادی کرنے والے تھے۔

جانو حیدر اس شہر نہیں بلکہ پورے دیش کا بہت ہی خطرناک مجرم پیشہ تھا۔ بڑے بڑے مجرم اور خطرناک بدمعاش اس کے نام سے کانپتے تھے۔ پولیس اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے اس لیے ڈرتی تھی کہ جانو حیدر کی پشت پر اعلیٰ حکام تھے۔ اس کے کئی اڈے تھے..... اس کے کالے دھندوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ کئی شراب خانہ چلا رہا تھا..... شہر کے سارے منشیات فروش اور اسمگلرز کے علاوہ جرائم پیشہ اور پولیس افسران بھی اس کے ہمدرد تھے..... اس کا اپنا ایک اڈا تھا اس پر خاص اور مخصوص لوگ اور دوست ملاقات کے لئے آتے تھے۔ اس جگہ لڑکیوں کو بلیک میل کرنے کے لئے تصویریں بھی بنائی جاتی تھیں۔ وہاں کئی بیڈ رومز تھے جس میں فلم کی شوٹنگ ہوتی تھی۔ ایک طرح سے اسے اسٹوڈیو بنایا ہوا تھا۔ جدید خاص ترین اور بے حد قیمتی کیمرے تھے۔ فلم اسٹوڈیو میں ایک کیمرامین نادر تھا۔ وہی کیمرامین ہر قسم کے مناظر ایسے زاویوں سے بناتا تھا کہ دیکھنے والا عش عش کر اٹھتا۔ تصویریں اور فلمیں ملک اور پڑوسی ملک میں جانو حیدر نہ صرف فروخت کرتا بلکہ یہاں افسران کو خوش کرنے لیے پیش کرتا۔ اور وہ لڑکیاں بھی پہنچا دی جاتیں۔

جعفر نے پانچ لاکھ روپے کی ایک خطیر رقم کے عوض جانو حیدر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ ایک نمونہ فلم بنائے۔ اس میں سب سے پہلے اپنا منہ کالا کرے گا..... پھر جانو حیدر اور اس کے ساتھی..... اس کے دوست چاہیں تو وہ بھی سرفراز ہو سکتے ہیں۔ عکس بندی کا وقت رات گیارہ بجے تھا۔ کیمرامین نادر ایک اسٹوڈیو میں ایک فلم کی عکس بندی میں مصروف تھا۔ اس نے گیارہ بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔

تارا کمرے میں بند تھی۔ لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس نے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ وہ آخری لمحے تک اپنی زندگی اور عزت پر آنچ آنے نہیں دے گی۔ بدمعاشوں کا مقابلہ کرے گی..... وہ جانتی تھی بلکہ اس کا ایمان بھی تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ اس نے رونے دھونے کی بجائے ایسی کوئی تدبیر سوچنا شروع کیا کہ اس قید خانہ سے کس طرح فرار ہوا جاسکتا ہے۔ وہ دولت مند تھی اور حسن شباب اور کشش کے خزانے سے مالا مال تھی۔ وہ شہر کی حسین ترین لاکھوں میں شمار کی جاتی تھی۔

اس نے کمرے کا جائزہ لیا..... اس کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو احاطے کی طرف کھلتی تھی۔ اس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ مکان پہاڑ تلی کے سرسبز و شاداب علاقے میں تھا..... پہاڑی پر بہت بڑا بنگلہ تھا۔ یہاں کوئی سڑک قریب سے گزرتی نہیں تھی اور لوگوں کی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ کسی کو مدد کے لیے بھی پکارتی مگر اس کی آواز نہ پہنچتی..... ایک غسل خانہ تھا۔ اس میں بھی ایک کھڑکی تھی۔ اس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اگر اس میں سلاخیں نہ بھی ہوتیں تو اس کا کمرے سے باہر نیچے آنا ناممکن سا تھا۔ اسے ایک خیال آیا۔ اس نے جو ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سات گز کی تھی ساڑی کو کسی سلاخ سے باندھ کر اترنے کے باوجود بھی کئی فٹ نیچے کودنا تھا۔ نیچے کی زمین پتھریلی اور ناہموار تھی۔ اسے شدید چوٹ آسکتی تھی۔ معذور ہونے کا زیادہ اندیشہ تھا۔

اس نے ایک سلاخ کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام کر ہلانا شروع کیا۔ اس کھڑکی سے کل چھ عدد بڑی مضبوط اور موٹی سلاخیں تھیں۔ تین سلاخیں نکل جانے کی صورت میں وہ آسانی سے اس خلا سے نکل کر لٹک یا کود سکتی تھی۔ لیکن اسے اپنی ساڑی کو سلاخوں سے باندھنا ہوگا..... لیکن اسے پیٹی کوٹ میں بے حجابی کی حالت میں کوئی سواری لے کر جانا ہوگا۔ سلاخ ہلاتے ہلاتے اس کی نگاہیں زمین پر مرکوز ہو جاتیں اور اس خیال سے کہ اندھیرے میں کودنے سے ذرا سی غفلت اور کوتاہی پر وہ منہ کے بل گرتی اور

توازن قائم نہ ہو سکا تو نہ صرف اس کی پیشانی اور چہرے پر زخم آجائیں گے بلکہ آنکھیں بھی نوکیلے پتھروں سے پھوٹ سکتی ہیں..... کیا معلوم سنگین حادثہ پیش آنے پر وہ موت کے منہ میں بھی جاسکتی ہے۔

وہ تھک جاتی تھی اور پسینہ پسینہ ہو جاتی اور اس کے ہاتھ اور بازو شل ہو جاتے۔ ذرا دم لے کر پھر وہ اپنی کوشش شروع کر دیتی وہ چاہتی تھی کہ دن کی روشنی میں نکل جائے..... اور پھر وہ بڑی احتیاط سے کام بھی لے رہی تھی کہ کہیں اس کا شور کوئی نہ سن لے۔ اس لیے کہ وہ اس سے ملحق ہال تھا جس میں کئی بد معاش نہ صرف جوا کھیل رہے تھے بلکہ شراب کا دور بھی چلا رہے تھے۔ اور ان کی فاتحانہ ہنسی اور قہقہوں کا شور فضا میں گونج رہا تھا اس نے ساڑی کے پلو سے سلاخ کو تھاما ہوا تھا۔ اس کے سینے میں سانس پھولنے لگا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ دھڑکتے سینے پر رکھ کر دیوار سے پشت ٹکا دی۔

کمرے میں ایک پلنگ تھا جس پر نہ تو چادر تھی نہ تکیہ..... ایک اکلوتی کرسی اور تپائی پر ایک پانی سے بھری پلاسٹک کی بوتل اور ایک پلاسٹک کا گلاس تھا۔ وہ اب تک نصف بوتل پی چکی تھی۔

جب سہ پہر ڈھل چکی تب اس نے اپنی کوشش کو کام یابی سے ہمکنار ہوتے دیکھا..... سلاخ میں جنبش سی ہوئی۔ کچھ دیر کی کوشش سے سلاخ پیچھے سے اکھڑ گئی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اس خوشی میں ایک گلاس پانی پیا اور تھوڑی دیر تک اکلوتی کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔

پھر اسے ایک خیال آیا کہ یوں نہ وہ دروازے پر دستک دے کر کسی بہانے سے کسی بد معاش کو اندر بلا کر اس سلاخ سے اس کا سر پھاڑ دے اور کمرے سے باہر ان بدمعاشوں سے بھڑ جائے۔ اس لیے کہ اب اس کے ہاتھ ایک ہتھیار لگ گیا ہے۔ وہ ان بد معاشوں سے مقابلہ کرسکتی ہے۔ کیوں کہ لوہے کی یہ سلاخ بہت موٹی اور مضبوط ہے اس سے کسی بھی بدمعاش کا بھرتہ بنایا جاسکتا ہے..... لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے اس خیال کو دل سے نکال دیا..... کیوں کہ ان بدمعاشوں کے پاس چاقو اور پستول بھی ہیں..... اور پھر وہ ایک نہیں کل پانچ ہیں..... اگر ایک بدمعاش مسلح ہوتا تو کسی خوف اور خدشے کی بات نہ تھی۔ وہ اس پر باآسانی قابو پالیتی..... لہٰذا اس نے خیال کو ذہن سے نکال دیا۔

بس اب ایک ہی تدبیر..... ایک ہی صورت اور راستہ ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں۔

کھڑکی سے کودا جائے..... تخت یا تختہ زندگی یا موت۔

جعفر..... پانچ بد معاش..... اور کیمرا مین..... اسے کھلونا بنانا چاہتے ہیں..... یہ کردار فلم میں اسے گیدڑ بن کر نوچتے رہیں گے۔

اس ہتک..... بے وقعتی..... زیادتی اور ذلت سے ہزار حد درجہ موت بہتر ہے..... موت آتی ہی تو آئے موت کو تو وہ خوشی سے گلے لگا لے گی۔ دنیا میں ایک عورت کے لیے عزت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے اچانک باہر کے کمرے میں آوازیں سنیں۔ اس نے لپک کر جا کر دیوار سے کان لگا دیئے۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ وہ غور سے سننے لگی۔

''آؤ بھائی..... آؤ میرے یار ٹائیگر..... بنگال ٹائیگر.....'' جانو حیدر کی آواز دوسری آوازوں میں شامل تھی..... بہت دنوں بعد آئے ہو..... کہاں رہے.....؟''

''جانو بھائی.....! میں نے اندر قدم رکھا بھی نہیں کہ تم نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی.....'' ٹائیگر نے ہنستے ہوئے جواب دیا کیا یہ امتحانی پرچہ ہے جو تمام سوال حل کرنا ہوں گے.....؟''

''ہاں'' جانو حیدر بولا۔ ''میں اور میرے یہ دوست بھی سوچ رہے تھے کہ ادھر ٹائیگر آیا نہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

''ایسا کوئی موقع نہیں ملا ادھر آنے کا......'' اس نے جواب دیا۔ ''اب ملا تو چلا آیا۔''

''کیسے آنا ہوا......؟ کیا کوئی تگڑا شکار ہاتھ لگا ہے؟'' جانو حیدر نے پوچھا۔

''میرا دوست ہاشم ٹیکسی چلاتا ہے۔ اس نے ایک خاندان سے چٹا گانگ جانے کا کرایہ طے کیا تھا...... عین وقت پر وہ بیمار پڑ گیا اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس خاندان کو چٹا گانگ چھوڑ آؤں۔''

''وہ خاندان کوچ، ریل گاڑی اور ہوائی جہاز سے بھی جا سکتا تھا۔'' جانو حیدر نے کہا۔

''شادی کے جہیز کا بہت سارا سامان تھا جس کا کرایہ بہت بنتا تھا...... کوچ، اور ٹیکسی میں اسے جانا نہیں تھا۔ کیوں کہ قیمتی زیورات اور کپڑے تھے۔ ...... چلو...... اس بہانے تم سے ملنے اور ذرا ستانے آ گیا۔'' ٹائیگر نے کہا۔

''بڑے اچھے موقع پر آئے ہو۔'' جانو حیدر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''گولڈن چانس......''

''آج رات گیارہ بجے ہمارے ہاں ایک انتہائی جذباتی اور سنسنی خیز فلم کی عکس بندی ہوگی......'' جانو حیدر کہنے لگا اور اس فلم کی ہیروئن نہ صرف ایک کروڑ پتی کی بیٹی ہے...... بلکہ اس کی ماہانہ اس سے پندرہ لاکھ کی آمدنی ہے...... اس لڑکی سے اس کا کزن شادی کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی انکاری ہے...... اس کا کزن اس سے جی بہلانے کے بعد بلیک میل کر کے ماہانہ پانچ لاکھ وصول کرنا چاہتا ہے...... وہ آج کی رات اس کے ساتھ پہلی سہاگ رات منائے گا۔ اس کے بعد اور میرے ساتھی...... اس کی عکس بندی ہوگی...... تم بھی اس فلم میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہو...... عکس بندی کراؤ یا نہ کراؤ...... تمہاری مرضی...... لیکن دوست ایسی حسین لڑکیاں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہوتی ہیں۔ تم اس لڑکی کو کبھی نہ بھول سکو گے؟''

''شکریہ......'' ٹائیگر نے کہا۔ ''مجھے نو بجے یہاں سے ایک سواری ڈھاکا لے جانا ہے۔ میں تمہاری میزبانی کا شرف حاصل نہیں کر سکوں گا...... اس لڑکی کو اغوا کرنے کا معاوضہ وہ شخص کیا دے رہا ہے؟''

''پانچ لاکھ روپے دے گا......'' جانو حیدر نے کہا۔ پچاس ہزار پیشگی دے چکا ہے...... زندگی میں پہلی بار ایسا شکار ٹکرایا۔ کبھی کسی لڑکی نے اتنا پریشان نہ کیا...... کسی بھی شکار کو شکار کرنے میں دو ایک گھنٹے بھی نہیں لگے...... لیکن یار! اس نے پورے پانچ چھ دن کسی صحرائی لومڑی کی طرح چالاکی اور عیاری سے چکمہ دیا۔ ہاتھ نہیں آئی...... تین گھنٹے پہلے تو اسے اغوا کر کے لائے ہیں...... اس کمینی نے تگنی کا ناچ نچا کر رکھ دیا۔''

''وہ ہے کہاں......؟'' ٹائیگر نے تجسس سے پوچھا۔

''برابر والے کمرے میں ہم نے اسے بند کیا ہوا ہے۔'' جانو حیدر نے جواب دیا۔ ''کیا تم اسے دیکھنا پسند کرو گے؟''

''نہیں......'' ٹائیگر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ صرف اس لیے میں نے پوچھا تھا کہ...... وہ بہت ہوشیار اور چالاک ہے...... اس کمرے سے فرار ہو گئی تو کیا کرو گے......؟ بہت تگڑا شکار ہے۔ پانچ لاکھ ٹا کا کم نہیں ہوتے ہیں۔''

''اس کمرے میں صرف ایک کھڑکی ہے جس میں گرل لگی ہے۔'' جانو حیدر بتانے لگا یہ کل پانچ چھ سلاخیں ہیں۔ ہر سلاخ بہت موٹی ہے......'' نازک اندام اسے اکھاڑنا تو در کنار اسے ہلا تک نہیں سکتی۔''

''جانو حیدر کے دوست اور ساتھی بدرو نے پوچھا کیا پینا پسند کرو گے......؟ بیر...... وہسکی...... ایم......''

''تم لوگ جانتے ہو میں شراب نہیں پیتا ہوں۔'' ٹائیگر نے کہا کولڈ ڈرنک پلا دو بس۔''

''آنا کیسے ہوا......؟'' جانو حیدر نے کہا۔

''مجھ سے کوئی کام تو نہیں ہے......؟''

''تمہیں معلوم ہے کہ جب کبھی میں یہاں آیا اور وقت ہوا تو دو چار بازیاں کھیل کر ضرور جاتا ہوں۔ چوں کہ میرے پاس وقت ہی وقت ہے اور مجھے رات نو بجے تک وقت گزارنا ہے۔ اس لیے میں یہ سوچ کر آیا کہ چلو تمہارے ہاں وقت گزاری کر لوں۔''

''اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔'' جانو حیدر بولا۔ میں فون کر کے تین چار موٹی آسامیوں کو بلا لیتا ہوں...... لیکن وہ اس وقت کے لئے ہیں کھیلنے والے کے پاس دو لاکھ کی رقم ہو...... تمہارے پاس کتنی رقم ہے......؟''

''ایک لاکھ دس ہزار روپے......'' ٹائیگر نے کہا۔ یہ تم ایک لاکھ قرض دے دو...... اگر میں پوری رقم ہار گیا تو یہاں میرا دوست الطاف ہے۔ میں اس سے رقم منگوا کر دے دوں گا...... تم الطاف کو جانتے ہو نا......؟''

''ٹھیک ہے۔'' جانو حیدر نے سر ہلا دیا۔ ''ویسے یار...... تم کو میں نے کبھی ہارتے دیکھا نہیں...... تم قسمت کے بڑے دھنی ہو......''

جانو نے جن چار آدمیوں کو کھیلنے کے لئے بلایا تھا ان میں ایک اس کا خاص آدمی تھا...... شارپر تھا۔ جانو حیدر اور وہ جس کا نام ثروت تھا ایک نمبری شاطر اور شارپر تھا۔ پتوں کو بلینے میں بڑا ماہر تھا۔ جانو حیدر اور وہ مل کر کھیلنے والوں کو پتوں کی مدد سے لوٹتے تھے۔ پتوں پر نشان ہوتے تھے۔ یہ نمبر صرف ان دونوں کو ہی نظر آتے تھے۔ لیکن وہ ٹائیگر کو آج تک لوٹ نہ سکے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ ٹائیگر ہار جائے لیکن وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے تھے...... لیکن جانو حیدر اور اس کے ساتھی ثروت نے غیر محسوس اشاروں، اور کن انکھیوں میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آج ہر قیمت پر ٹائیگر کو جیت کر جانے نہ دیا جائے۔

''یہ ٹائیگر کون ہے......؟'' تارا نے لمحے بھر تک سوچا۔ اسے آواز اور گفتگو سے اندازہ ہو کہ یہ شخص تعلیم یافتہ اور نفیس مزاج ہے اس کے علاوہ زیادہ عمر کا لگتا بھی نہیں ہے...... اس کے تصور نے ایک پیکر تراشا...... خوب صورت وجیہہ اور قدرے دراز قد...... خوش پوش بھی......'' بدمعاش معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا تعلق متوسط طبقے سے لگتا تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ کھیل شروع ہوا تو اس میں بڑی گرم جوشی تھی۔ آخر کیوں نہ ہوتی...... آخر اس کھیل میں دس، پچاس کے نوٹ نہیں بلکہ پانچ سو، ہزار اور پانچ ہزار کی مالیت کی نوٹوں سے ہو رہا تھا۔ اس کھیل میں کسی کا پلا بھاری ہوتا تو کسی کا ہلکا پڑ جاتا...... یہ نشیب و فراز اور قسمت کا کھیل تھا۔ ہار جیت اس کھیل میں مقدر ہوتی تھی۔

یہ صورت حال ٹائیگر کے ساتھ بھی تھی۔ وہ مسلسل ہار رہا تھا۔ وہ بڑی بازی نہیں لگا رہا تھا۔ جب پچیس ہزار کی رقم رہ گئی تب کھیل کا پانسہ پلٹا...... پھر اس کی جیت مسلسل ہوتی گئی...... جانو حیدر نجانے کیا کیا جتن کر ڈالے۔ اس کی کوئی چال کامیاب نہ ہو سکی۔ ٹائیگر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ٹھیک نو بجے کھیل سے ہاتھ روک لے گا۔ جب وہ نو بجے اٹھا تو تین لاکھ چالیس ہزار کی رقم جیت چکا تھا۔ ٹائیگر کبھی اتنی بڑی رقم جیت کر نہیں اٹھا تھا۔ جانو حیدر ایک لاکھ اسی ہزار اور اس کا ساتھی ایک لاکھ بیس ہزار ہار چکا تھا...... باقی دوسرے بھی خسارے میں گئے۔

ٹائیگر نے تمام بڑے نوٹوں کو گڈیاں بنا کر جیبوں میں رکھا اور جانو حیدر سے بولا۔

''اگر میں نے سواری سے معاملہ طے کیا ہوا نہ ہوتا تو ساری رات یہ شغل جاری رکھتا...... شوٹنگ بھی دیکھتا...... بہر حال میں جلد آؤں گا پھر محفل میں شرکت کروں گا...... ویسے تمہارا گھر میرے لیے بڑی قسمت والا ہے۔''

پھر وہ سب سے ہاتھ ملا کر باہر آیا۔ ٹیکسی باہر کھڑی تھی۔ رات کے گہرے سناٹے میں انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز گونجی پھر رفتہ رفتہ آواز معدوم ہوتی گئی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

تارا نے دل میں دعا کی کہ..... کاش! ٹائیگر پولیس کو خبر کردے کہ اسے جانو حیدر نے اغوا کر کے یرغمال بنا رکھا ہے..... لیکن وہ جانتی تھی کہ ٹائیگر ایسا نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ اس سے واقف نہیں ہے اور پھر وہ کیوں جانو حیدر کے معاملے میں ٹانگ اڑانے لگا۔

جانو حیدر نے ٹائیگر کے اٹھنے سے پہلے اپنے ان دو آدمیوں کو جو کھیل رہے تھے اشارہ کر دیا تھا کہ وہ ٹائیگر سے نہ صرف ساری رقم چھین لیں بلکہ اسے قتل کر کے اس کی لاش کسی گڑھے میں دبا دیں..... اس کی ٹیکسی کو لے آئیں تاکہ دو ایک دن بعد ٹھکانے لگا کر مال وصول کر لیں۔ ٹیکسی کو جنوب کی سمت جانا تھا..... لیکن ٹائیگر نے جانو حیدر کے ہاں سے نکل کر اسے ایک ایسی جگہ کھڑا کر دیا تھا کہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ اور پھر گہرے اندھیرے نے ٹیکسی کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

کوئی نصف گھنٹے کے بعد ٹائیگر..... جانو حیدر کے بنگلے کے وسیع احاطے کے ایک درخت پر بیٹھا ہوا اندر جھانک رہا تھا۔ احاطے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا لیکن جن کمروں میں روشنی ہو رہی تھی وہ دیکھ رہا تھا۔ جانو حیدر بڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا..... ٹائیگر اس پر بجلی گرا گیا تھا..... لیکن وہ دوسری طرف خوش بھی تھا کہ ٹائیگر یہ رقم ہضم نہ کر سکے گا۔ رقم ٹیکسی اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس کے ساتھی اسے چھوڑیں گے بھی نہیں۔

آخر تارا اپنی کوشش اور جدوجہد سے کامیاب ہو گئی تھی۔ اب صرف دس بجے تھے۔ اس نے اپنی ساڑی اتاری اور باقی سلاخوں سے باندھ لیا۔ پھر وہ اسے پکڑ کر آہستہ آہستہ اترنے لگی۔ وہ دو تین فٹ بمشکل اتر پائی تھی کہ ساڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس لیے کہ ساڑی ریشمی تھی۔ وہ تیزی سے آ رہی..... اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گرتی دو مضبوط ہاتھوں نے اسے سنبھال لیا۔ پھر اسے دبوچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تارا نے دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا..... گو کہ وہ زمین پر گر کر موت کے منہ میں جانے والی تھی..... لیکن اس کی زندگی بچی تو لیکن اب وہ کسی نامعلوم بدمعاش کی گرفت میں تھی جو کسی پھول کی طرح پامال کر کے پھینک سکتا تھا۔ اس بدمعاش نے اسے قابو میں کر کے بے بس کر دیا تھا اس سے جو چاہے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔

دوسرے لمحے اس شخص نے اس کے کان میں سرگوشی میں بڑی آہستگی سے کہا۔

''مس تارا.....! آپ منہ سے بالکل بھی آواز نہ نکالیں..... میں آپ کو یہاں سے نکال کر لے جا رہا ہوں۔ اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں۔''

پھر اس شخص نے تارا کو اپنی گرفت سے نکال کر ایک طرف کھڑا کر دیا۔

تارا کو ایسا لگا جیسے وہ کوئی سہانا سا خواب دیکھ رہی ہے..... پھر دوسرے لمحے محسوس ہوا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ اسے دوسری مرتبہ ایک نئی زندگی ملی ہے..... مسیحا نے اسے بچا لیا۔ اس نے دل میں خدا سے گڑگڑا کر اپنی عزت اور سلامتی کے لیے جو دعا مانگی تھی وہ اللہ نے سن لی..... ایک نیک شخص کو مسیحا بنا کر بھیج دیا..... یہ کون تھا.....؟ کس لیے اس نے اس کی مدد کی.....؟ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

اس نے فوراً ہی اپنے بال، بلاؤز اور پیٹی کوٹ کو ٹھیک کیا۔ اس شخص نے کچھ پوچھنے کی مہلت نہیں دی۔ جب اس نے تارا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو تارا نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ پھر وہ اسے عقبی دروازے سے باہر لے کر آیا اور گہرے اندھیرے میں لے کر اسے ایک سمت بڑھا۔ دس فٹ کی مسافت کے بعد اسے لے کر ایک ٹیکسی کے پاس جا کر رکا جو درختوں کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ پھر اس نے اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ جب اس نے بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر وہ شخص اسٹیرنگ پر بیٹھ گیا۔ پھر گاڑی کا انجن غرایا اور پھر گاڑی گھپ اندھیرے میں

کچے راستے سے نکل کر پکی سڑک پر آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد تارا نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کہیں کوئی اس کے تعاقب میں تو نہیں آ رہا ہے۔ پھر اس نے عقبی آئینے میں بھی دیکھا۔ کچھ گاڑیاں دیکھ کر اس نے اپنا اطمینان کر لیا۔ پھر اس نے پوچھا۔

''کیا میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتی ہوں.....؟''

''ٹائیگر.....!'' اس نے تارا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''ٹائیگر.....!'' تارا اچھل سی پڑی۔ پھر وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''جانو کے دوست.....''

''ہاں.....'' ٹائیگر نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ ''میں اس کا دوست ہوں اور نہ وہ دوست کے قابل ہے..... مجھے تاش کے کھیل سے بڑی دل چسپی ہے..... سیدھا سادھا یوں کہیے کہ میں ایک جواری بھی ہوں..... اس لیے منہ کا ذائقہ بدلتا رہتا ہوں۔''

''آپ اصل میں کیا ہیں.....؟ کیا ٹیکسی چلاتے ہیں.....؟ ٹیکسی ڈرائیور ہیں؟''

''میں اصل میں کیا ہوں یہ میں اب تک خود بھی جان نہیں سکا..... لیکن میں بہت کچھ ہوں..... ہر فن مولا ہوں..... دنیا کا ایسا کون سا کام ہے جو میں نے نہیں کیا..... جس نے جب بھی میری خدمات حاصل کیں..... میں نے انہیں مایوس نہیں کیا..... میں ہر کام کا معاوضہ لیتا ہوں۔ آدمی اور کام دیکھ کر..... لیکن میں نے کبھی انسانیت کے خلاف کوئی کام نہیں کیا..... ظالموں کا بدترین دشمن ہوں..... مظلوموں کا دوست اور ساتھی ہوں..... میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔''

''لیکن آپ نے مجھے اس بدمعاش کے ہاتھوں کیوں اور کس لیے بچایا.....؟'' تارا نے کہا۔

''اس لیے کہ میں ظلم کے خلاف جو ہوں.....'' ٹائیگر نے جواب دیا۔ ''میں نے سبق دینے کے لیے ایسا کیا۔ میں نے انہیں جو چوٹ دی ہے وہ اس کی جلن اور درد برسوں یاد رکھیں گے..... اب کسی حسین و جوان لڑکی کو اغوا کرنے سے پہلے سوچیں گے ضرور.....''

''یہ ٹائیگر نام؟ وہ اس کی وجہ کچھ سمجھ نہیں آئی..... آپ کوئی اچھا سا نام تو رکھ لیتے.....! اس لیے کہ یہ نام ایک ایسے جانور کا ہے جو درندہ صفت ہے..... اس کا کام انسانوں کو چیر پھاڑ کر کھانا ہے؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''میں ایسے لوگوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہوں جو انسانیت کے دشمن ہوتے ہیں۔'' ٹائیگر نے کہا۔ ''کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟''

''جی ہاں..... کچھ عجیب سا لگ رہا ہے؟'' وہ اس کے چہرے پر نگاہیں جما کر بولی۔

''وہ کس لیے.....؟'' اس نے پوچھا۔ ''یہ کیا بہت برا لگ رہا ہے؟''

''اس لیے کہ آدمیوں کے نام..... آدمیوں کی طرح ہونا چاہیے۔'' وہ کہنے لگی۔ ''آج کل مافیا اس قسم کے نام رکھتے ہے، جیسا کہ ہمارے دیش میں کالا ناگ، سنہرا بچھو، بلیک کیٹ،..... بلڈ اگ اور نجانے کیا کیا نام کے مافیا ہیں..... آج اب میں ایک نیا نام سن رہی ہوں..... ٹائیگر..... لیکن ان ناموں میں ٹائیگر کا نام ہے..... گویا آپ مافیا جنگل میں بادشاہ ہیں کیوں شیر جنگل میں بادشاہ ہوتا ہے.....''

''کیا میں اپنے نام ٹائیگر کا ترجمہ کر کے بادشاہ رکھ لوں؟'' ٹائیگر نے جواب دیا۔ ''میں کوئی مافیا نہیں ہوں۔ میں نے اپنا نام اس لیے ٹائیگر رکھ لیا ہے کہ یہ دنیا بھی ایک جنگل ہے۔ جنگل میں درندے، اور موذی جانور ہیں جو ان سے بھرے ہوئے ہیں..... لیکن ان سے کہیں اور موذی اور خطرناک جانور اس مہذب دنیا کے جنگل میں بھرے ہوئے ہیں۔ یوں کہ میں ایک شیر کی طرح مصیبت زدہ لوگوں کو بچاتا ہوں اور بچاتا آ رہا ہوں۔ اس لیے میں نے اپنا نام ٹائیگر رکھ لیا۔''

''آپ اتنے بڑے دولت مند ہو کر ٹیکسی کا پیشہ

www.pdfbooksfree.pk

کیوں اختیار کیا ہوا ہے؟"

"آپ نے کیسے اندازہ کر لیا کہ میں دولت مند ہوں.....؟" ٹائیگر نے پل بھر کے لیے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ جوئے میں تین لاکھ کی رقم جیت کر لوٹے ہیں..... میں نے ان لوگوں کی باتیں سنیں جو کھیل کے دوران آپ سے کہہ رہے تھے اور یہ بتا رہے تھے کہ آپ قسمت کے بڑے دھنی ہیں۔ ان لوگوں نے کبھی بھی آپ کو جوئے میں ہارتے نہیں دیکھا۔ آج بھی لاکھوں کی رقم جیت کر آئے ہیں۔ تین لاکھ کی رقم..... اس طرح آپ ہزاروں اور لاکھوں جیت کر دولت مند بن گئے..... ہوں گے۔ مجھے خوشی ہوئی اس بدمعاش سے تین لاکھ جیت کر آئے۔"

"یہ سچ ہے کہ میں تین لاکھ کی رقم جیت کر اٹھا..... جہاں کہیں بھی جوا کھیلتا ہوں تو مجھے میری قسمت ساتھ دیتی ہے..... مجھے یہ یاد نہیں کہ میں کبھی ہارا ہوں..... شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے ہو کہ کھیل کے دوران میری نیت ہمیشہ صاف رہتی ہے۔ میں تاش کا کھیل تو وقت گزاری کے لیے کھیلتا ہوں..... لیکن جب بے ایمانی کرنے والوں کی ریاکاری، منافقت اور بدنیتی کو دیکھتا ہوں تو پھر میرا یہ ہاتھ جو ایک طرح سے کرشمہ ساز ہے۔ اس کی انگلیاں اپنا فن دکھاتی ہیں۔ جادو جگاتی ہیں..... اس لیے ہارتا نہیں ہوں..... میری یہ انگلیاں ہر فن مولا ہیں..... یہ بڑے کارنامے کرتی ہیں۔"

"ان بدمعاشوں نے ایک سازش کے تحت مجھے لوٹنے کا منصوبہ بنا لیا تھا کہ وہ مجھ سے جیتی ہوئی رقم لے جانے نہیں دے گا..... مجھے قتل بھی کر سکتا ہے میں ٹیکسی ایک جگہ کھڑی کر کے واپس آیا تو میں نے اس کے دونوں ساتھیوں کو باہر آتے اور میرے تعاقب میں جاتے دیکھا۔ میں نے ان کی کچھ گفتگو سن لی تھی۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا کہ....." بلیک ٹائیگر کے پاس چار لاکھ کی رقم ہے..... ایک لاکھ اس کی اپنی اور دوسری جیتی ہوئی تین لاکھ..... اور پھر اس کی ٹیکسی دو سے تین لاکھ میں بک جائے گی۔"

"پھر وہ میری تلاش میں ایک موٹر سائیکل پر نکلے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں آگے میں اس لے آیا تھا کہ آپ کو یہاں سے روانہ دلواؤں..... اس سے پہلے میں جانو حیدر کو اس کی بدنیتی کی سزا دینا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی تجوری اس کی خواب گاہ میں ایک فریم میں آویزاں ایک اداکارہ کی نیم عریاں تصویر کے عقب میں ہے۔ میں نے اوپر دیکھا تو ایک اٹیچی نظر آئی۔ وہ اس میں اکثر لوٹا ہوا مال لے کر آتا ہے میں نے تصویر اتاری..... پھر میری کرشمہ ساز انگلیوں نے پانچ سات منٹ میں کوڈ نمبر سیٹ کر دیا۔ پھر تجوری کھل گئی۔ اس میں لاکھوں کی رقم..... زیورات، تصویریں اور سی ڈیز بھی تھیں جو لڑکیوں کی قابل اعتراض حالت کی تھیں۔ جن سے وہ بلیک میل کیا کرتا تھا میں نے سب چیزیں واپس اٹیچی میں رکھ دیں۔ پھر میں نے اس میں ایک تحریر رکھ دی..... پھر تجوری مقفل کی اور وہ تصویر لگا دی۔"

"میں فوراً لپک کر گیا۔ میں نے اٹیچی ٹیکسی کی ڈگی میں رکھی پھر میں اس لیے واپس آ گیا آپ کو یہاں سے کسی ایسی تدبیر سے نکال کر لے جاؤں کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے..... جانو حیدر نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو کس لیے اغوا کیا گیا ہے۔ آپ پانچ سات دن تک ان کے ہاتھ نہیں لگیں۔ آپ نے اسے خوب نچایا، پریشان کیا اور چکمے بھی دیتی رہی تھیں، اس کے کزن کی یہ منصوبہ بندی ہے کہ آپ کی عزت کو تاراج کرنے کے لیے نیز فلم بنائی جائے۔ اس نے مجھے بھی دعوت دی کہ میں بھی اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھاؤں..... لیکن میں یہاں جوا کھیلنے کے بہانے آپ کو یہاں سے نکال لے جانے آیا تھا۔ کیوں کہ میں نے آپ کو اغوا ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی دعوت کو قبول کر لیتا۔ لیکن میں عورت کی عزت بچانا جانتا ہوں اس کی عزت سے کھیلتا نہیں....."

"اور پھر میرا ذریعہ معاش جوا کھیلنا کبھی نہیں رہا۔

نہ میں نے کبھی حرام کھایا..... اللہ نے چاہا تو میں آخری سانس تک اس پر کار بند رہوں گا۔ لیکن میں جائز خدمات انجام دیتا ہوں اور اس کا پورا پورا معاوضہ وصول کرتا ہوں۔"

"بہت خوب....." تارا نے اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔

"یہ آپ جوئے میں جو رقم جیت کر لے جا رہے ہیں..... اور آپ نے جو اس کی تجوری میں سے اس کی ساری دولت لے آئے اور جھاڑو پھیر دی اس کا کیا کریں گے؟"

"آپ مجھے ایک طرح سے رابن ہڈ کہہ سکتے ہیں جس کی زندگی کا مقصد صرف غریبوں کی مدد کرنا تھا۔ وہ کہنے لگا یہ میں آج کے دور کی رابن ہڈ ہوں..... آپ جانتی ہیں کہ ہمارے اس بدنصیب بستی میں کتنے غریب ہیں..... کتنے بدنصیب اور غربت اور تنگ دستی کے مارے ہوئے ہیں..... بارش اور سیلاب سے متاثر ہوتے رہتے ہیں ہر سال..... انہیں ایک وقت کی روٹی بھی نہیں نصیب ہوتی ہے..... معذوروں کے ادارے ہیں اور یتیم خانے بھی ہیں..... میں یہ تمام رقم ان میں بانٹ دوں گا..... اس سے پہلے بھی میں یہ کرتا چلا آ رہا ہوں۔"

"حیرت اور ناقابل یقین سی بات لگتی ہے۔" تارا نے کہا یہ فلموں اور کہانیوں میں ایسے کردار ملتے ہیں..... حقیقی زندگی میں کوئی حاتم طائی نہیں ہوتا ہے..... آپ کیوں نہیں یہ رقم رکھ لیتے ہیں..... دولت کی ضرورت تو ہوتی ہے؟"

"بات یہ ہے تارا جی.....!" ٹائیگر نے جواب دیا۔ "میں اس دنیا میں اکیلا ہوں..... نہ ماں باپ ہیں نہ بھائی بہن..... رشتہ داروں نے باپ کی موت کے بعد کنارہ کشی اختیار کر لی..... ایک جان کے گزارے کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے والد نے ایک مکان اور دکان چھوڑ دی..... دکان یوں کہ ایک بہت کمرشل علاقے میں کرایہ پر اٹھی ہوئی ہے۔ اس کا اتنا کرایہ آتا ہے کہ میں اخراجات کرنے کے علاوہ پس انداز بھی کر لیتا ہوں۔ کبھی بھی دولت کی ہوس نہ رہی اور انشاء اللہ کبھی رہے گی بھی نہیں۔"

"آپ تو بڑے بے غرض اور عظیم انسان ہیں۔" تارا بولی "مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ میرا محسن ایک عظیم آدمی ہے۔"

"میں نہ تو عظیم ہوں اور نہ محسن ہوں..... ان میں سے میرا کوئی نام نہیں ہے۔" ٹائیگر نے کہا۔ "میں صرف ایک ٹائیگر ہوں۔"

"مجھے ایک بات کا خیال آ رہا ہے....." تارا نے فکر مندی سے کہا۔ "آپ مشورہ دیں کہ میں کیا کروں!"

"کس بات کا.....؟"

"رات جب جعفر کیمرامین کے ساتھ فلم بنانے کے لیے جانو کے ہاں پہنچے گا تب..... اور جانو اپنی تجوری دیکھے گا تو ان دونوں کی کیا حالت ہوگی..... وہ سیدھا میرے ہاں پہنچیں گے..... اس وقت ان پر بجلی آ گرے گی..... میں آخر تک روپوش رہوں گا..... کہاں روپوش رہوں گا.....؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟" تارا پریشان سی ہو رہی تھی۔

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ گھر چل کر کپڑے بدل لیں.....؟ آپ ہوٹل میں قیام کریں۔ پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے..... کیا قدم اٹھانا ہے..... آپ پولیس سے مدد بھی حاصل کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں..... لیکن اس کے لیے ٹھوس ثبوت اور گواہوں کی ضرورت ہوگی..... اس کے لیے کوئی اور تدبیر سوچنا ہوگی..... کوئی نہ کوئی تدبیر سوچ لوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"لیکن آپ تو رات ڈھاکا واپس جا رہے ہیں" تارا نے خوف سے کہا۔ "میں اکیلی کیا کر سکتی ہوں؟"

"نہیں میں واپس نہیں جا رہا ہوں۔" ٹائیگر نے جواب دیا۔ "میں نے نو بجے کسی سواری کو واپس لے جانے کا کا بہانہ جانو سے اس لیے کیا تھا کہ آپ کو اس زہریلے ناگ سے بچاؤں....."

www.pdfbooksfree.pk

"زہریلا ناگ صرف جانو حیدر ہی نہیں بلکہ جعفر بھی ہے....." تارا نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "وقت اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا تاوقتیکہ مجھے بلیک میل کرنے کا موقع نہ مل جائے یا پھر جبر وزیادتی سے شادی کر کے میری ساری دولت ہتھیا لے۔"

"آپ اتنی خوف زدہ اور پریشان نہ ہوں۔" ٹائیگر نے کہا۔ "آخر میں کس مرض کی دوا ہوں..... جانو حیدر اور جعفر آپ کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے..... ان سے نمٹنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"آپ کا یہ احسان عظیم میں ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔" وہ ممنونیت سے بولی۔ "آپ جو بھی کہیں گے پیش کرنے کے لئے تیار ہوں..... کروڑوں..... بلکہ اس سے بھی زیادہ....."

"ابھی آپ کا گھر کتنے فاصلے پر ہے.....؟" ٹائیگر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا "ابھی تک ہم نے کتنا فاصلہ طے کیا ہوگا؟" وہ بولی۔

"میرا گھر کوئی پانچ چھ میل تک ہوگا۔"

"گویا دس میل.....؟" ٹائیگر بولا۔ "آپ دو سو ٹاکا ٹیکسی کرایہ کے مد میں ادا کر دیں۔"

"دو سو کیا دو ہزار ٹاکا دوں گی۔" تارا بولی۔ "یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اس ٹیکسی اور آپ کی بدولت میری عزت اور جان بچ گئی..... میں دو سو کیا..... بیس ہزار ٹاکا بھی دے سکتی ہوں۔"

"میں نے جو کرایہ بتایا ہے آپ اس سے جتنا چاہے دے دیں..... اس لیے کہ یہ ٹیکسی میرے محلے کے ایک محنت کش کی۔ اس کا گزارہ ٹیکسی کی آمدنی پر ہے اس کی پانچ نوجوان لڑکیاں ہیں۔ اسے ان کی شادی کرنی ہے۔ دو لڑکیوں کا رشتہ طے ہو چکا ہے..... آئندہ ماہ ان دونوں لڑکیوں کی شادی ہونے والی ہے اس لیے جو کرایہ بھی ملا وہ میں اسے دے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے اسے آپ بیس ہزار ٹاکا دے دیجئے گا..... اس کے علاوہ اس کا نام اور پتا بھی بتا دیں۔" تارا نے کہا۔

"میں دو لاکھ ٹاکا پہلی فرصت میں پہنچا دوں گی۔ میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے مجھے ان کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔"

"گھر پہنچ کر کپڑے بدلنے سے پہلے کرایہ ضرور دے دیں۔ کیوں کہ شاید بعد میں ادا کرنا یاد نہ رہے۔"

"سب سے پہلے کرایہ میں ادا کروں گی۔" تارا مسکرائی۔ "آپ بے فکر رہیں۔"

ٹائیگر نے دستی گھڑی میں وقت دیکھا اور تارا کی طرف سے نظریں ہٹا کر بولا۔

"سوا دس بج رہے ہیں..... جتنا جلد ہو سکے کپڑے بدل کر نکل پڑیں....." ٹائیگر نے کہا۔

"وہ کس لیے.....؟"

"اس لیے کہ آپ کا گھر ابھی غیر محفوظ ہے۔" ٹائیگر نے کہا۔ "کیوں کہ جانو حیدر اور جعفر خونی شیروں کی طرح آئیں گے..... شاید جانو حیدر اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ آ پہنچیں گے..... اور پھر آپ کو اغوا کر کے لے جانے کی کوشش کریں گے تاکہ فلم بنائی جا سکے..... میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی محفوظ مقام پر چلیں..... تاکہ سکون و اطمینان سے سوچا جائے کہ ان دونوں سانپوں کا سر کیسے کچلا جا سکتا ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری....."

"چندن پور میں میری ایک سہیلی کا فلیٹ خالی ہے۔" تارا بولی۔ "وہ دو ماہ کے لیے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بنکاک گئی ہوئی ہے۔ چابیاں مجھے دے گئی ہے۔ جانو حیدر اور جعفر کے فرشتے بھی نہیں جان سکتے ہیں۔"

☆.....☆.....☆

ادھر ساڑھے دس بجے جانو حیدر نے کھیل ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور پھر دونوں مہمانوں کو رخصت کر دیا تاکہ فلم بنانے کی تیاری کی جا سکے۔ آج جانو حیدر کا موڈ بھی بہت خراب تھا۔ وہ آج بری طرح ہارا جو تھا۔ نہ صرف ٹائیگر بلکہ وہ دونوں مہمان بھی خاصی رقم جیت گئے تھے۔ ان کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ اپنے ساتھی اور ثروت پر برس پڑا۔

"یہ آج کیا ہوا تھا..... یہ تینوں سالے جیت کر چلے گئے اور ہم آج بہت بری طرح ہار گئے..... جب کہ کارڈ نشان زدہ تھے..... کبھی تو ایسا نہیں ہوا تھا..... اگر ایسا ہوتا رہا تو ہم فقیر ہو جائیں گے....." جانو حیدر ہذیانی لہجے میں بولا۔

"یار جانو..... یقیناً..... گڈی میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے..... میں ابھی دیکھتا ہوں۔" ثروت نے دیکھا۔

ثروت نے گڈی کا ایک ایک پتا دیکھا اور غصے سے بولا۔ "میں نے کہا تھا یقیناً کوئی گڑبڑ ہو گئی ہوگی..... اس میں سے دو بادشاہ اور دو ایکے غائب ہیں..... یہ حرکت ٹائیگر کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی..... وہ بہت بڑا شاطر جواری ہے..... شارپر..... اس لیے تو وہ کبھی آیا، پچاس ساٹھ ہزار سے کم جیت کر نہیں گیا۔ آج پورے تین لاکھ روپے جیت گیا اور اوپر سے تمہیں ایک لاکھ کا مقروض کر گیا۔"

"میں اسے ایک لاکھ کیا..... ٹھینگا دوں گا....." جانو حیدر نے کہا۔ "وہ سالا ان دونوں کو بھی جیتا گیا ہے۔"

"غصے کو قابو میں رکھو..... ٹائیگر کچھ دیر کا مہمان ہے....." ثروت نے کہا۔ "صبور اور قاسم اسے موت کی نیند سلانے اور جیتی ہوئی رقم لانے اور اس کی لاش ٹھکانے لگانے گئے ہوئے ہیں..... بس آتے ہی ہوں گے۔"

"میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں تاکہ دس ہزار کی رقم لیتا آؤں....." جانو حیدر نے کہا۔ "اس کیسرا مین آکاش میاں کو دینا ہوگا..... تم جانتے ہو وہ پہلے ایڈوانس لیتا ہے۔ پھر وہ کہیں جا کر فلم بندی شروع کرتا ہے..... بھروسہ ایک ٹکا کا بھی نہیں کرتا ہے....."

جانو حیدر اپنی خواب گاہ میں گیا۔ اس نے کوئی نمبر سیٹ کر کے تجوری کھولی تو لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا..... جب اندھیرا چھٹا تو اس نے دیکھا کہ تجوری خالی پڑی ہے۔ ایسے جیسے کسی نے جھاڑو پھیر دی ہو۔ پھر وہ صدمے سے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

جانو حیدر رقم لانے جب اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا تو ثروت کے موڈ کے کسی کونے ایک انجانی خواہش نے انگڑائی لی..... اس نے سوچا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کیوں نہ تارا کو فریب دے کر تھوڑی دیر تک اس سے من مانی کر لے..... رات اس کی باری آنے اور بے حرمتی کرنے میں بڑی دیر ہے۔ صبر اور بڑا کرب ناک انتظار کرنا ہوگا۔ جانو حیدر اس سے کہے گا بھی کیا.....

اس نے یہ سوچ کر دروازے کے باہر لگی ہوئی کنڈی کھول کر کمرے میں گھس کر دروازہ بھیڑ دیا۔ دیکھا تو وہ کمرے میں نہیں تھی..... پھر وہ یہ سمجھا کہ شاید نہا رہی ہوگی..... یہ خیال اور نقشہ بڑا سنسنی خیز تھا، اس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... کیا وہ فرار ہو گئی.....؟ پھر اس کی نگاہ کھڑکی پر پڑی تو اسے یقین نہیں آیا۔ یقین نہ کرنے والی بات تھی..... گرل کی دونوں سلاخیں نکلی فرش پر پڑی ہوئی تھیں..... تیسری سلاخ سے ساڑی باندھ کر وہ نیچے اتر گئی تھی۔

وہ جانو حیدر کو بتانے کے لئے تیزی سے لپکتا ہوا اس کی خواب گاہ میں پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔

جانو حیدر فرش پر بے ہوش پڑا تھا..... اس کی تجوری خالی پڑی تھی۔ کسی بیوہ کی ننگی کلائیوں کی طرح.....

☆.....☆.....☆

"یہ آپ نے تجوری کھولنے کا فن کہاں سے سیکھا.....؟" تارا نے چائے کا کپ اس کے سامنے میز پر رکھا اور سینڈوچز کی پلیٹ اور اپنی چائے لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ان بدمعاشوں نے اسے صرف پانی پینے کے لئے دیا تھا۔ وہ چائے اور نہ

www.pdfbooksfree.pk

کھانے کے لیے کچھ دیا تھا۔ اسے اس وقت بھوک لگی تھی۔ اپنے فلیٹ سے سہیلی کے فلیٹ جاتے ہوئے راستے میں ایک ہوٹل سے ٹائیگر نے سینڈوچز لے لیے تھے۔ تارا کو بہت بھوک لگی تھی۔ اس نے ایک عدد سینڈوچ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''تجوری اور تالے والی کمپنی میں، میں نے کوئی پانچ برس تک ملازمت کی تھی۔'' ٹائیگر نے جواب دیا۔

''میری ان انگلیوں نے جانے کیا کیا سیکھا.....؟ چاقو پکڑنا اور چلانا..... ان دس انگلیوں نے دس فن سیکھے اور بڑی مہارت حاصل کی..... یہ فن کار ہیں..... عظیم فن کار..... یہ بولتی ہیں..... بڑے کمال دکھاتی ہیں..... مثلاً کسی عورت نے انگلیوں میں انگوٹھیاں اور چوڑیاں کیوں نہ پہن رکھی ہوں..... اس کے گلے میں کیسا ہی چھوٹا بڑا ہار کیوں نہ ہو..... یہ طلسماتی انگلیاں اس طرح اتار لیتی ہیں کہ پہننے والی کو محسوس بھی ہوتا اور اسے پتا بھی نہیں چلتا..... اس کے علاوہ کسی بھی شخص کی کسی بھی بیرونی اور اندرونی جیب میں پرس ہو یا کاغذ کا پرزہ اسے میری جیب میں منتقل کر دیتی ہیں..... ان کے کمالات کیا کیا ہیں..... کیا کیا بتاؤں.....؟ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

''آپ اور کیا کیا جانتے ہیں.....؟'' تارا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس نے تجسس سے پوچھا۔

''میں کیا کچھ نہیں جانتا.....'' ٹائیگر نے جواب دیا۔ ''میں نے کیا کچھ نہیں سیکھا..... کیا کچھ کارنامے انجام نہیں دیے ہیں..... میں ایک بہترین سراغ رساں ہوں..... اس کے علاوہ کمپیوٹر اور الیکٹرونکس..... چھوڑیں ان باتوں کو اس سے کیا حاصل؟''

''لیکن آپ نے یہ سب کچھ کیوں اور کہاں سے سیکھا.....؟'' ستارہ کا تجسس دوچند ہو گیا۔

''میں نے جیل میں سیکھا.....''

''جیل میں.....'' تارا چونک پڑی اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ ''کیا جیل میں یہ سب کچھ سیکھا جا سکتا ہے.....''

''کیوں نہیں.....'' ٹائیگر نے جواب دیا۔ ''وہاں جو کچھ سیکھا جا سکتا ہے اس کی دنیا سے باہر ممکن نہیں ہے۔''

''آپ کتنے برس جیل میں رہے.....؟'' تارا نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''دو برس میں نے قید کاٹی۔'' ٹائیگر بولا۔ ''میں اس جیل یونیورسٹی سے ہر کورس میں فارغ التحصیل ہو کر باہر آیا۔ میں نے جو دو برس وہاں رہ کر جو حاصل کیا وہ پانچ برس میں بھی کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔''

''آپ نے کس سلسلے میں وہاں دو برس قید کاٹی.....! آپ نے کیا جرم کیا تھا؟''

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا.....؟'' ٹائیگر نے جواب دیا۔

''پھر بھی آپ کو بے گناہ جیل میں ڈال دیا گیا؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ''کیا ایسا بھی ہوتا ہے.....؟''

''ایسا کیوں نہیں ہوتا..... ایسا ہوتا رہتا ہے، جب قانون کی حکمرانی نہ ہو..... قانون غریبوں کے لیے امیروں کے لیے ہو..... جیلوں میں اکثریت بے گناہوں کی ہوتی ہے..... وہ غریب برسوں سزا کاٹتے ہیں..... پولیس سے زیادہ ظالم، درندہ صفت اور خون آشام کوئی نہیں ہوتا ہے..... جب ان کے تشدد سے کوئی مر جاتا ہے تو پولیس والے اس پر خودکشی اور دل کے مریض ہونے کا الزام لگا دیتے ہیں..... جب کوئی جوان اور حسین لڑکی کسی ناکردہ گناہ کے الزام میں جیل جاتی ہے تو وہاں جو بھیڑیے ہوتے ہیں..... قانون کے محافظ ہوتے ہیں وہ اس کے بے حرمتی کرتے ہیں..... جب وہ ماں بن جاتی ہے تو اس پر الزام لگاتے ہیں کہ جب وہ جیل آئی تھی تب ہی امید سے تھی..... وہاں ایسی بہت ساری لڑکیاں اور عورتیں سزا بھگت رہی ہیں جو مائیں بن گئیں..... جیل کے حکام کہتے ہیں کہ یہ عورتیں بدچلن اور فاحشائیں تھیں..... اس لیے وہ ماں بن گئیں..... یہ

www.pdfbooksfree.pk

عورتیں نہیں بتا سکتی ہیں کہ ان کے بچوں کا باپ کون ہے.....؟ قانون ان عورتوں کی اس لیے نہیں سنتا ہے کہ وہ غریب ہوتی ہیں.....“

”اوہ میرے خدا.....!“ تارا کانپ کر رہ گئی۔

”یہ آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کو کس جرم میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا؟“

”حالات اور واقعات نے.....“ ٹائیگر بتانے لگا۔

”اس وقت میری عمر بائیس برس کی ہوگی۔ میں ایک سیدھا سا نوجوان تھا۔ والدین کی وفات کے بعد میں ملازمت کی تلاش میں ایک جگہ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کے بازار میں چند بدمعاش ایک نہایت حسین لڑکی کو اغوا کر کے گاڑی میں ڈالنے کے لیے اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں..... دن دہاڑے..... وہاں دکانیں تھیں اور گاہک بھی..... وہ اس طرح اس مسلح بدمعاشوں کو دیکھ رہے تھے جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو..... اگر وہ سارے لوگ چاہتے تو لڑکی کو ان بدمعاشوں کے ہاتھوں سے بچا سکتے تھے..... لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی..... جرأت اور حوصلہ نہیں تھا..... وہ بے غیرت اور بے شرم بنے ہوئے تھے.....“

”اگر ان کی کوئی بیٹی اور بہن ہوتی تو بھی شاید وہ آگے نہ بڑھتے..... وہ لاکھ چیخ رہی تھی..... چلا رہی تھی..... مدد کے لیے..... ان بدمعاشوں اور وہاں کھڑے لوگوں سے کہہ رہی تھی..... منت سماجت کر رہی تھی..... گڑگڑا رہی تھی کہ خدا کے لیے مجھے بچاؤ..... وہ مزاحمت بھی کر رہی تھی..... بلاشبہ وہ ایک بہادر لڑکی تھی..... اسے اپنی عزت اور زندگی پیاری تھی.....“

”ایک نازک سی لڑکی چار مسلح بدمعاشوں سے تنہا لڑ رہی تھی..... اس کش مکش میں اس کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے..... بے غیرت مجمع اس کے جسم کی عریانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا..... مجھ سے رہا نہیں گیا..... وہاں ستر برس کا ایک بوڑھا شخص لاٹھی پکڑے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لاٹھی چھینی اور ان بدمعاشوں کے مقابلے پر ڈٹ گیا..... میں نے پہلے تو دو بدمعاشوں کے سر پھاڑ دیے تو وہ بے ہوش ہو گئے..... ہر ایک بدمعاش کے ہاتھ پیروں اور جسم کی ہڈیاں توڑ ڈالیں۔ پھر میں نے اپنے سر پر ایک زور دار ضرب محسوس کی..... وہ بندوق کا بٹ تھا جو میرے سر پر مار کر بے ہوش کیا گیا تھا۔“

”جب مجھے ہوش آیا تو میرا ذہن خالی تھا..... معلوم نہیں میں کتنا عرصہ بے ہوش رہا۔ سب سے پہلے اس لڑکی کا خیال آیا تو میں یہ سمجھا کہ میں مر چکا ہوں..... پھر میرے سر میں ایک ایسی ٹیس اٹھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں ایک نہایت آراستہ خواب گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھے خون اور گلوکوز دیا جا رہا تھا۔ ایک نرس اپنی سفید یونیفارم میں ملبوس تھی۔ وہ لڑکی جسے میں نے درندوں سے بچایا۔ اس کی عزت پر آنچ آنے نہیں دی۔ وہ ایک کرسی پر فکرمند اور پریشان بیٹھی تھی۔ لیکن اس کا لباس پھٹا ہوا نہیں تھا۔ وہ مجھے ہوش میں دیکھ کر میرے پاس آئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔“

”میرے محسن.....! اللہ کا شکر ہے کہ آپ نے میری عزت بچائی..... مجھے اپنی جان سے زیادہ اپنی عزت ناموس کی فکر تھی..... آپ نے میری عزت بچانے کے لیے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی..... اس کی جزا تو اللہ آپ کو دے گا.....“

میں نے اس لڑکی سے دریافت کیا کہ..... ”میں کہاں ہوں.....؟“

اس وقت نرس ڈاکٹر کو میرے ہوش میں آنے کی اطلاع دینے کمرے سے نکل گئی تھی۔ لڑکی نے بتایا۔

”آپ اس وقت شہر کے سب سے بہترین اسپتال کے وی آئی پی روم میں ہیں.....“

”کیا.....؟“ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

”مجھے یہاں کون لے کر آیا.....؟“

”سندر بن کنگ مافیا.....“ لڑکی بولی ”ان کی بدولت آپ کو اس بدمعاش سے نجات ملی بلکہ آپ کی

جان بھی بچی..... اس وقت وہ گزر رہے تھے۔ انہوں نے جو دیکھا تو اپنے آدمیوں سے جان بچائی اور اس اسپتال میں داخل کرایا۔“

پھر میں نے دریافت کیا کہ وہ بدمعاش کس لیے اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو وہ بولی۔

”ایک رات بدمعاش مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا تھا..... اس نے مجھے بڑا لالچ بھی دیا..... میرے انکار پر اس نے مجھے اغوا کرنے کے لیے بدمعاشوں کو بھیجا..... آپ فرشتہ بن کر آئے..... ورنہ میں کسی قابل نہ رہتی۔ میری شادی جو ہونے والی تھی وہ نہیں ہو پاتی۔“

میں اسپتال میں تین دن زیر علاج رہا۔ وہ لڑکی اس کے باوجود کہ اسپتال میں میری دیکھ بھال کے لیے ایک نرس لگا دی تھی پھر بھی وہ میری خدمت کرتی رہی..... اس کے ماں باپ اور بھائی اس کا منگیتر بھی میرے اس احسان کا شکریہ ادا کرنے آئے تھے۔ وہ سب مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے میری بہادری کی بہت تعریف کی۔

تیسرے دن جب اسپتال سے ڈسچارج ہونے والا تھا تب اس سندر بن کنگ نے گاڑی بھیج کر مجھے اپنے ہاں بلایا۔ آپ نے شاید سندر بن کنگ کا نام سنا ہوگا..... پورے بنگال میں اس سے خطرناک کوئی شخص نہیں ہے۔ اس کا نام سن کر مافیا پولیس اور بڑے بڑے مجرم بھی کانپتے ہیں، وہ ایک دیوہیکل شخص تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ ان باتوں کے بعد اس نے سوال کیا۔

”سچ سچ بتانا..... تم نے ایک فلمی ہیرو کی طرح اس بدمعاش سے مقابلہ کیوں کیا؟“

”صرف انسانیت کے ناتے..... میں کسی پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“ میں نے اسے جواب دیا۔

”کیا تم انسانیت کی بقاء کے لیے مجرموں سے لڑنا چاہتے ہو.....؟ کیا تم نہیں جانتے کہ مجرم کتنے خطرناک ہوتے ہیں..... ان کی پشت پر کالی بھیڑیں ہوتی ہیں..... ان سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا.....“ اس نے کہا۔

”لیکن میری جتنی ہمت ہے..... اور مجھ میں جتنا حوصلہ ہے۔ سامنے والا چاہے کتنا بڑا مجرم کیوں نہ ہو۔ میں انسانیت پر قربان ہو جاؤں گا۔“

”کیا تمہارے خیال میں تم بڑے جرائم کا خاتمہ کر سکو گے.....؟ اس کی جڑیں اتنی مضبوط اور پھیلی ہوتی ہیں کہ انہیں کہاں تک کاٹ سکو گے۔“

”جتنا میرے بس میں ہوگا میں اس کی اتنی جڑیں کاٹ تو سکتا ہوں.....“ میں نے جواب دیا۔

”شاباش.....“ وہ خوش ہو کر کہنے لگا۔ ”تمہارے اس جواب نے میرا دل خوش کر دیا..... سنو لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ مجرموں سے اور برائیوں سے لڑنے کے لیے ہر ایک کو ہر کام میں طاق ہونا چاہیے..... کیا تم ایسا کرنا چاہو گے.....؟ اگر میں تمہیں بھٹی میں ڈال کر کندن بنا دوں تو تم کیا اس کے لئے تیار ہو.....؟“

”ہاں..... میں تیار ہوں۔“ میں نے بڑے حوصلے سے جواب دیا۔

”کندن بننے کے لیے تمہیں دو برس جیل میں رہنا ہوگا.....“ وہ بولا۔

”وہ کس لیے.....؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ تم طاق ہو جاؤ.....“ اس نے جواب دیا۔

”جیل میں ایک سے ایک مجرم اور پیشہ ور موجود ہے..... وہ مجرم بننے کے لیے بہترین تربیت گاہ ہے..... تم بہت کچھ سیکھ سکتے ہو..... وہاں بڑے بڑے مجرم..... وہاں کی مجرم یونیورسٹی کے استاد ہیں..... تم باہر آ کر ہر جرم اور ظلم کا مقابلہ کر سکو گے.....“

پھر مجھ سے ایک معمولی نوعیت کا جرم سرزد کرا کے دو برس کی سزا دلوائی۔ پھر میں دو برس جیل میں رہا..... میں نے وہاں ہر کام سیکھا..... جیب کاٹنا.....

www.pdfbooksfree.pk

جاقو زنی..... ہر قسم کا اسلحہ چلانے کی تربیت..... الیکٹرونکس..... جیل میں کمپیوٹر بھی آ گیا تھا۔ غرض کہ کوئی جرم ایسا نہیں تھا چونکہ مجھ میں ذہانت، شوق اور تجسس تھا اس لیے سیکھ لیا..... میں وہاں استادوں کا استاد بن گیا تھا..... پہلوان اور جوڈو کراٹے بھی۔ لیکن اس ماحول میں منشیات اور عورت سے دور رہا..... پیسہ ہو تو عورت نہ صرف باہر سے بلکہ قیدی عورتوں میں سے بھی دستیاب ہو جاتی تھی۔ جب میری سزا ختم ہو گئی۔ میں ہرفن مولا بن گیا تو مجھے وہاں بلیک ٹائیگر کا خطاب دیا گیا۔"

"مجھے آپ سے مل کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی....." تارا بولی..... "آپ بتائیں کہ میری کیا خدمت کر سکتے ہیں..... میں ہر صورت اور ہر قیمت پر جانو حیدر اور جعفر سے نجات پانا چاہتی ہوں....."

"آپ مجھے جعفر کے بارے میں بتائیں کہ اس کا کاروبار اور آمدنی کا ذریعہ کیا ہے.....؟" ٹائیگر نے پوچھا۔

"بہ ظاہر تو اس کی گارمنٹس کی فیکٹری ہے جس میں بیس مشینوں پر زنانہ ملبوسات تیار ہوتے ہیں۔" تارا بتانے لگی۔ "اس نے ایک سے ایک حسین، ضرورت مند، اور مجبور قسم کی لڑکیوں کو اچھی اجرت پر رکھا ہوا ہے..... اس لیے کہ انہیں ہراساں کر کے ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھائے..... بہت شریف قسم کی لڑکیاں اور عورتیں ملازمت چھوڑ کر چلی جاتی ہیں..... فیکٹری میں جو عورتیں موجود ہیں وہ بد چلن قسم کی ہیں..... جعفر اس فیکٹری ورکرز سے فائدہ اٹھاتا ہے..... اس کے علاوہ منشیات کا کاروبار کرتا ہے..... اس کاروبار کے بدولت وہ دولت مند بن گیا ہے..... وہ میری دولت بھی ہتھیانا چاہتا ہے..... دیش کے معروف و مقبول ماڈل گرل اس کی داشتہ ہے۔ وہ اس کی کوٹھی میں رات بھر رہتی ہے۔"

"میں نے دو باتیں سوچی ہیں....." ٹائیگر نے کہا۔ "جانو سے نجات پانے کی تدبیر یہ ہے کہ اس کے بنگلے کو آگ لگا دی جائے..... دو ایک دستی بم بھی اس کی عمارت کے اندر..... جب وہ بنگلے کو شعلوں میں دیکھ کر نکلے گا۔ تب بم پھٹیں گے..... آن کی آن میں اس کی عمارت ملبے کا ڈھیر بن جائے۔ سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ کوشش یہ ہوگی کہ اسے موبائل فون پر پیشگی اطلاع دی جائے گی..... اس کا بنگلہ تباہ ہونے سے اس کا کاروبار بھی ختم ہو جائے گا۔ وہ بھکاری بن جائے گا..... شاید صدمے سے مر جائے گا..... اس کا بنگلہ جو ہے اس میں تہ خانہ جس کو اس نے گودام بنایا ہوا ہے۔ اسے اسی طرح اس کی تباہی کا انجام کرنا ہے۔"

"جعفر کے بارے میں کیا سوچا آپ نے.....؟" تارا نے پوچھا۔

"لوہے کو لوہا کاٹتا ہے..... آپ اسے بلیک میل کر کے تباہ و برباد کر سکتی ہیں....." ٹائیگر نے جواب دیا۔

"میں اسے جیل کروانے کی سوچ رہا ہوں۔ جب وہ جیل سے رہا ہو کر آئے گا تو وہ بھیک مانگ کر گزارہ کرنے پر مجبور ہوگا۔ اسے کم سے کم پندرہ سے بیس برس کی سزا ہوگی۔"

دوسرے دن شام کے وقت جانو کے ساتھی ثروت نے جانو سے کہا۔

"حیرت کی بات تھی وہ فرار ہو کر کہاں روپوش ہو گئی..... کل رات جب ہم اس کی تلاش میں اس کے فلیٹ پہنچے تو وہ مقفل تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ تارا کے ساتھ جو ملازمہ تھی وہ دوپہر کے وقت اپنے گھر گئی لوٹی نہیں..... تارا بھی دوپہر کے بعد دفتر سے نکلی تو گھر رات بھی نہیں پہنچی..... آج پھر چوکیدار نے بتایا کہ وہ رات کسی وقت میں نہیں آئی اور نہ صبح سے اس کا پتا ہے۔ دفتر فون کرنے پر پتا چلا کہ وہ کسی کام سے کھلنا گئی ہوئی ہے۔ اس کا دفتر فون آیا تھا جس سے دفتر والوں کو پتا چلا..... یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کہاں گئی..... ٹائیگر کے ساتھ جانے سے رہی وہ دونوں اس سے

واقف نہیں ہیں۔ ٹائیگر نو بجے ہی چلا گیا تھا۔ اور پھر اس کی ٹیکسی بھی ہمارے آدمیوں کے جانے سے پہلے جا چکی تھی۔"

"ہاں..... وہ معمہ بن گئی ہے....." جانو بولا۔ "جعفر کہہ رہا ہے کہ اسے ہر قیمت پر تلاش کرو۔ کہاں تلاش کریں؟"

"جعفر سے کہو کہ وہ دو، تین دن صبر کرے..... تارا جائے گی کہاں..... اسے دفتر آنا ہی آنا ہوگا۔"

اس وقت جانو کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کان سے لگایا تو دوسری طرف ایک نامانوس اور گرجدار آواز نے اسے مخاطب کیا۔

"جانو..... تم فوراً ہی باہر نکل جاؤ..... اس لیے کہ تمہارے گھر کے چاروں طرف تیل چھڑک دیا گیا ہے اس کی بو آ رہی ہوگی..... اور پھر تین دستی بم بھی ہیں..... جو دس منٹ بعد پھٹیں گے....."

"چپ کر..... تو کیا بکواس کر رہا ہے..... کس کے باپ کی مجال..... یہ جانو کا گھر ہے حرام زادے..... تیرے باپ کا نہیں....."

"ارے جانو جی....." اس آواز نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "تو ذرا اپنے بائیں ہاتھ پر دیکھ..... وہاں آگ لگ چکی ہے۔"

جانو نے چونک کر اس سمت دیکھا..... واقعی وہاں ایک نیچے والا کمرا آگ کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھوں نے بھی دیکھا..... پھر وہ سب بھاگتے ہوئے نیچے آ گئے..... اس وقت تک نیچے عمارت کا بیشتر حصہ شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا..... وہ بنگلے کے احاطے سے باہر نکلے تھے کہ ایک دم سے دھماکے ہوئے..... یکے بعد تین دھماکے.....

"ارے جلدی سے فائر اسٹیشن فون کرو....." جانو ہذیانی لہجے میں چیخا۔ "تماشا کیا دیکھ رہے ہو....."

"فائر بریگیڈ اسٹیشن یہاں سے پانچ میل دور ہے....." جانو کے ایک ساتھی نے کہا۔ "اس کے آنے تک گھر ملبے کا ڈھیر بن چکا ہوگا۔"

واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ فون کرنے کے باوجود آگ بجھانے والی گاڑی خاصی تاخیر سے آئی تھی۔ کیوں کہ راستے میں گاڑی کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ گاڑی جب پہنچی تو عمارت ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ٹائیگر جعفر کی کوٹھی میں دروازے سے داخل ہو کر بالائی منزل پر پہنچا تو گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی۔ اس کی خواب گاہ سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے چھت پر جا کر بیڈ روم کے روشن دان سے جھانکا۔ اس نے جعفر اور اس ماڈل گرل کو دیکھا۔ وہ دونوں مے نوشی کے شغل میں مصروف تھے۔ ماڈل گرل انیتا اس سے کہہ رہی تھی۔

"اس کمینی، چڑیل اور حرام زادی تارا کا کچھ پتا چلا.....؟" انیتا بولی۔ "تم نے تو کہا تھا کہ جانو حیدر نے پانچ چھ دنوں کی کوششوں کے بعد آخر اسے اغوا کر کے یرغمال بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے..... اس کی نمونہ فلم بنائی جائے گی۔ اس کی شوٹنگ ہوگی۔ فلم بن جانے کے بعد تم اس سے پہلی قسط دو کروڑ کی وصول کرو گے..... وہ ہر ماہ دس لاکھ روپے دیتی رہے گی..... اس سے رقم وصول کرنے کے بعد تم مجھے بھی ہر ماہ دو لاکھ رقم دیتے رہو گے..... وہ منصوبہ کیا ہوا.....؟ فلم کہاں ہے..... مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

"سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔" جعفر نے جواب دیا۔ "فلم تو اب جانو کی بن گئی ہے۔ اس لیے اب تک اس منصوبے پر عمل نہیں ہو سکا..... وہ یہ کہ جس کمرے میں اسے قید کیا گیا اس کمرے کی کھڑکی سے سلاخیں نکال کر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی..... وہ کہیں روپوش ہو گئی..... جانو کے ڈبل اسٹوری بنگلے کو پٹرول چھڑک نہ صرف آگ لگا دی بلکہ دستی بموں کے پھٹنے سے اس کا شاندار بنگلہ مٹی کا ڈھیر بن گیا۔ اس کا صدمے سے برا حال ہے۔"

"اب کیا کرو گے تم.....؟" انیتا بولی۔ "وہ

www.pdfbooksfree.pk

تمہارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ایسی سونے کے انڈے دینے والی مرغی کہاں ملے گی؟"

"تارا سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے..... وہ نہ تو دو دن سے دفتر آ رہی ہے اور نہ فون کال ریسیو کر رہی ہے۔ اس نے اپنے تینوں موبائل فون بند کئے ہوئے ہیں..... میں اس سے کہنے والا ہوں کہ پہلے ایک کروڑ کی رقم ادا کرو..... پہلی قسط ہوگی..... پھر اس کے بعد ہر ماہ پانچ لاکھ..... میں تمہیں سستا چھوڑ رہا ہوں۔"

"وہ کس خوشی میں تمہیں یہ رقم ادا کرے گی.....؟" انیتا نے کہا۔ "کس بناء پر.....؟"

بنگلہ دیش میں عورتوں کے چہروں پر تیزاب پھینکنے کی وارداتیں ہوتی آ رہی ہیں۔" وہ کہنے لگا۔" روزانہ ایک دو..... ایک دو وارداتیں ہو رہی ہیں۔ آج بھی دو وارداتوں کی خبریں اخبار میں چھپی ہیں..... میں اسے دھمکی دوں گا کہ اگر اس نے میرا مطالبہ نہ مانا تو میں اس کے چہرے اور آنکھوں پر تیزاب پھینک کر اس کی زندگی درگور کر دوں گا۔"

"کیا وہ ڈر کر اتنا بڑا مطالبہ منظور کر لے گی.....؟" انیتا نے کہا۔ "اس بات سے بلیک میل ہو سکے گی؟"

"عورت اپنی بدصورتی سے جتنی خائف ہوتی ہے کسی اور سے نہیں....." وہ بولا۔

"نہیں..... تم یہ بے وقوفی مت کرنا....." انیتا کہنے لگی۔ "تم کالے میاں سے بات کرو۔ وہ بڑا خوفناک بدمعاش ہے۔ میرے خیال میں پچاس ساٹھ ہزار میں تیار ہو جائے گا..... وہ تمہیں اس کی ہر قسم کی فلم اور تصویریں بھی کھینچ کر دے دے گا۔"

"تم کالے میاں کو کل میرے دفتر بھیج دینا۔" جعفر نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ اب وہ بھتے چڑھنے کے بعد کیسے بچ کر نکلتی ہے۔ میں فوراً ہی اس کی فلم بناؤں گا..... میں دیکھتا ہوں کہ وہ فلم میں کام کیسے نہیں کرے گی؟"

"کیا تم اسے چارپائی سے باندھ کر فلم میں کام کرنے پر مجبور کرو گے؟" انیتا نے پوچھا۔

"نہیں....." جعفر نے سر ہلایا۔ "میرے ایک ہاتھ میں تیزاب سے بھری بوتل ہوگی۔ اس کے فرشتے بھی میری ہر بات ماننے پر مجبور ہوں گے۔"

"ونڈر فل آئیڈیا....." انیتا اس کا گال چوم کر بولی۔ "ارے ہاں..... تم نے میرے لیے ایک نیا نیکلس جو خریدا ہے وہ کہاں ہے؟"

"اوہ سوری ڈارلنگ....." جعفر نے بستر سے نکل کر کہا۔ "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اسے میں نے تجوری میں رکھا ہوا ہے..... میں ابھی لاتا ہوں۔ وہ نیکلس ایسا ہے کہ دیکھ کر خوشی سے باغ باغ ہو جاؤ گی۔"

دیوار پر ایک جہاز سائز کا جاپانی کلینڈر لگا ہوا تھا۔ اس میں ایک نیم عریاں جاپانی لڑکی کی تصویر تھی۔ اس نے کلینڈر کو نے پر رکھ کر تجوری کی طرف دیکھا۔ پھر کوڈ نمبر سیٹ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تجوری کھولی۔ تجوری کے اندر نوٹوں کی گڈیاں، فائلیں اور زیورات کے مخملی ڈبے رکھے تھے۔ جعفر نے ایک بڑا سا ڈبا تجوری میں سے نکالا پھر ڈبے کو کھول کر نیکلس نکالا ہیروں کا نیکلس بڑا خوبصورت تھا۔ جگمگا رہا تھا۔

جعفر نے اسے سنگار کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑا کر کے ہار اس کی صراحی دار گردن میں پہنا دیا۔ اس ہار نے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اپنا جائزہ لیتی رہی۔ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ آنکھیں ہیروں کی طرح دمک رہی تھیں۔

"ہاؤ سوئٹ....." وہ کھنکتی آواز میں بولی اور آئینے میں جعفر کو دیکھنے لگی۔ "بہت قیمتی معلوم ہوتا ہے؟"

"ایک لاکھ ٹاکا کا ہے۔" جعفر نے جواب دیا۔ "آج شام منشیات کی ایک کھیپ آئی ہوئی ہے وہ گودام میں ہے۔ دس لاکھ ٹاکا اس کی مالیت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے پندرہ لاکھ آسانی سے مل جائیں

گے۔ اگر پندرہ لاکھ میں سودا طے ہو گیا تو دو لاکھ تمہارے....."

پھر وہ دونوں شراب پینے اور جشن منانے بستر پر چلے گئے۔ ٹائیگر نے ان کی کوئی دس بارہ فلمیں ڈیجیٹل کیمرے سے بنا لیں جب وہ دونوں جانور بن گئے تھے..... پھر وہ نیچے آیا۔ اس نے جیب سے ایک ڈبا نکالا اور دروازے کے نیچے اس کا منہ رکھ کر دبایا..... گیس خارج ہونے لگی۔ وہ دس منٹ بعد کمرے میں منہ پر ڈھاٹا باندھے داخل ہوا۔ وہ دونوں بے ہوشی کی حالت میں پڑے تھے اس نے تجوری کی رقم اور زیورات کے ڈبے ایک پلاسٹک تھیلے میں ڈالے پھر تجوری مقفل کی..... انیتا نے وہ ہار جو میز پر رکھ چھوڑا تھا اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ کھول دیا تاکہ گیس کی بو باہر نکل جائے۔ جب بو نکل گئی تب وہ باہر آ گیا۔ گیس اسپرے سے وہ دونوں جو بے ہوش ہوئے ہوش میں آنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔

جب صبح دس بجے وہ ناشتا کر رہے تھے تب ملازم نے آ کر بتایا کہ پولیس انسپکٹر اور پولیس آئی ہوئی ہے۔"

جب وہ حیران پریشان کمرے سے نکلا تو پولیس انسپکٹر اس کے انتظار میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے جعفر کو سرچ وارنٹ دکھایا اور اس نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ پھر اس نے انیتا کے ساتھ روم کی تصویریں دکھائیں۔

☆.....☆.....☆

ٹائیگر ڈھاکا واپس آیا۔ اس نے تمام سی ڈیز اور تصویریں اور نیگیٹو جلا ڈالیں پھر اس نے ہاشم کو جا کر کرائے کی رقم دی اور اسے تارا کا پیغام بھی سنایا۔ ہاشم نے اسے خوب جی بھر کے دعائیں دیں، ہاشم کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ لیکن کمزوری اور نقاہت اتنی تھی کہ ابھی وہ گاڑی چلانے کے قابل نہیں تھا۔ اسے دو تین دن سخت آرام کی ضرورت تھی۔ ٹائیگر نے اس سے کہا کہ جب تک وہ ٹیکسی چلانے کے قابل نہیں ہو جاتا وہ ٹیکسی چلاتا رہے گا، پھر اس نے ٹیکسی کرائے پر لے لی۔

اس نے جعفر کو جو قانونی پھندے میں پھنسایا تھا تارا نے پچاس ہزار خدمت کا معاوضہ دیا تھا جو لے لیا تھا۔ وہ اسے مزید رقم دینے کے لئے تیار تھی۔ لیکن ٹائیگر نے منع کر دیا تھا۔ البتہ اس نے تارا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی شادی میں ضرور شرکت کرے گا۔

رات کے وقت ٹائیگر ہوٹل بندو سے چائے پی کر نکلا۔ اس نے پان سگریٹ کی دکان پر جا کر سونف خوشبو کا پان لیا اور کلے میں دبا کر ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے گاڑی کو مقفل نہیں کیا۔ لیکن جب وہ ٹیکسی کے پاس گیا تو دیکھا کہ ایک شخص جو موٹا بھدا تھا اس کی توند باہر نکلی ہوئی تھی جس نے اسے بے ڈول اور بے ہنگم بنا دیا تھا۔ وہ نفیس اور قیمتی لباس میں ہونے کے باوجود کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑ رہا تھا۔ آج وہ سارا دن مصروف رہا تھا۔ اسے پل بھر کی فرصت نہیں ملی تھی۔ وہ گھر واپس جانا چاہتا تھا۔ اس نے سواری کو جو گاڑی میں بیٹھے دیکھا تو وہ اسٹیرنگ پر بیٹھ کر سواری کی طرف گھوم کر دیکھا۔

"صاحب جی.....! آپ دوسری ٹیکسی دیکھ لیں..... مجھے اس وقت گھر واپس جانا ہے۔ میں بے حد تھک گیا ہوں۔"

"مجھے دھان منڈی کے علاقے میں جانا ہے....." سواری نے کہا۔ "وہاں صرف آدھا گھنٹہ لگے گا..... پھر میں رام نگر روڈ جاؤں گا۔"

"جی نہیں صاحب جی....." ٹائیگر نے پھر لجاجت سے کہا۔ "آخر آپ دوسری ٹیکسی کیوں نہیں کر لیتے.....؟"

"میں کوئی ایک گھنٹے سے خوار ہو رہا ہوں..... ٹیکسی ہے کہ مل نہیں رہی ہے، جو جا رہی ہے، وہ بھری ہوئی ہے..... آپ ضرور چلیں..... میں منہ مانگا کرایہ دوں گا۔" اس نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

"بات کرائے کی نہیں..... بات دراصل یہ ہے کہ....." ٹائیگر کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

سواری نے جیب سے پانچ پانچ سو کے تین نئے اور کرارے نوٹ نکالے اور فضا میں لہرا دیے۔

ٹائیگر ایک دم سے چونک پڑا۔ کیوں کہ کرایہ اتنا نہیں بنتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ تین چار سو ٹاکا..... وہ پندرہ سو کی رقم دینے کو تیار تھا..... بغیر مانگے ہی..... پندرہ سو ٹاکا کرایہ.....؟ کرایہ کم کرنے کی بجائے کرایہ سنے بغیر ہی پندرہ سو دے رہا تھا۔

ٹائیگر کی کچھ بھی سمجھ نہیں آیا..... اس نے سوچا یہ شخص بے وقوف ہے یا پھر شراب کے نشے میں دھت ہے..... یا پھر دبئی یا سعودی عرب سے برسوں کے بعد آیا ہے۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہے کہ کرایہ کیا ہوگا.....

لیکن ان باتوں کے باوجود اسے یہ شخص پراسرار اور مشکوک سا لگا۔ اس شخص کے پاس حرام کی کمائی ہے..... یا پھر کوئی ایسا ضروری کام ہے۔ جو وہ جلد از جلد نمٹانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے منہ مانگا کرایہ دینے میں معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ آزما لیا جائے۔

ٹائیگر تذبذب..... میں پڑ گیا۔ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ کرایہ بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا..... اس لیے کہ آج وہ بے حد تھکا ماندہ تھا۔ جو زیورات اور بڑی رقم جانو اور جعفر کی لایا تھا اسے مستحق لوگوں تک پہنچانا تھا۔ اس نے رات گھر بیٹھ کر ایک فہرست بنائی تھی..... معذوروں..... یتیم خانوں..... آشرم کی..... غریب مریضوں اور ضرورت مندوں کی..... زیورات اس نے بندھن ادارے کو دے دی۔ اس میں بڑے نیک، خدا ترس بزرگ تھے..... نادار لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی کرتے تھے۔ وہ زیورات کے علاوہ رقم میں عطیہ، زکوٰۃ اور خیرات لیتے تھے۔ زیورات وصول کرتے وقت دریافت نہیں کرتے تھے کہ کہاں سے اتنے قیمتی زیورات آئے۔ رسید دے دیا کرتے تھے۔ مخیر حضرات بھی وقفے وقفے سے اس ادارے کی مدد کرتے تھے۔

وہ انہیں بھی زیورات اور رقم دیتا تھا..... کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس ادارے کے پاس سے چوری کے زیورات برآمد ہوئے ہوں..... ٹائیگر بھی اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ اس سماجی اور خیراتی ادارے پر کوئی حرف نہ آئے۔ اس نے ہیروں کا نیکلس فروخت کر کے رقم ادارے کو دے دی تھی۔ چونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ سر سے بوجھ اتارے گا۔ اس لیے سارا دن مصروف رہا تھا۔

اس نے پندرہ سو کی رقم دیکھی تو اس کے دل میں تجسس سا ہوا کہ معاملہ کیا ہے..... اس نے سوچا کہ کرائے کی اتنی بڑی رقم وہ ہاشم میاں کو دے دے گا..... اس نے عقبی آئینے میں اس شخص کو دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مجھے نقصان ہوگا..... اس لیے میں دو ہزار ٹاکا سے ایک ٹاکا بھی کم نہیں لوں گا۔"

اس نے بغیر حیل حجت اور تکرار کے مزید پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"جلدی کرو..... ویسے ہی بہت دیر ہو گئی ہے..... میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔"

ٹائیگر نے ٹیکسی چلاتے ہوئے سوچا..... یقیناً دال میں کچھ کالا ہے..... اس لیے اس نے فوراً ہی پانچ سو کی رقم دے دی۔

دھان منڈی کا علاقہ قدیم تھا..... اب گلستان..... گلشن..... بتانی اور بھی بہت سے نئے علاقے اور کالونیاں وجود میں آ چکی تھیں لیکن ان سے دھان منڈی کی اہمیت، حیثیت اور قیمت متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اس میں کوٹھیاں بنگلے اور بلند و بالا اپارٹمنٹس اور بہت بڑا کمرشل ایریا بھی تھا۔ آج وہاں سرمایہ دار، زمیندار اور ہر قسم کے صاحب لوگ رہائش پذیر تھے۔

ٹیکسی ایک نیم تاریک اور عالیشان گلی میں داخل ہو کر چار سو گز کے ایک بنگلے کے پاس رکی۔ گلی ویران تھی۔ اس بنگلے کے باہر ایک نیم کا درخت تھا۔ اس بنگلے کے برآمدے اور دو ایک کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ شخص دروازہ کھول کر ٹیکسی سے اترا پھر گیٹ کی طرف بڑھا اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ اندر جو گھنٹی تھی وہ گنگنائی۔

چند لمحوں کے بعد عقبی دروازہ کھلا۔ ٹائیگر نے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو دیکھا۔ وہ شخص چہرے مہرے اور وضع قطع سے خبیث سا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے کمینگی جھانک رہی تھی۔ سواری نے اس سے پوچھا۔

"مناف صاحب! قاضی سراج الدین آ گیا.....؟ کیا وہ تمام کاغذات لے کر آیا ہے.....؟"

"قاضی صاحب کا فون آیا تھا..... وہ پانچ دس منٹ میں پہنچنے والے ہیں۔ شاہ جہاں صاحب! آپ اندر تو تشریف لائیں۔"

شاہ جہاں نے اندر قدم رکھنے کے بعد پوچھا۔ "دلہن..... کیا تیار ہو رہی ہے..... کہیں وہ.....؟"

ٹائیگر پورا جملہ سن نہ سکا۔ کیوں کہ وہ شاید برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔

چند لمحوں کے بعد ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ اس میں ایک شخص بغل میں رجسٹر ڈالے اترا..... وہ کافی عمر رسیدہ تھا۔ ٹائیگر اسے خوب پہچانتا تھا۔ وہ کیا پورا شہر اسے جانتا تھا کتنا خبیث، شاطر اور جعل ساز اور فراڈیا ہے..... جعلی نکاح نامے بناتا..... زبردستی شادیاں کراتا..... عورتوں میں جا کر جھوٹی قسمیں کھاتا اور گواہی دینا اس کا پیشہ تھا بے ایمان، بے ضمیر، اور بدنام آدمی تھا..... عورتوں کو حلالہ کرنا اور کرانا اس کا پیشہ تھا..... خود کئی عورتوں کو حلالہ کر چکا تھا۔

ٹائیگر کے دل کے کسی کونے میں جو یہ خیال آیا تھا کہ سواری پراسرار اور مشکوک قسم کی ہے..... دال میں کالا ہے..... اس کے اندیشے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ بغلی گیٹ بند نہیں کیا گیا تھا۔ قدرے کھلا ہوا تھا۔ جس میں سے ایک شخص گزر کر اندر جا سکتا تھا۔ ٹائیگر کو جستجو ہوئی تو وہ ٹیکسی سے اترا۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا صرف بھیڑ دیا۔ اس نے گیٹ کے سامنے جا کر اندر جھانکا۔ دو کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک کمرے سے عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کمرے کی کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے اندر کا منظر نظر نہیں آتا تھا..... برآمدے کے سامنے والا جو کمرا تھا اس کا اندر جانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کمرے میں جو گفتگو ہو رہی تھی وہ سنائی دے رہی تھی۔ اس کمرے کی دو کھڑکیاں احاطے اور دیوار کی طرف کھلتی تھی۔ ادھر اندھیرا تھا۔ ٹائیگر اس طرف بڑھا۔ ایک کھڑکی کا پردہ سرکا ہوا تھا۔ جس سے کمرے کا دروازہ اور اندر کمرے کا منظر روشنی میں نہایا ہوا تھا۔

مناف اور شاہ جہاں صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے قاضی ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ مناف کہہ رہا تھا۔

"شاہ جہاں صاحب! اب آپ ایک لاکھ ٹاکا کا عنایت فرما دیں۔ آپ نے کہا تھا کہ نکاح سے تھوڑی دیر پہلے ادا کر دوں گا۔"

"میں نے جس لڑکی کو دلہن بناتے وقت جو زیورات لا کر دیے ہیں وہ پانچ لاکھ ٹاکا کے ہیں....." شاہ جہاں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "کیا آپ نے وہ تمام زیورات پہنا دیئے کہ نہیں.....؟ میں تسلی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ کو ہم پر اعتبار نہیں.....؟" مناف کو اس کی بات بری لگی۔ "ہم بددیانت نہیں....."

"بات اعتبار کی اور بے اعتباری کی نہیں....." شاہ جہاں نے کہا۔ "آپ نے خود کہا تھا کہ نکاح سے قبل زیورات چیک کر لیں۔"

"ٹھیک ہے....." مناف بولا۔ "آپ تسلی کر کے ہی رقم دے دیں۔"

www.pdfbooksfree.pk

"پہلے آپ رقم لے ہی لیں....." شاہ جہاں نے جیب سے ایک گڈی نوٹوں کی نکال کر مناف کی طرف بڑھائی۔ "پورے ایک لاکھ ٹاکا ہیں..... سارے پانچ پانچ ہزار کے نوٹ ہیں۔ آپ اچھی طرح سے گن لیں۔"

مناف نے اسی وقت رقم کی گنتی کی..... پھر اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ "شکریہ....."

کیا لڑکی ابھی تیار نہیں ہوئی.....؟" شاہ جہاں نے پھولا ہوا بٹوا جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "جلدی کریں۔"

"اس کا سنگھار کیا جارہا ہے....." مناف نے جواب دیا۔ "صرف دس منٹ لگیں گے۔"

"لڑکی وہی ہے نا.....؟" شاہ جہاں نے پوچھا۔ "نسیمہ جہاں کی جگہ کوئی اور لڑکی تو نہیں ہے؟"

"ارے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں شاہ جہاں صاحب....." مناف نے کہا۔ "یہ وہی لڑکی ہے جس کی تصویریں دکھائی تھیں..... ہم ایسا کام ہرگز نہیں کرتے ہیں....."

"اس لڑکی کے لواحقین میں سے کوئی نظر نہیں آرہا ہے؟" شاہ جہاں نے کہا۔

"میں نے پہلے ہی آپ سے عرض کردیا تھا کہ دنیا میں اس لڑکی کا کوئی نہیں ہے....." مناف کہنے لگا۔ "وہ یتیم ہے..... تین ماہ پہلے جو لکشام ریلوے اسٹیشن پر ریل گاڑی کو جو حادثہ پیش آیا تھا اس میں اس کا خاندان ختم ہوگیا تھا۔ وہ یتیم خانے میں تھی..... اتنی حسین اور ایسی حسین کہ آپ نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔"

"مناف صاحب.....! ایک گواہ کا تو بندوبست کرنا ہوگا..... آپ وکیل کے فرائض انجام دیں گے۔" قاضی نے کہا جو دوسرا گواہ نہیں ہے۔ اس کے دستخط اور نام لے کر دوں گا..... میں نے یہ بات آپ کو پہلے ہی بتادی تھی۔"

"کیا ٹیکسی ڈرائیور گواہ بن سکتا ہے.....؟" شاہ جہاں نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں....." قاضی نے جواب دیا۔ "کسی راہ گیر کو بھی پکڑ کر لائیں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا..... خانہ پوری جو کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے میرے ساتھ جو ٹیکسی ڈرائیور ہیں اسے بلا کر لے آتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

ٹائیگر آکر ٹیکسی میں اسٹیرنگ پر بیٹھ گیا۔ جب شاہ جہاں آیا تو ٹائیگر نے کہا۔

"کیا ہوا کام ختم ہوگیا۔؟" ٹائیگر سیدھا ہوتا ہوا بولا۔ "کیا واپس چلنا ہے۔؟"

"نہیں دس پندرہ منٹ اور لگیں گے۔" شاہ جہاں نے کہا۔ "تم سے ایک کام آن پڑا ہے۔؟"

"کیا.....؟" ٹائیگر نے انجان بن کر پوچھا۔ "کیا آپ کو کچھ اور دیر ہوجائے گی۔؟"

"میری اس وقت شادی ہورہی ہے۔" شاہ جہاں نے کہا۔ "اتفاق سے ایک گواہ کی ضرورت پڑ رہی ہے..... میں چاہتا ہوں کہ تم گواہ بن کر میرا مسئلہ حل کردو۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

"معلوم نہیں..... کیا پھڈا ہے..... میں کیوں گواہ بن جاؤں..... جب کہ لڑکی نہ تو مجھے جانتی ہے اور نہ میں اسے....." ٹائیگر نے کہا۔ "خدا کے لیے مجھے معاف ہی رکھیں۔"

"میں تمہیں دو ہزار ٹاکا دوں گا....." شاہ جہاں نے اندرونی جیب سے بٹوا نکالتے ہوئے کہا۔ پھر پانچ پانچ ہزار کے چار نوٹ ہاتھ پر رکھ دیے۔

"کل کہیں میں کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں.....؟" ٹائیگر نوٹ لیتے ہوئے بولا۔

"نہیں..... نہیں..... یہ خانہ پوری کی ایک رسمی کارروائی ہے۔" شاہ جہاں نے کہا۔

جب وہ شاہ جہاں کے ساتھ اندر پہنچا تو اسی وقت برابر والے کمرے سے دو عورتیں دلہن کو لے کر آئیں۔ انہوں نے دونوں طرف سے دلہن کے بازو اس طرح سے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے جیسے وہ

بھاگنا چاہتی ہے پھر وہ اسے لے کر بڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

ٹائیگر نے دیکھا۔ لڑکی نہایت حسین تھی۔ اس میں جاذبیت اور دلکشش تھی۔ وہ مسلسل روتی جارہی تھی۔ سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی کہ۔ "مجھے اس مردود اور خبیث انسان سے کسی قیمت پر شادی نہیں کرنی ہے..... اس نے میرے ماں باپ بھائی اور بہن کو جھوٹے الزام میں حوالات میں بند کرا دیا ہے..... صرف مجھ سے شادی کرنے کے لیے..... میں مرجاؤں گی..... ہرگز اس حرام زادے سے شادی نہیں کروں گی۔"

"صاحب جی.....! یہ کیا معاملہ ہے.....! یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے.....؟ لڑکی کی مرضی اور اجازت کے بغیر زبردستی اور جبراً شادی کرنا جرم ہے۔" ٹائیگر نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو گواہ نہیں بنوں گا۔ مجھے معاف کریں۔"

لڑکی ماں باپ کی موت کے بعد صدمہ سے پاگل ہوگئی ہے۔" شاہ جہاں نے کہا۔ "شادی کے بعد جب اسے میری محبت اور پیار ملے گا۔ تو نارمل ہو جائے گی۔"

"نہیں..... نہیں..... یہ جھوٹ ہے..... میرے والدین حیات ہیں۔ بہن بھائی بھی زندہ ہیں..... یہ میری خوبصورتی پر ریجھ گیا ہے..... میری جوانی کا دشمن ہوگیا ہے..... یہ مجھ سے خوب کھیل کود کر کولکتہ لے جا کر بیچ دینا چاہتا ہے..... یہ طوائفوں کا دلال ہے۔ اس کا یہی کام ہے..... خدا کے لیے اس شیطان مردود سے بچاؤ۔"

پھر ایک عورت نے اپنے کندھے سے لٹکے ہوئے پرس سے ایک بوتل نکال کر دکھائی اور کرخت لہجے میں بولی۔

"یہ دیکھ رہی ہو نا..... میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں..... کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے چہرے اور جسم پر ڈال دوں۔"

"نہیں..... نہیں" لڑکی نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"قاضی صاحب.....! جلدی سے نکاح پڑھائیں....." شاہ جہاں نے کہا۔

اس عورت نے جو تیزاب سے بھری بوتل دکھائی تو لڑکی سیدھے راستے پر جیسے آگئی۔ قاضی نے نکاح نامہ پر کیا۔ ٹائیگر کا نام پوچھا۔ ٹائیگر نے اپنا نام وہی بتایا جو قاضی کا تھا..... قاضی پہلے تو بڑا حیران ہوا۔ اس کے دستخط لیے۔ پھر اس نے نکاح پڑھایا۔ لڑکی کے دستخط لینے چاہے تو اس نے صاف انکار کردیا۔ پھر زبردستی اس کے انگوٹھے پر سیاہی مل کر اسے نکاح نامہ میں لگادیا گیا۔

نکاح ہونے کے بعد منہ میٹھا کرایا گیا۔ ٹائیگر نے ان دونوں یعنی مناف اور شاہ جہاں پر جوش انداز سے بغل گیر ہو کر مبارک باد دی۔ پھر اس لڑکی کو ان دونوں عورتوں نے جبر سے ٹیکسی میں سوار کرایا۔ جب ٹیکسی نے نصف گلی پار کرلی تو ٹائیگر نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ مناف ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کرتے اور پیچھے بھاگ کر آتے دیکھا۔ اس نے ٹیکسی روکی نہیں اس کی رفتار تیز کردی۔ وہ چیختا چلاتا رہ گیا..... شاہ جہاں نے یہ نہیں دیکھا تھا۔ کیوں کہ وہ دلہن کے ہاتھ کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کررہا تھا۔ دلہن ہر بار اس کا ہاتھ جھٹک دے رہی تھی۔ یہ نفرت کا اظہار ہورہا تھا۔

"میری جان نسیمہ..... فلائٹ رات بارہ بجے کی ہے..... ابھی اس میں ایک گھنٹہ باقی ہے..... ہم رات کے ایک بجے چٹاگانگ میں ہوں گے..... میں نے وہاں کے مسکن ہوٹل میں روم بک کرایا ہوا ہے..... سہاگ کی پہلی رات گزار کر دوسرے دن رنگامائی چلے جائیں گے۔ وہاں سات دن رہ کر پھر کاکس بازار آجائیں گے..... اب تو خوش ہوجاؤ۔"

شاہ جہاں نسیمہ سے محبت بھری باتیں اور

www.pdfbooksfree.pk

جذباتی حرکتیں کئے جا رہا تھا۔ نسیمہ اسے نفرت، حقارت اور غصے سے بار بار ایک طرف دھکیل رہی تھی۔ جب ایک دم جھٹکے سے ٹیکسی رکی تو ان دونوں نے چونک کر دیکھا۔ ٹیکسی ایک بہت بڑے میدان میں کھڑی تھی۔ گھپ اندھیرا تھا وہاں سے سڑک نصف فرلانگ پر تھی۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

ٹائیگر کے ہاتھ میں ایک لوہے کا سریا تھا۔ اس نے فضا میں ہاتھ ہلاتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"شاہ جہاں..... !اگر آپ اپنی زندگی اور سلامتی چاہتے ہیں تو..... صرف اکیلے نیچے تشریف لے آئیں۔"

"یہ کیا بدمعاشی ہے....." وہ غصے سے بولا۔

"بدمعاشی تو تم نے کی ہے اس لڑکی اور اس کے ماں باپ اور بھائی بہن کو جیل کے اندر کرا دیا..... ان کا جرم کیا تھا.....؟"

"میں کہتا ہوں تم ہمارے معاملے میں ٹانگ مت اڑاؤ....." شاہ جہاں بگڑ کر بولا۔ "میں نے تمہیں کرایہ دے دیا ہے۔ تم ہمیں وہاں پہنچا دو ..... یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تم میری بیوی کو لے اڑو....."

"میں کہتا ہوں شرافت سے باہر آ جاؤ....." ٹائیگر نے کہا۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے..... میں دس تک کی گنتی گن رہا ہوں..... تم باہر نہیں آئے تو پھر یہاں تمہاری لاش ہوگی..... تخت یا تختہ.....؟"

شاہ جہاں سمجھ گیا کہ اس بدمعاش کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔ زیورات اور حسین لڑکی دیکھ کر اس نے اونچا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنا لیا ہے..... اب وہ اسے قتل کر دے گا۔ یہاں دور دور تک آدم ہے نا آدم زاد..... اگر وہ نیچے نہیں اترا تو وہ واقعی اسے قتل کر دے گا۔ وہ بادل نخواستہ نیچے اتر آیا تو ٹائیگر نے کہا۔ "سامنے مشرق ہے..... اب تم اس طرف بھاگو..... پلٹ کر دیکھو گے تو پتھر کے ہو جاؤ گے....."

لوہے کا سریا اور ٹائیگر کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ بگٹٹ مشرق کی سمت بھاگنے لگا۔ اس کا سینہ پھولا جا رہا تھا۔

اور نسیمہ نے اس مردود سے نجات پانے کے لئے دل میں سوچا..... اللہ نے اس درندے سے نجات دلا دی۔ لیکن کیا وہ اس کی دسترس سے محفوظ رہے گی؟ پھر اس نے ٹائیگر کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"خدا کے لیے جلدی سے گاڑی یہاں سے نکال لیجئے..... کہیں وہ بدمعاش کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ پولیس کو لیتا ہوا نہ آ جائے۔"

ٹائیگر نے بڑے اطمینان سے دوازہ کھولا۔ اس نے سریا فرش پر رکھا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ بے فکر رہیں..... جب تک وہ پولیس تک پہنچے گا ہم گھر پہنچ چکے ہوں گے..... ہمارے ہاتھ لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اگر اس نے آپ کی گاڑی کا نمبر بتا دیا ہوگا تو پھر پولیس پہنچ جائے گی۔" وہ معصومیت سے بولی۔

ٹائیگر ہنس پڑا۔ اس کی سادگی پر..... پھر اس نے کہا۔ "محترمہ..... اس شہر میں سینکڑوں نہیں ہزاروں ٹیکسیاں ہیں۔ اس مردود نے ٹیکسی کا نمبر نوٹ تھوڑی کیا ہوگا..... اور پھر میدان میں گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے سے رہا۔ کیسا سخت اندھیرا ہے..... پولیس کو کیا پڑی کہ دردسری مول لے..... وہ اس کی جیب گرم کرنے پر وہ یہ نیک کام صبح ہی انجام دے گی۔"

جب گاڑی میدان سے نکل کر سڑک پر آئی تو وہ لڑکی خوف زدہ ہو گئی اور خوف زدہ نظروں سے باہر جھانکتی اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ ٹائیگر نے اسے پھر تسلی دی۔ "قابو میں رکھیے اپنے آپ کو..... میں نے کہا نا کہ آپ کا بال تک بیکا نہیں ہوگا۔"

"بات یہ ہے کہ اس نے اس کے لیے مناف کو ایک لاکھ ٹاکا دے کر خریدا..... اور پھر میرے بدن پر تو عروسی جوڑا ہے وہ تیس ہزار کی قیمت کا ہے..... یہ زیورات جو میرے بدن پر ہیں یہ بھی لاکھوں کے ہیں..... اس صورت میں کیا وہ خاموش بیٹھ جائے گا..... مجھے تلاش نہیں کرے گا..... پولیس میں رپورٹ نہیں کرے گا۔"

"اس کے پاس شادی کا کیا ثبوت ہے.....؟" ٹائیگر نے پوچھا۔

"اس کے پاس جو نکاح نامہ ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "اس پر مناف کے علاوہ اس مردود دلہا، میرے انگوٹھے کا نشان اور گواہ میں آپ کے دستخط ہیں..... اس پر حق مہر چالیس ٹاکا لکھا ہوا ہے۔"

"اوہ..... اس نکاح نامہ کی آپ بات کر رہی ہیں۔" ٹائیگر نے اس کی طرف جیب سے نکاح نامہ نکال کر بڑھایا اور اندر روشنی کر دی۔ "اچھی طرح سے دیکھ لیں۔ آپ اسی کی بات کر رہی ہیں نا....."

نسیمہ نے غور سے اس نکاح نامہ کو دیکھا اور پھر ششدر ہو کر بولی۔ "جی ہاں یہی ہے۔ لیکن آپ کے پاس کہاں سے آیا؟"

"جس وقت قاضی نے اسے نکاح نامہ دیا تو اس نے جب میں تہہ کر کے رکھ لیا تھا۔ باہر نکلتے وقت میں نے نکال لیا تھا۔"

"اس کا کیا کروں.....؟" وہ بولی۔ "یہ مصیبت بن کر پھندا تو نہیں بن جائے گا؟"

"اس کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیں۔" ٹائیگر نے روشنی بند کر دی۔ "اس کی کوئی قانونی اور شرعی حیثیت ہی نہیں ہے کیونکہ آپ کے قبول کرنے کے باوجود قاضی نے نکاح پڑھا دیا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔"

"کیا میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتی ہوں.....!" نسیمہ نے ایک گہرا سانس لے کر پوچھا۔ اس نے نکاح نامہ کے پرزے پرزے کر دیئے۔

"وہ کس لیے.....؟" ٹائیگر نے کہا۔ "نام میں کیا رکھا ہے؟"

"اس لیے کہ آپ مسیحا بن کر آئے اور بد معاشوں سے بچایا۔" وہ بولی۔ "میں کیا اپنے محسن کا نام بھی نہ جانوں.....؟"

"آپ میرا نام سنیں گی تو ڈر جائیں گے اور چلتی ٹیکسی سے خوف زدہ ہو کر اتر جائیں گی۔" وہ شوخی سے بولا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں ڈروں گی نہیں اور نہ ٹیکسی سے چھلانگ لگا دوں گی۔" وہ مسکرا دی۔

"میرا نام ٹائیگر ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں انٹرنیشنل ٹائیگر کہلاتا ہوں۔"

"آپ نے اپنا نام ٹائیگر کیوں رکھا.....؟ شیر رکھ لیتے.....؟" وہ بولی۔ "شیر بنگال۔"

اس لیے کہ اس نام کو سن کر ہر کوئی ڈر اور خوف کھاتا ہے..... نام انگریزی میں ہو تو رعب بھی پڑتا ہے۔"

"آپ مجھے اس وقت کہاں لے جا رہے ہیں۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرے گھر والے جیل میں ہیں اب وہ حرام زادہ اس پولیس اسٹیشن جا کر انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے میرے خلاف جھوٹا الزام لگائے گا تاکہ ان پر تشدد اور ظلم کے پہاڑ توڑ دیں..... وہ میرا بدلہ ان سے لے گا..... میری چھوٹی بہن چودہ برس کی ہے کہیں وہ اسے زیادتی کا نشانہ نہ بنائیں..... پولیس کتنی ظالم اور درندہ صفت ہوتی ہے آپ جانتے ہیں....."

"میں آپ کو گھر لے جا رہا ہوں۔" ٹائیگر نے جواب دیا۔ "فکر مند اور پریشان نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کل آپ کے گھر والوں کو کسی بھی وقت حوالات سے نکال کر لے آؤں گا..... وہ پولیس کے پاس اس وقت جانے سے رہا۔ جانا ہے تو جائے....."

ٹائیگر نے گھر کے سامنے ٹیکسی روکی۔ تالا کھولا اور اسے اندر لے کر آیا۔ نسیمہ اندر آئی۔ وہ کچھ خوف زدہ

www.pdfbooksfree.pk

اور پریشان سی ہوگئی۔ ایک ان جان جگہ اسے ڈر لگنے لگا..... ٹائیگر آخر ایک مرد تھا..... اجنبی تھا اس نے ایک ناگ سے بچایا تھا۔ کہیں وہ اسے ڈس نہ لے مرد اور ناگ میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ ٹائیگر نے اندر لا کر کمروں میں روشنی کی..... کمروں کا وہ جائزہ لینے لگی۔ حالت زار دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ یہ شخص اکیلا رہتا ہے۔

''چونکہ اس گھر میں کوئی عورت نہیں رہتی اس لیے گھر کباڑ خانہ سا لگ رہا ہے۔'' ٹائیگر نے کہا۔ ''ایک منٹ آپ تشریف رکھیں میں ابھی آتا ہوں..... ویسے آپ پریشان نہ ہوں۔''

پھر ٹائیگر ہاشم میاں کے پاس جا کر ایک زنانہ جوڑا لے آیا اور اس سے بولا۔ ''شاید آپ نے دن بھر کچھ نہیں کھایا..... میں نے بھی رات کا کھانا نہیں کھایا ہے..... میں جا کر کھانا لاتا ہوں..... آپ دروازہ بند کرلیں اور کپڑے بھی بدل لیں۔''

ٹائیگر کو چکن بروسٹ اور چکن تکے اور کولڈ ڈرنکس لانے میں نصف گھنٹہ لگ گیا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اسے یقین نہیں آیا۔ اس کے گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے میں نہ صرف اس کا گھر بلکہ باورچی خانہ بھی آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہ لڑکی بہت سلیقہ مند اور سگھڑ ہے۔ جس شخص کی بھی زندگی میں جائے گی وہ بڑا خوش نصیب ہوگا۔

نسیمہ جہاں ماں باپ کی وجہ سے سخت پریشان تھی اس لئے اس کی بھوک اڑ گئی تھی اس کا بستر ایک چوکی پر تھا۔ ٹائیگر نے اس پر اخبار بچھا کر دسترخوان بنا دیا۔ جب ٹائیگر نے اسے دلاسا دیا تب جا کر اس نے کھایا۔ فراغت پانے کے بعد ٹائیگر نے کہا۔

''میں کولڈ ڈرنک کا بالکل بھی عادی نہیں ہوں۔ باورچی خانے میں دودھ پاؤڈر، چائے پتی اور چینی..... کیتلی اور کروکری بھی ہے..... اگر آپ اچھی چائے بنا سکتی ہیں تو بنا لائیں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ چائے بنا کر لائی بہت اچھی اور ذائقہ دار چائے تھی۔ ٹائیگر نے چائے کی تعریف کر کے پوچھا۔

''شاہ جہاں کا کیا مقصد ہے.....؟ وہ کون ہے.....؟ وہ آپ کو کیسے جانتا ہے؟''

''میرے ابو اس کے دفتر میں کلرک ہیں..... اس نے ابو کے ساتھ مجھے بازار میں دیکھ لیا۔ تب سے وہ ابو کے پیچھے پڑ گیا کہ میری شادی اس سے کرا دیں۔ اس کی دو بیویاں اور سات بچے بھی ہیں۔ انکار کرنے پر پولیس کیس بنا دیا۔ پولیس کی مٹھی گرم کر دی۔''

''میں پولیس کی مٹھی گرم کر کے آپ کے گھر والوں کو رہا کروالوں گا۔'' ٹائیگر نے اسے دلاسا دیا۔

''پولیس بڑی رشوت خور ہے..... وہ بڑی بڑی رقم مانگے گی۔'' نسیمہ بولی۔

''اس کی فکر نہ کرو۔'' ٹائیگر کہنے لگا۔ ''کیا آپ نے سنا نہیں کہ رشوت لیتے ہوئے پکڑے گئے تو رشوت دے کر چھوٹ جائیں..... ہم بھی پولیس کو رشوت دے کر چھوٹ جائیں گے۔''

''لیکن رشوت دینے کے لیے پیسے میرے پاس ہیں اور نہ میرے ماں باپ کے پاس..... وہ تو حوالات میں بند ہیں..... ہم غریب ہیں..... پولیس کو رشوت کہاں سے لا کر دیں گے۔'' وہ بڑی رقم مانگیں گے.....''

چونکہ اس نے پولیس کو رقم دے کر گرفتار کروایا ہے لہٰذا ہم اس کی رقم پولیس کو رشوت دے کر آپ کے گھر والوں کو رہا کروائیں گے؟''

''لیکن ہمارے پاس اتنی رقم کہاں ہے جو گھر والوں کو رہا کروائیں گے؟'' نسیمہ کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔

''کیوں نہیں ہے.....'' ٹائیگر مسکرایا۔ پھر اس نے جیب سے پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈی اور دوسری جیب سے ایک پھولا ہوا بٹوا نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ ''یہ ہے شاہ جہاں کی رقم.....''

''یہ کہاں سے اور کیسے آئی آپ کے پاس.....؟'' نسیمہ بھونچکی سی ہوگئی۔

''جب آپ کا نکاح ہوگیا تو مبارک باد دینے کا سلسلہ چلا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں سے بغل گیر ہوتے ہوئے ان کی جیبیں صاف کردیں..... یہ ایک لاکھ کی رقم ہے جو شاہ جہاں نے مناف کودی..... شاہ جہاں کا بٹوا..... میں نے رقم گنی نہیں ہے..... ایک منٹ میں رقم گن لوں.....''

پھر ٹائیگر نے بٹوے کی زپ کھول کر بٹوا الٹ دیا۔ اس میں چھوٹے کم بڑے نوٹ زیادہ تھے..... پھر ٹائیگر نے گنا..... دو لاکھ بیس ہزار سات سو دس ٹاکا تھے..... پھر اس رقم کو وہ پرس میں رکھتے ہوئے بولا۔

''اب کسی بات کی فکر نہیں..... تیس چالیس ہزار سے کام بن جائے گا..... میں کل انہیں جا کر رہا کروالاؤں گا۔'' ٹائیگر نے کہا۔

''لیکن ایک اور بات فکر اور ہراساں کر رہی ہے.....'' نسیمہ نے متفکرانہ انداز سے کہا۔

''وہ کیا.....؟'' ٹائیگر کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ ''رہائی کے بعد کیا مسئلہ ہے۔؟''

''اس لیے کہ وہ ہمیں جینے نہیں دے گا..... اس کے پاس حرام کی دولت کی کیا کمی ہے..... وہ میرے حصول تک چین سے نہیں بیٹھے گا..... پھر میرے والدین کو ہراساں اور پریشان کرتا رہے گا۔ آخر آپ کب تک اس سے الجھتے رہیں گے۔''

''اگر آپ لوگ کسی اندرونی شہر اور قصبے میں جا کر بس جائیں گے تو کیا یہ بہتر نہیں رہے گا.....؟''

''نہیں.....'' اس نے سر ہلایا۔ ''وہ شیطان مردود ہے۔ ہمیں ڈھونڈ نکالے گا۔''

''ہاں یہ تو ہے..... آپ کی نظر میں کوئی اور صورت ہے.....؟'' ٹائیگر نے پوچھا۔

''ہاں..... ہے..... لیکن مشکل لگتا ہے.....'' اس نے مایوسی سے جواب دیا۔

''کس بات کی مشکل ہے.....؟'' ٹائیگر نے کہا۔ ''کھل کر بتائیں کوئی بات ناممکن اور مشکل نہیں ہے۔''

''میرے چچا نیپال میں ہیں۔ ہم کسی طرح کولکتہ پہنچ جائیں..... پاسپورٹ اور ویزا کے حصول میں زیادہ دن لگ جائیں گے..... ہم ایک دن بھی دیش میں رہنا نہیں چاہتے ہیں..... کولکتہ سے نیپال کے لیے کوئی ویزا نہیں ہے..... پاسپورٹ نہیں ہے.....''

''بس اتنی سی بات کے لے اس قدر پریشان ہو رہی ہیں۔'' ٹائیگر ہنسا۔ ''میرا ایک دوست ہے..... وہ فی کس ہزار ٹاکا لیتا ہے..... اسے دس ہزار کی رقم دینے سے وہ آپ سب کو بہ حفاظت ہندوستان پہنچا دے گا..... اعتبار کا آدمی ہے..... میرا دوست بھی ہے۔ کل میں آپ کے گھر والوں کو حوالات سے نکال لاؤں گا..... دوسرے دن علی الصبح وہ ہوائی جہاز سے لے جائے گا..... پھر وہ وہاں سے ہندوستان کی سرحد پار کرا دے گا..... پھر آپ نیپال چلے جائیں..... یا ہندوستان کے کسی بھی شہر..... لیکن وہاں کسی کو کچھ بتانے کی قطعی ضرورت نہیں کہ آپ بنگلہ دیشی ہیں..... یوں بھی مغربی بنگال میں آپ لوگ مقامی لگیں گے۔''

''لیکن اتنی رقم کہاں سے لائیں گے.....؟'' وہ افسردگی سے بولی۔

''اوہ..... سیدھی سادی بلکہ بے وقوف لڑکی.....'' ٹائیگر مسکرایا۔ ''یہ ساری رقم کس کی ہے اور کس دن کام آئے گی.....'' پھر اس نے عروسی لباس اور ان زیورات کی طرف اشارہ کیا جو اس نے پہنے ہوئے تھے۔ ''یہ ساری رقم آپ کی ہے..... اور میں ان زیورات کو فروخت کر کے دے دوں گا..... زیورات کا ساتھ لے جانا خطرے سے خالی نہیں ہے..... ان زیورات کے پانچ چھ لاکھ مل جائیں گے..... البتہ عروسی جوڑا ضرور ساتھ لے جائیں۔

www.pdfbooksfree.pk

جب شادی ہوگی تب آپ پہن لیں۔"

"کیا.....؟" نسیمہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "یہ لاکھوں کی رقم میری.....نہیں.....نہیں..... یہ آپ کی ہے.....میں نہیں لوں گی۔"

"آپ وہی کریں گی جو میں کہوں گا....." ٹائیگر نے کہا۔ "اب آپ میرے ساتھ چلیں۔"

"کہاں.....؟"

"اس گلی میں ہاشم میاں کا گھر ہے.....سارا محلہ انہیں چچا کہتا ہے۔ ان کی چھ لڑکیاں ہیں۔ رات آپ ان کے گھر میں بسر کریں گی.....آپ کے گھر والوں کو لانے تک آپ یہیں رہیں گی۔"

دسرے دن ٹائیگر پولیس والوں سے بیس ہزار ٹاکا میں بات کر کے نسیمہ جہاں کے گھر والوں کو حوالات سے نکال لایا۔ شاہ جہاں نے پولیس والوں کو دس ہزار کی رقم دی تھی۔ اس نے بیس ہزار روپے دیے تو پولیس نے خوشی خوشی انہیں رہا کر دیا تھا۔ وہ دوسرے دن روانہ ہو گئے۔ کھٹمنڈو سے نسیمہ کا فون آ گیا وہ سب رقم، مال اسباب سمیت سب خیریت سے پہنچ گئے۔ دعا کریں کہ ان کی زندگی جواز سر نو ہو گی وہ خوش گوار ہو.....اتنی رقم ان کے پاس تھی اب انہیں کسی کی محتاجی کی ضرورت نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کے گیارہ بج چکے تھے، نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بستر پر دراز سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ وہ کچھ دنوں کے لیے ممبئی شہر ہو آئے.....تارا نے اسے جانو اور جعفر کو کیفر کردار تک پہنچانے کے عوض جو رقم دی وہ ممبئی میں دو ماہ سے زیادہ دن رہ کر سیر و تفریح اور عیش کر سکتا تھا۔ وہاں تفریحات اور رنگینیوں کی کمی نہ تھی۔ وہ ممبئی سال دو سال میں چکر لگاتا رہتا تھا جب کوئی اونچا ہاتھ مارتا تھا۔ اس کے وہاں کچھ دوست اور واقف کار بھی تھے۔ وہاں کی زیر زمین دنیا میں وہ بلیک ٹائیگر کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے ممبئی شہر میں جو دو ایک کارنامے انجام دیے تھے خطرناک بدمعاش بھی اس سے خوف کھاتے تھے۔

اس کی دو بہت بڑی کمزوریاں تھیں.....ایک تو ریس اور دوسری تھی بازی.....وہاں کچھ کارخانے ایسے تھے جہاں اونچے پیمانے پر کھیل ہوتا تھا.....جس میں نہ صرف سرمایہ دار مرد اور عورتیں.....بلکہ فلم نگری کی اعلیٰ ترین شخصیات بھی آتی تھیں.....ان میں بڑے بڑے نام ور اور مقبول اداکارائیں آتی تھیں جو اپنے کالے دھندوں کی آمدنی سے کھیلتی تھیں.....اس کے علاوہ اداکارہ فلم ساز اور ہدایت کار بھی.....وہ انہیں قریب سے دیکھتا اور ان کے ساتھ کھیلتا بھی تھا.....اس کی وہاں بڑی چاندی ہو جاتی تھی۔ اس کی انگلیاں فنکارانہ مہارت دکھاتی تھیں.....اور پھر ریس جو پورے ہندوستان میں مشہور تھی.....ریس میں بھی اس کا مقدر ساتھ دیتا تھا.....وہ مقدر کا سکندر تھا۔ جب وہ واپس ڈھاکا آتا تو اس وقت کسی ریس زادے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس نے ممبئی یاترا جانے کا پروگرام بنالیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے چونک کر دیوار کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر اسے ایک خیال آیا کہ.....کہیں مناف اور شاہ جہاں پولیس کو لے کر پہنچ تو نہیں گئے.....کیوں کہ اس نے جو چوٹ دی تھی وہ ایسی تھی کہ ساری زندگی اس کی جلن اور درد ایسا تھا کہ انہیں انگارے کی طرح محسوس ہوتا رہے گا۔ پھر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بے خوفی سے بڑھا۔ پولیس اور ان دونوں سے نمٹنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

دروازے پر ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔ ٹائیگر اس سے کچھ پوچھتا اس نے چشم زدن میں ٹائیگر کے منہ پر کلوروفارم میں بھیگا رومال رکھ دیا۔ تو ٹائیگر چکرایا اور فرش پر گر گیا۔ اس اجنبی نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

(جاری ہے)

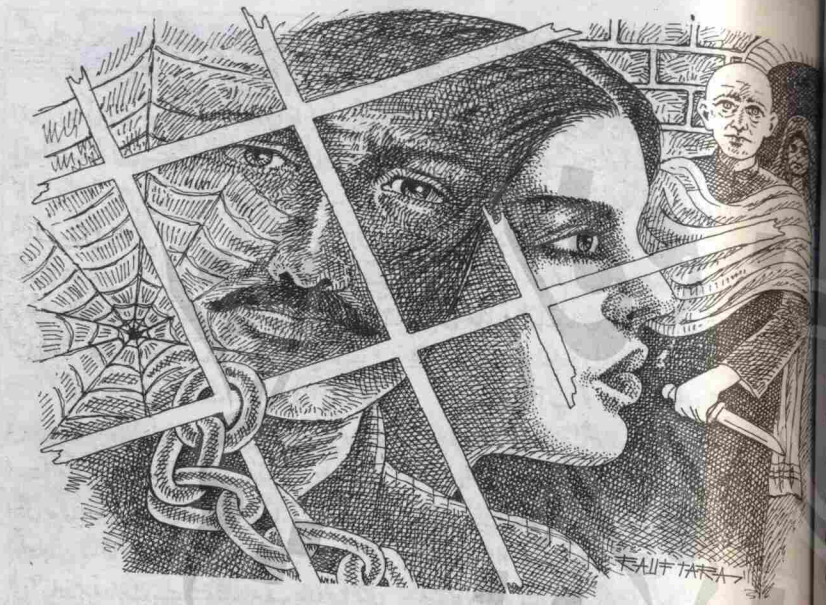

نفرت

ایس حبیب خان۔ کراچی

قرآنی آیات کا دم کیا ہوا پانی جیسے ہی نوجوان کے حلق سے نیچے اترا تو اچانک اسے اپنے پیٹ میں مروڑ محسوس ہوا، پھر اچانک الٹیاں شروع ہو گئیں، اور پھر اس کے بعد جو نظر آیا اسے، دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ اصل سے خطا نہیں اور کم نسل سے وفا نہیں، جس کا ثبوت کہانی میں مکمل موجود ہے۔

شہزاد کی چیخیں آسمان چھو رہی تھیں اور اس کے چیخنے کی آواز سن کر نواب احمد علی خان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ جوان بیٹے کی ایسی حالت دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ احمد علی خان کے دو بیٹے تھے، بہزاد اور چھوٹا شہزاد۔ شہزاد اچھا خاصا لمبا چوڑا اور صحت مند نوجوان تھا مگر گزشتہ کچھ عرصے سے وہ کسی نامعلوم پراسرار بیماری میں مبتلا ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا پیٹ پکڑتا اور تکلیف سے دوہرا ہو کر چلانے لگتا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے پیٹ کے اندرونی حصے جیسے جگہ جگہ سے کٹ رہے ہوں۔

وہ دورانِ تجدید نہ تھا کہ مریض کے اندر کا حال جان لیا جاتا۔ بے شمار طبیب آئے مگر شہزاد کو کسی کی دوا سے فرق نہ پڑا بلکہ اس کی حالت مزید خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی

www.pdfbooksfree.pk

تھیں اور رنگت زرد ہوگئی تھی۔

نواب احمد علی خان غصے سے کانپ رہے تھے۔ ”اس مردود کی اتنی ہمت ہوگئی کہ ہماری جاگیر کی بچی کو ہاتھ لگائے!“ اس سے پہلے بھی نواب احمد علی خان کے کانوں میں ”رام لال“ کی شکایتیں آئی تھیں۔ جنہیں انہوں نے نظر انداز کردیا تھا مگر اب کی بار رام لال کو جس بات کے لئے پکڑا گیا تھا وہ نواب صاحب کے نزدیک ناقابل معافی تھی۔ رام لال نے ایک مسلمان لڑکی کو اغوا کیا تھا۔ جس کو ایک آدمی نے دیکھ لیا تھا۔

نواب احمد علی خان کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی، انہوں نے رام لال کو سب کے سامنے کوڑے لگوائے اسے اٹھ کر جاگیر کے باہر پھینکوا دیا۔ رام لال کی شہرت اچھی نہ تھی، وہ گندے عمل اور جادو کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ لہولہان پڑا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ ”بہت پچھتائے گا احمد علی!“ اور مکروہ انداز سے ہنسنے لگا۔ صرف جادو ٹونا نہیں بلکہ وہ فطرتاً بھی نہایت گھٹیا تھا، اس کے دل میں مسلمانوں کے لئے نفرت بھری ہوئی تھی۔ حالانکہ ہندو مسلمان آپس میں مل جل کر رہتے تھے مگر اسے نہ جانے مسلمانوں سے کس جنم کا بیر تھا۔

شہزاد علی نے اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام بنایا۔ شہزاد احمد علی کی جاگیر جہاں ختم ہوتی تھی، وہاں ایک بہت گھنا جنگل تھا۔ شہزاد اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر وہاں شکار کیا کرتا تھا۔ وہاں ہرن کافی تعداد میں ملتے تھے۔ مگر اس دن تو انہیں دوپہر سے شام ہوگئی لیکن ہرن تو کیا ایک خرگوش بھی نہ ملا۔ لگ رہا تھا جنگل کے سارے جانور غائب ہوگئے ہوں۔ پھرتے پھرتے اندھیرا ہونے لگا۔ وہ لوگ تھکن سے نڈھال ہوکر ایک جگہ ٹھہر گئے اور بھوک سے حالت الگ بری تھی۔ ”یار! آج کا آنا تو بالکل بے کار گیا اور ہم ہیں بھی جنگل کے آخری سرے پر، واپس دوسری طرف گھر پہنچے میں تو رات ہوجائے گی۔“ شہزاد علی نے پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ یار! میرا تو بھوک سے دم نکلا جارہا ہے۔ ایاز نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”کون ہو تم سب؟“ ایک طرف سے آواز آئی تو سب نے اس جانب حیرت سے دیکھا۔ ایک آدمی جو کہ کافی بوڑھا تھا لکڑیوں کا گٹھر باندھ رہا تھا۔

”ہم شکار کے لئے آئے تھے، وہ تو نہیں ملا، اب بھوک اور تھکن نے برا حال ہے۔“ دلاور نے بوڑھے سے کہا۔

”ایسا کرو، تم لوگ میرے ساتھ میرے گھر چلو، وہاں کھانا کھالینا۔“ اس نے شہزاد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں آپ کو زحمت ہوگی، ہم خود کوئی بندوبست کریں گے۔“ شہزاد نے اس سے کہا، نہ جانے کیوں اس کو بوڑھے کا چہرہ دیکھا ہوا سا لگ رہا تھا۔

”جیسے تمہاری مرضی مگر اندھیرے میں نہ تو کوئی شکار ملے گا اور نہ یہاں کوئی انسان! میں تو لکڑیاں لینے آتا ہوں اس لئے آج تمہیں مل گیا۔“ یہ کہہ کر بوڑھا لکڑیوں کا گٹھر سر پر رکھ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

ہاشم نے کہا۔ ”یار! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

اور بوڑھے کو آواز دینے لگا۔ بوڑھے کا منہ دوسری طرف تھا مگر اس کے چہرے پر مکاری کی ہنسی تھی، پھر وہ اس بوڑھے کے ساتھ ہولئے۔ جنگل کے ختم ہونے پر دوسری طرف ایک مکان بنا ہوا تھا۔ وہ لوگ صحن میں بیٹھ گئے تھوڑی دیر بعد ان کے آگے کھانا رکھنا شروع کیا، کھانے میں آگ پر بھنا ہوا گوشت پارچوں کی شکل میں تھا اس کے علاوہ چاول اور پیاز بھی تھے۔

شہزاد نے گوشت کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کسی چیز نے اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔

شہزاد نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

”تم! یہ لو!“ بوڑھے نے ایک تھالی میں موجود گوشت کو شہزاد کے آگے کردیا اور خود دوسری تھالی میں ”چاول اور پیاز“ ڈال کر کھانے لگا۔ سب کھانا کھانے میں مشغول ہوگئے۔ بوڑھے کے چہرے پر خباثت رقص کررہی تھی۔

دن کا سورج نکلتے ہی وہ لوگ واپس روانہ

ہوگئے اور بوڑھے کو زبردستی کافی سارے پیسے دے دیئے۔

شہزاد گھر آکر آرام کرنے لگا اور شام ہونے تک شہزاد کی طبیعت خراب ہونے لگی، اسے عجیب سا محسوس ہونے لگا، ایسا لگ رہا تھا کوئی چیز اس کے پیٹ میں حرکت کررہی ہو، آہستہ آہستہ اس کو تکلیف محسوس ہونا شروع ہوئی، پھر تو وہ دن ہے اور آج کا دن، شہزاد کی چیخوں سے کمرہ گونج اٹھتا ہے۔ کسی کی سمجھ میں اس کی تکلیف نہیں آرہی تھی، کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں اسی کا علاج نہ کرایا گیا ہو۔

ایک روز نواب احمد علی خان کا ذہن اپنے ایک جگری دوست فرقان احمد کی طرف گیا۔ وہ حیران تھے، انہوں نے پہلے اس بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ فرقان احمد حکمت اور روحانی علوم دونوں سے واقف تھے اور ان کی دوستی تیس سالوں پر محیط تھی۔ فرقان احمد کا خیال آتے ہی انہوں نے ایک تار روانہ کروادیا۔ پھر کیا تھا۔ فرقان احمد دوڑے چلے آئے۔

گھر کا ماحول سوگوار تھا۔ نواب احمد علی بے تابی سے ان کے گلے لگ گئے۔ فرقان احمد کو اپنا کرتا بھیگا ہوا محسوس ہوا تو ان کا دل کٹنے لگا۔ انہوں نے اپنے دوست کو تسلی دی اور شہزاد کو دیکھنے اس کے کمرے میں چلے آئے، اور معائنہ کرنے کے بعد اس سے تفصیلی گفتگو کرنے لگے۔

جب وہ اپنے کمرے میں آئے تو نواب احمد علی ان کے ہمراہ تھے۔ کمرے میں آکر وہ بولے۔ ”احمد علی! اوپر سے دیکھنے سے تو کچھ پتا نہیں چل رہا، آج رات میں اپنے علم کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ تم فکر مت کرو، انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔“

یہ سن کر احمد علی اپنے کمرے میں آگئے۔ ایک امید کی کرن ان کے دل میں جاگی تھی فرقان احمد کو دیکھ کر، پھر اگلے روز مغرب کے بعد فرقان احمد نے انہیں بلوایا اور ایک انتہائی بھیانک حقیقت ان کے سامنے رکھ

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عمیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہوجائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

www.pdfbooksfree.pk

دی۔ ''احمد علی! یہ کوئی بیماری نہیں ہے، شہزاد میاں پر ایک بہت ہی غلیظ عمل کیا گیا ہے، کسی نے اس کو ناپاک گوشت پر عمل کر کے کھلایا ہے۔ اس گوشت میں چیچڑیاں پیوست تھیں۔ جو شہزاد کے پیٹ میں اتار دیں گئی ہیں۔''

احمد علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''چیچڑیاں.....؟ یہ تو جنگلی کتوں کے جسم پر ہوتی ہیں ناں؟''

''ہاں احمد علی!'' فرقان احمد بولے.....

''یا اللہ رحم!'' انہوں نے بے ساختہ کہا۔ ''فرقان اب کیا ہوگا.....؟ میرا بیٹا کیسے ٹھیک ہوگا.....؟''

دل تھام کر سنو احمد علی! اور کسی کو گھر میں اس کی خبر نہ ہونے پائے اس مسئلے کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ شہزاد کو کتے کا گوشت کھلایا جائے۔ کیونکہ چیچڑیوں کو کتے کا گوشت مرغوب ہوتا ہے اور انہیں باہر لانے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ انہوں نے شہزاد کے معدے اور پھیپھڑوں میں گھس کر خون چوسنا شروع کر دیا ہے۔ اور اب اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر شہزاد کی جان بچانی ہے تو یہ کرنا پڑے گا۔ فی الحال درد میں کمی کے لئے میں پانی پر دم کر کے دیتا ہوں۔ اس سے وہ کچھ کمزور ہو جائیں گی۔ مگر باہر صرف اسی صورت میں آئیں گی جو میں نے کہی ہے۔''

احمد علی سوچ میں گم ہو گئے پڑھا ہوا پانی پینے سے شہزاد کو کچھ سکون ہوا مگر وقفے وقفے سے درد میں تیزی بھی آ جاتی۔

ایک روز شہزاد کی طبیعت بہتر دیکھ کر اس کے دوست زبردستی اسے باہر لے گئے۔ ''آج باہر کی تازہ ہوا کھا، تجھے سکون ملے گا چل ایسا کرتے ہیں، کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔'' ارباز بولا۔

''ہاں سنا ہے کہ ایک نیا ہوٹل کھلا ہے جہاں بہت ہی عمدہ اور لذیذ نہاری ملتی ہے۔''

''نہاری! دماغ درست ہے.....؟ میں کھچڑی کھاتا ہوں، وہ بھی ہضم نہیں ہوتی اور تجھے نہاری کی سوجھ رہی ہے۔'' شہزاد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''فکر مت کر تیرے حصے کی نہاری ہم کھالیں گے تو صرف بوٹیاں دھو کر کھالینا۔ بس؟'' اور سب ہنسنے لگے، شہزاد کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اس کو اس بات سے خوشی کا احساس ہوا کہ اس کے دوست اس کو اتنی اہمیت دیتے ہیں۔

وہ سب نئے ہوٹل کے سامنے رک گئے۔ ہوٹل کا مالک وہیں پر تھا اور کام کرنے والوں کو ہدایت دے رہا تھا۔ لمبی سی داڑھی، ماتھے پر نماز کا نشان، سر پر ٹوپی.....

شہزاد نے باتیں کرتے ہوئے اس کو دیکھا، اس کو ایک مرتبہ پھر وہی محسوس ہوا جو جنگل کے بوڑھے کو دیکھ کر ہوا تھا۔ مگر اس کے دوستوں نے اسے باتوں میں لگا لیا۔ پھر ان لوگوں کی آرڈر کی ہوئی نہاری آ گئی۔ ارباز نے منہ میں نوالہ رکھتے ہی..... ''واہ واہ'' شروع کر دی اور باقی دوست بھی تعریفیں کرنے لگے پھر ان لوگوں نے بوٹیاں پانی سے دھو کر شہزاد کو کھلائیں۔

شہزاد ڈر رہا تھا کہ اب درد اٹھے کہ تب درد اٹھے۔ پھر وہ سب گپ شپ لگا کر واپس آ گئے۔

شہزاد گھر آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ نواب صاحب بھی خوش تھے کہ آج اتنے دنوں بعد شہزاد کچھ بہتر لگ رہا تھا، ابھی بستر پر لیٹے ہوئے شہزاد کو ایک گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اسے ''اپنے پیٹ میں ہل چل سی محسوس ہوئی، کوئی چیز تھی، کچھ تھا جو سارے پیٹ میں سے رینگ کر ایک جگہ سمٹتا محسوس ہو رہا تھا۔''

آخری گاہک کا حساب کرنے کے بعد نہاری ہوٹل کے مالک نے ہوٹل بند کیا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے تہ خانے میں آ گیا۔ اور اس نے سر پر سے ٹوپی اور چہرے پر لگی داڑھی اتار کر ایک طرف رکھ دی اور ماتھے پر بنا نماز کا نشان ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کر دیا۔ ''ہاں بھئی چھوٹے آج کتنے شکار ہوئے۔'' اس نے دھوتی پہنے ایک کمر عمر لڑکے سے سوال کیا جو خون سے بھری بالٹی ایک برتن میں انڈیل رہا تھا۔

''مالک آج تو کافی شکار ملے ہیں اور پہلے کا

مال بھی رکھا ہوا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' کہہ کر وہ ایک کونے کی طرف چلا گیا۔ وہاں کالی ماتا کی مورتی لگی ہوئی تھی اس نے مورتی کے چرن چھوئے اور وہاں سے سیندور اٹھا کر اپنے ماتھے پر تلک لگایا اور ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرنے لگا..... ''جے کالی ماتا! مجھے میرے کام میں سپھلتا دے جو میں کر رہا ہوں، ان مُسلموں کا دھرم بھرشٹ کرنے کا۔'' یہ کوئی اور نہیں وہ منحوس رام لال تھا.....

ادھر شہزاد کی حالت عجیب ہو رہی تھی، وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا پھر اس سے برداشت نہیں ہوا تو اس نے مٹھیوں میں اپنے بال جکڑ کر چلانا شروع کر دیا۔ احمد علی اور فرقان احمد دوڑے ہوئے اس کے پاس آ گئے۔

فرقان احمد نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنا شروع کر دیا اور جب ان کی آنکھیں کھلیں تو ان میں بے پناہ حیرت تھی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟ آخر یہ ہوا کیسے؟'' فرقان احمد بڑبڑائے۔

''کیا ہوا؟'' احمد علی نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں، احمد علی تم جلدی سے ایک برتن میں پانی لاؤ۔'' اور احمد علی نے فوراً ملازم سے پانی منگا لیا تو فرقان احمد نے کچھ پڑھ پڑھ کر اس پانی پر پھونکنے لگے اور کافی دیر بعد انہوں نے شہزاد کو پکڑ کر وہ پانی اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ابھی پانی حلق سے اترے ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ شہزاد کو زوردار ابکائی آئی اور پھر اس نے اپنے معدے میں جو کچھ تھا وہ باہر اگل دیا اور ایک طرف ڈھلک گیا۔ اور جو کچھ اس کے معدے سے نکلا تھا اس کو دیکھ کر احمد علی اپنے منہ پر کپڑا رکھ لیا، وہ کیا تھا یہ بیان سے باہر ہے.....!

فرقان احمد نے احمد علی خان کو ایک طرف بلایا اور ان سے کہا..... ''ان کے بیٹے شہزاد علی نے کتے کا گوشت کھایا ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ فرقان؟'' احمد علی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں احمد علی! جو شہزاد کے معدے سے نکلا ہے وہ کسی طور پر بھی ممکن نہیں تھا ماسوائے کتے کے گوشت کے۔ پھر ان لوگوں نے اگلے روز شہزاد کے دوستوں سے معلوم کیا۔ دوستوں نے بتایا کہ ''وہ لوگ تو ایک نئے ہوٹل پر نہاری کھانے گئے تھے اور ان سب نے نہاری کھائی تھی جبکہ شہزاد نے بوٹیاں پانی سے دھلوا کر کھائی تھیں۔

''احمد علی! مجھے تو یہ کوئی نہایت ہی گندہ کھیل لگ رہا ہے۔''

فرقان احمد کی بات سن کر احمد علی سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے اس ہوٹل کے بارے میں خفیہ تفتیش کروائی تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس کے بعد ایک پلان کے مطابق بھرپور طریقے سے ہوٹل پر چھاپہ مارا گیا اور سارا گوشت ضبط کر لیا گیا۔ اور ہوٹل کے مالک کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہوٹل کے تہ خانے سے مورتی کے علاوہ کالے عمل کرنے کی اشیاء بھی برآمد ہوئیں۔ رام لال کو جب اس کی داڑھی اور ٹوپی ہٹا کر اصلی حالت میں لایا گیا تو نواب احمد علی حیران رہ گئے..... تو! بے غیرت انسان، تو اتنا گر سکتا ہے یہاں تک تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

رام لال نے ڈھٹائی سے اپنا جرم قبول کر لیا اور کہا۔ ''وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتا ہے اور نواب احمد علی سے بدلہ لینا تو اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا اس لئے اس نے شہزاد کو غلیظ عمل پڑھی ہوئی کتے کی چیچڑیاں کھلا کر شہزاد کی موت طے کری تھی اگر یہ منحوس بیچ میں نہ آتا تو وہ کب کا مر چکا ہوتا۔'' اس نے فرقان احمد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور نہاری! وہ میں مسلمانوں کا بھیس بدل کر نہاری کا ہوٹل چلا رہا تھا۔ اور نہاری، میں گلی، گلی سے آوارہ کتے یا جنگلی کتے مار کر ان کا گوشت مسلمانوں کو کھلا رہا تھا تا کہ حرام گوشت کھلا کر ان کا ایمان خراب کر سکے۔'' رام لال کو گرفتار کر لیا گیا۔

مسلمان تو مسلمان عام ہندوؤں نے بھی اس پر تھوتھو کی۔ اور شہزاد بالکل ٹھیک ہو گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

ساتواں جنم

صبار مضمان۔ پنڈ دادنخان

لڑکی نے اچھل کر جیسے ہی نوجوان پر حملہ کرنا چاہا تو اس کے ہاتھ قرآن مجید سے چھوتے ہی اچانک ایک زبردست شعلہ نکلا اور لڑکی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لڑکی کی فلک شگاف چیخیں درو دیوار کو دہلانے لگیں.....

جنم جنم کی ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش کہانی، جسے پڑھ کر عقل دنگ رہ جائے گی

"واہ..... میری فیورٹ چیز پیزا..... امتل خوشی سے جیسے پلیٹ پر جھپٹ پڑی۔"

"مزا آ گیا ماما..... چیز پیزا وہ بھی پیپسی کے ساتھ..... شکر ہے کہ آپ میری ماما ہیں۔ ورنہ مجھے اتنا مزیدار Pizza کون بنا کر دیتا۔"

"تمہارے بابا کو بھی بہت پسند تھا چکن Pizza....." ندرت بیگم افسردہ لہجے میں بولی۔ جبکہ امتل کے کانٹے میں لگا Pizza اور کھلا منہ ساکن ہو کر رہ گیا۔

"آپ کو ہزار بار منع کیا ہے ماما کہ ان کا ذکر میرے سامنے نہیں کیا کریں۔ سارا موڈ آف کر دیا آپ نے..... آخر انہوں نے ہمیں دیا ہی کیا ہے.....؟ آپ بھول کیوں نہیں جاتیں ان کو....." امتل نے برا سا منہ بنایا اور کھانے سے ہاتھ روک کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھی ہوئی پلیٹ دیوار میں دے ماری اور ٹیبل سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ماما مجھے نفرت ہے اس آدمی سے۔" امتل بولتے ہوئے اپنے روم میں جا چکی تھی جبکہ ندرت بیگم بے بس نگاہوں سے امتل کو صرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اور اس جگہ سے کافی دور ایک بنگلے میں۔ "دیکھا نہ تھا کبھی ہم نے یہ سماں..... ایسا نشہ تیرے پیار نے کیا....." مشہور سنگر عالمگیر کی آواز پورے کمرے کی دیواریں ہلا رہی تھیں۔ کمرے کی تمام چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں جبکہ شاہنواز آنکھیں بند کئے میوزک پر جھومے جا رہا تھا۔

"صبح کالج جانا ہے بیٹا..... میوزک آف کرو۔" چہرے پر سختی لئے وقار صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

"ڈیڈی..... صبح ہم سب دوستوں نے کہیں جانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔ آپ مجھے بھی اجازت دے دیں۔" شاہنواز کرسی پر بیٹھے وقار صاحب کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا.....

"نہیں..... تم کہیں نہیں جاؤ گے..... ہمیشہ کی طرح اب کی بار بھی ہڑپہ جا رہے ہو گے؟ اور وقار صاحب نے آنکھوں پر لگا چشمہ صاف کر کے دوبارہ ناک پر ٹکا لیا۔

"ڈیڈی کوئی ان دیکھی طاقت ہے..... جو مجھے ہڑپہ کھینچتی ہے۔ ہڑپہ کے ویران گھروں میں مجھے جلتے ہوئے دیئے نظر آتے ہیں۔" شاہنواز نے کھوئے کھوئے لہجے میں اپنے وہم کو جھٹک دیا اور بولا۔ "forget it you" سو جاؤ۔ وقار صاحب نے کہا اور کمرے سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ ہر ایکشن کا

www.pdfbooksfree.pk

ایک ری ایکشن ہوتا ہے۔ وقار نے جو محرومیاں مجھے اور امتل کو دیں، ان پر اس طرح کا ری ایکشن بالکل واجب ہے۔ ندرت بیگم صبح پیش آنے والی امتل کی بدتمیزی کا احوال اپنی سہیلی عتیقہ سے بیان کررہی تھیں۔

"اس نے جو کرنا تھا، کرلیا۔ اب تم اپنی زندگی جہنم مت بناؤ۔" عتیقہ نے سمجھایا۔

"میں اسے نہیں بھول سکتی عتیقہ، چند ماہ کی تھی امتل، جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ آج امتل بائیس سال کی ہے۔ اتنے برسوں میں، میں اپنا سب کچھ گنوا چکی ہوں۔ لے دے کر ایک امتل ہی تو میرے پاس بچی ہے۔ ایسے میں جب وہ بھی بدتمیزی کرے تو میں بہت ڈس ہارٹ ہوجاتی ہوں۔" ندرت بیگم کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"تمہاری بس آ گئی ہے ندرت....." بس اسٹاپ پر کھڑی عتیقہ نے سامنے سے آتی بس کی جانب ندرت بیگم کی توجہ مبذول کروائی تو ندرت بیگم اپنا پرس سنبھالتی آگے بڑھ گئیں۔ آج امتل کی کالج کی چھٹی تھی۔ ریموٹ ہاتھ میں پکڑے وہ جانے کب سے ٹی وی دیکھے جارہی تھی۔ بالآخر تنگ آ کر اس نے ٹی وی آف کردیا اور کچن میں آ گئی۔ دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ابھی ندرت بیگم کے آنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔

اس نے فریج کھولا اور ٹھنڈی بوتل اپنے منہ سے لگائی۔ ابھی وہ بوتل سے انجوائے ہی کررہی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک نہایت حسین لڑکی کھڑی تھی، جو پینے کے لئے پانی مانگ رہی تھی۔

"پلیز! آپ اندر آجائیں۔" امتل نے کھلے دل سے آفر پیش کی۔ جس پر وہ لڑکی تھوڑا سا گھبراتی ہوئی اندر آ گئی۔ امتل نے ایک خالی گلاس اٹھایا اور ٹھنڈی یخ سپرائٹ اس میں انڈیل دی۔

"آپ نے تو بہت خوبصورت لاکٹ پہن رکھا ہے۔" پانی پیتے ہوئے لڑکی کی نظر امتل کی گردن پر پڑی تو لڑکی نے کہا۔

وہ لاکٹ واقعی بہت دیدہ زیب تھا۔ چاندی کے خوبصورت نقش ونگار سے "یا اللہ" کندہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے کالے رنگ کی ڈوری میں پرو کر گردن میں ڈالا گیا تھا۔

"یہ لاکٹ..... یہ مجھے میری مما نے ایک پیر صاحب سے لاکر دیا تھا۔ دراصل میں اکیلے میں سوتے ہوئے ڈر جاتی ہوں۔" امتل نے زیرلب ہنستے ہوئے کہا۔

"ڈر جاتی ہو.....؟ وہ کیسے؟" وہ لڑکی بھی شاید امتل میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

"بس یونہی..... سوتے میں کوئی نہ کوئی بھیانک خواب نظر آجاتا ہے..... کبھی جسم بدکنے لگتا ہے..... اور جاگوں تو کوئی نہ کوئی عضو سن ملتا ہے..... اور کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے، کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلا دیا ہو۔" امتل خلاؤں میں گھورتے ہوئے یہ باتیں اس لڑکی کو بتا رہا تھی امتل اس خواب سے صرف وقتی طور پر ڈرا کرتی تھی، بعد میں معمول پر آجاتی تھی۔

"دس از ویری ڈینجرس۔" لڑکی نے بے نیازی سے گلاس میز پر رکھا۔

"واٹ از ڈینجرس؟" امتل کو حیرت ہوئی تھی۔

"بتاؤں گی.....! یہ قرض رہا مجھ پر۔" لڑکی امتل کو سرتاپا دیکھنے لگی۔ اور فوراً ہی جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جونہی وہ دروازے سے باہر نکلنے لگی تو امتل نے اسے روکا۔

"سنیے..... اپنا نام تو بتاتی جایئے۔" امتل نے کہا۔

"پھول کو جس نام سے بھی پکارو، وہ پھول ہی رہتا ہے۔" لڑکی مسکراتی ہوئی بولی۔

"تو پھر میں آپ کا نام "پھول" رکھ دوں؟" امتل کو یہ لڑکی کچھ زیادہ ہی پسند آئی تھی۔ کیونکہ اس کے شولڈر کٹ بال تھے۔ اور شولڈر کٹ بالوں والی لڑکیاں اسے ہمیشہ سے ہی بہت پسند تھیں۔

لڑکی نے ہاتھ ہلا کر اسے مثبت اشارہ دیا اپنی کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھی اور کار اسٹارٹ کرکے چلی گئی تو امتل نے دروازہ بند کرکے ابھی پلٹی ہی تھی کہ ایک بار پھر ڈور بیل چنگھاڑ اٹھی۔

"مجھے پتا تھا پھول! آپ واپس ضرور آئیں

گی۔" اس نے اتراتے ہوئے دروازہ کھولا مگر سامنے ندرت بیگم کو دیکھ کر فوراً مسکراہٹ غائب کرلی۔

"کاش! کہ میں پھول ہی ہوتی، تمہاری مسکراہٹ تو یوں غائب نہ ہوتی۔ ویسے یہ پھول ہے کون.....؟" ندرت بیگم حسب عادت بولتی ہوئی اندر آ گئیں۔

"راہ چلتی ہوئی کوئی لڑکی تھی، پانی پینے آئی تھی۔" امتل نے سرسری سا بتایا۔ آپ کے لئے کھانا گرم کرتی ہوں۔" امتل کچن میں جانے کے لئے مڑی تو ندرت بیگم اس سے بولیں۔ "نہیں بیٹا! گرمی بہت غضب کی پڑ رہی ہے، تم ٹھنڈے پانی سے شاور لے کر آؤ، میں کھانا گرم کرکے لگاتی ہوں۔" ندرت بیگم کے کہنے پر وہ واش روم کی جانب مڑ گئی۔

یہ بات بالکل عیاں تھی کہ وہ عام دنوں میں ماں کا اتنا کہنا نہیں مانتی تھی جتنا ناراضگی میں وہ خاموشی سے ندرت بیگم کی بات مانتی چلی جاتی تھی۔

واش روم میں جانے کے بعد اس نے اپنے کھلے ہوئے بال کیچر میں باندھ کر اوپر کئے۔ اور سامنے لگے دیوار پر لگے شیشے میں خود کو دیکھتی ہوئی اپنی سونے کی بالیاں اتارنے لگیں۔ جنہیں وہ ہمیشہ نہانے سے قبل اتارا کرتی تھی۔ بالیاں اتارتے اتارتے وہ ایکدم چونک گئی اور بے یقین نظروں سے سامنے لگے شیشے کو دیکھنے لگی۔ اس کی گردن میں موجود چاندی کا لاکٹ اب غائب تھا۔

باہر آ کر اس نے بہت تلاش کیا مگر لاکٹ تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔ پر اس نے زیادہ سیریس نہ لیا اور آ کر کھانا کھانے لگی۔

شام کو اپنے کمرے میں آ کر اس نے تیز آواز میں میوزک آن کیا اور بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ کر ہارر رسالے کا مطالعہ کرنے لگی، کہانی اچھی خاصی ڈراؤنی تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے پھر بھی وہ کہانی پڑھتی رہی کہانی ختم کرنے کے بعد اس نے باتھ روم جا کر نائٹ ڈریس پہنا اور واپس آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اے۔ سی فل آن تھا۔ اس لئے جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب اس کی آنکھ پیاس کی شدت سے کھل گئی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر دیکھا مگر خالی جگ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ منہ کے برے برے زاویے بناتی ہوئی وہ اٹھی اور گلاس لے کر روم سے باہر نکل آئی۔ کچن نیچے فلور پر تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے لگی۔

وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ایک چار فٹ لمبا ہیولہ گردن جھکائے بالکل اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اور اسی کے پیروں کے نشانات پر وہ ہیولہ اپنے قدم رکھ رہا تھا۔

کچن میں آ کر اس نے فریج کھولا اور ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر گلاس بھرا۔ وہ ہیولہ ابھی بھی اس کے عین پیچھے خاموش کھڑا تھا۔ پانی پینے کے بعد وہ جونہی واپس جانے کے لئے مڑی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

قد میں وہ پراسرار ہیولہ امتل سے کہیں چھوٹا تھا۔ مگر وہ گردن اٹھائے آنکھیں پھاڑے اس کو ہونقوں کی طرح دیکھے جارہا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہیولہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ امتل کو یوں لگا، جیسے اس کی ٹانگوں سے جان نکالی جارہی ہو۔ وہ خود کو گرتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ اس کے دل ودماغ پر خوف ودہشت کے سائے چھا گئے تھے۔ بالآخر ہیولے نے ٹانگوں کے ذریعے اس کی جان نکالنا شروع کردی۔ امتل کے بدن میں تو کاٹے تو لہو نہیں والی مثال تھی۔ وہ بے دم سی ہوکر زمین پر گر پڑی۔ زرد رنگت اور نچڑے ہوئے چہرے والی امتل اب زندگی کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ کچن کے فرش پر اس کے بے جان جسم کو چھوڑ کر وہ ہیولہ اٹھا تو دھویں کا مرغولہ سا اس کے گرد اکھٹا ہونا شروع ہوگیا۔

دھواں ہٹا تو اب وہ ہیولہ ایک حسین لڑکی کا روپ دھار چکا تھا۔ جس نے کالے رنگ کا چوغہ پہن رکھا تھا۔ بے نیازی سے وہ لڑکی کچن سے باہر جانے لگی۔ اس کے چوغے کا پچھلا حصہ گھسیٹتا ہوا زمین پر جارہا تھا۔

کچن کی حدود سے نکلنے سے قبل اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر پل بھر کے لئے مڑ کر امتل کے فرش پر پڑے بے جان جسم کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے

www.pdfbooksfree.pk

واپس چل دی۔ اس کے کالے چوغے پر، شولڈر کٹ بال نہایت پراسرار منظر پیش کررہے تھے۔

☆.....☆.....☆

گاڑی ٹیکسلا کی طرف جانے والی سڑک پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے شاہ نواز نہایت مہارت سے ڈرائیو کررہا تھا۔ برابر میں فرنٹ سیٹ پر اس کا دوست بلال بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹوں پر اس کے کلاس فیلوز ابوبکر اور حسان بیٹھے تھے۔ ابوبکر اور حسان کے درمیان بہت مشکل سے جگہ بنا کر اسماعیل بیٹھا ہوا تھا۔ ابوبکر سفر سے کافی تھک چکا تھا۔ لہٰذا سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے اونگھ رہا تھا۔

حسان کانوں میں ہیڈ فون لگائے خاموش تھا۔

''ہڑپہ اور کتنی دور رہ گیا ہے؟'' بلال نے لیپ ٹاپ بند کرکے پوچھا۔

''بس کچھ ہی فاصلے پر ہے۔'' شاہ نواز نے گیئر بدلا۔

''ارے وہ کون ہے؟'' ونڈ اسکرین سے نظر آتی ایک ادھیڑ عمر عورت پر شاہ نواز کی نظر پڑی۔ جو غالباً لفٹ چاہ رہی تھی۔

''اس بوڑھی خاتون کی ہیلپ کرنی چاہیے۔'' شاہ نواز خود سے گویا ہوا۔

''تو ہم لوگ کہاں بیٹھیں گے؟ اس گاڑی کی چھت پر جائیں گے کیا؟'' ابوبکر اور حسان کے بالکل سامنے والی سیٹ پر براجمان نومی جل کر بولا تھا۔

''نومی یار! میرے خیال میں اس بڑھیا کو لفٹ دے دینی چاہیے، بے چاری گرمی میں سڑک پر بے یارومددگار کھڑی ہے اور نہ جانے کہاں جائے گی.....؟'' اب کے حسان کو اس پر ترس آیا تھا۔ اس نے نومی اور اس کے ساتھ بیٹھے عدنان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

کیری کو شاہ نواز نے بڑھیا کے پاس لے جا کر روک دیا۔ بڑھیا لاٹھی کے سہارے تیز تیز چلتی ہوئی شاہ نواز کے پاس آ کر اس کی بلائیں لینے لگی۔ شاہ نواز نے کیری کا دروازہ کھول کر اندر جگہ دیکھنے کی غرض سے جھانکا۔

عدنان بھائی اخبار منہ پر پھیلائے کوئی خبر بہت دل جمعی سے پڑھ رہے تھے۔ جب بڑھیا دھپ سے ان کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی تو عدنان بھائی نے حیرت سے اخبار سمیٹا اور اپنے برابر میں دیکھا، جہاں ابھی کچھ دیر پہلے ان کا چھوٹا بھائی نومی بیٹھا تھا اور اب پان چباتی، لال ہونٹوں والی بڑھیا گردن گھما کر گاڑی میں بیٹھے لڑکوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

نومی کو، حسان، بلال، ابوبکر، اور اسماعیل وغیرہ نے جگہ بنا کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ ''ارے بیٹا! میری ایک جوتی تو وہیں رہ گئی، یہ دیکھ! میرے پاؤں میں ایک جوتی ہے۔'' بڑھیا نے اپنی سوکھی ٹانگیں قدرے اوپر کیں، جن میں واقعی ایک میں چپل اور دوسرا پیر ننگا تھا۔ ''پتا نہیں! کب پیر سے نکل گئی؟'' وہ بڑبڑائی۔

''سبحان اللہ..... ابھی یہ کسر بھی تھی۔'' ابوبکر آہستہ سے بولا تھا۔ جبکہ بلال اور اسماعیل نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''آپ رکئے اماں! میں ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔'' شاہ نواز دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

''رب نے ..... بنادی ..... جوڑی۔'' نومی بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا معنی خیز نظروں سے عدنان بھائی اور ان کے برابر میں بیٹھی بڑھیا کو دیکھتے ہوئے گنگنانے لگا۔

گاڑی سے تھوڑی دوری پر شاہ نواز غور سے اردگرد کی جگہ کو دیکھنے لگا مگر وہاں کوئی جوتی نہیں تھی۔ ابھی وہ جوتی تلاش کررہی رہا تھا کہ اسے ایک ٹھوکر لگی مگر اچانک کسی نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی تھی۔ وہ حسن کے جلوؤں میں نہائی ہوئی تھی۔ اس کے حسن کی روشنی سے شاہ نواز کی آنکھیں جیسے چندھیانے لگی تھیں۔

''دیکھ کر..... اگر آپ کو چوٹ آجاتی تو.....'' وہ ابھی بھی شاہ نواز کا ہاتھ تھامے مسکراتے ہوئے اسے دیکھے جارہی تھی۔ مگر شاہ نواز تو جیسے اس کی غزالی آنکھوں کے سامنے پتھر کا ہو چکا تھا۔ بس یک ٹک اسے

دیکھے جارہا تھا۔

''آئیں..... میں آپ کو گاڑی تک لے جاؤں۔'' وہ ساحرہ اس کا ہاتھ تھامے گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔ گاڑی کافی فاصلے پر تھی۔ شاہ نواز اس کے دلکش چہرے پر نظریں جمائے کسی روبوٹ کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ ''کیا دنیا میں کوئی اتنا حسین اور خوش اخلاق ہوسکتا ہے؟'' شاہ نواز کے ذہن میں سوال اٹھ رہے تھے۔

لڑکی کے حسن میں گم ہو کر چلتے شاہ نواز کو اتنا بھی احساس نہ ہوا کہ وہ حسینہ اپنے لمبے ناخن اس کی نبض میں گھسیڑ رہی ہے۔ جس سے اب خون نکلنا شروع ہو چکا تھا۔ مگر وہ حسن کا دیوانہ شاہ نواز اس سے بے خبر تھا۔

شاہ نواز کا ہاتھ تھامے، اپنے لمبے ناخن اس کی نبض میں پیوست کئے وہ دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ آخر جب شاہ نواز کو ہوش آیا۔ مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کی نبض سے خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ درد کی شدید لہروں نے اسے نیچے بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ اور پھر شاہ نواز کی آخری سانسیں چلنا شروع ہوگئیں۔ اس جہان فانی سے پرواز کرتے وقت اس نے آنکھیں کھول کر دور سے نظر آنے والی گاڑی کو نظر بھر کر دیکھا۔ جہاں اس کے دوست زندگی کی بھرپور رونقوں سمیت موجود تھے۔

شاہ نواز کی گردن ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔ اس ظالم حسینہ نے گردن ترچھی کرکے شاہ نواز کی لاش کو دیکھا۔ پھر ایک طرف کو چلنے لگی۔

تیز ہوا اس کے شولڈر کٹ بالوں کو لہرا کر اسے اور حسین بنا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''ہمت کرو وقار! آہ وفغاں کرکے شاہ نواز کی روح کو دکھی مت کرو۔'' وقار صاحب کے دیرینہ دوست انعام سرحدی۔'' انہیں سمجھا رہے تھے۔

''میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا انعام۔'' وقار صاحب نڈھال لہجے میں بولے۔

''کسی کے بغیر جینا واقعی محال ہے، مگر مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔'' انعام سرحدی انہیں سمجھانے پر مصر تھے۔

''نہیں انعام! میرے لئے یہ بہت مشکل ہے، صرف یہی سانحہ نہیں بلکہ مجھے ایک اور خبر مل گئی ہے۔'' وقار صاحب کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

''کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ گے بھی؟'' انعام سرحدی اکتاہٹ کا شکار ہوئے۔

''تمہیں پتا ہے انعام؟ میری بیٹی امتل مجھے چھوڑ کر کب کا جا چکی ہے اور مجھے یہ خبر کل ملی ہے..... میرا دل جیسے بند ہوتا ہوا محسوس ہورہا ہے..... میری امتل کو فوت ہوئے تین ماہ ہو چکے ہیں۔ اور مجھے..... اس کے مرنے کی خبر تین ماہ بعد ملی ہے۔ میں امتل کے غم پر روؤں یا شاہ نواز کی قبر پر ماتم کروں۔'' وقار صاحب بچوں کی طرح انعام سرحدی کے گھٹنوں پر سر رکھے رو رہے تھے۔

اس واقعے کے کئی دن بعد ایک شام وقار صاحب بیڈ پر نڈھال سے پڑے تھے کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ جنریٹر اور یو۔پی۔ایس تو ویسے بھی سخت گرمی میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی حال وقار صاحب کے گھر کا ہوا۔ جنریٹر تو دو دن سے ہی خراب پڑا تھا اور یو۔پی۔ایس کی چار جنگ بہت جلد ختم ہوگئی تھی اور اس نے وارننگ جاری کردی تھی۔

بھاری پردوں کی بدولت کمرے میں کافی اندھیرا ہوگیا تھا۔ معاً انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس اندھیرے میں دو سرخ انگارہ آنکھیں گھور رہی ہیں۔ وقار صاحب بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

سرخ انگارہ آنکھیں انہی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے دل میں فوراً گھبراہٹ ہونے لگی۔

''موہن.....!'' کمرے کی تاریکی میں ایک نام ہولے سے ابھرا۔

اس کے ساتھ ہی وہ سرخ انگارہ آنکھیں وقار صاحب کی طرف بڑھنے لگیں۔ اچانک ان بھیانک آنکھوں سے خاص قسم کی سرخ روشنی نکلی اور وقار صاحب

www.pdfbooksfree.pk

کے دونوں بازو میں جا کر پیوست ہوگئی۔ ان کے بازو اوپر کو اٹھے اور خود بخود مڑنے لگے اور عجیب سی آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی۔

"شکر ہے کہ دایاں بازو تھا، زیادہ مسئلہ نہیں بنا۔ تم تو ویسے بھی لیفٹ ہینڈر رائٹر ہو۔"

انعام سرحدی ویسے بھی دن میں ایک دو چکر اپنے اس تنہا دوست کے گھر کا ضرور لگاتے تھے۔

"تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا؟" وقار صاحب شکوہ کناں ہوئے۔

"تمہاری بات کا ہی تو یقین کروں گا، بچپن کے دوست ہو تم میرے۔" انعام نے ان کا کندھا تھپتھپایا۔

"اصل میں وقار! میں کچھ سوچ رہا ہوں، بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بس اتنا یقین رکھو کہ میں تمہیں مصیبت میں اکیلا چھوڑنے والا نہیں۔"

انعام نے کافی کا مگ وقار صاحب کی طرف بڑھایا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن وقار صاحب، پچھلے دو گھنٹے سے بیٹھے شاہ نواز کی تصویریں دیکھے جا رہے تھے۔ اس کے بچپن کی.....اس کی جوانی کی.....ان کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ ان کا جواں سالہ بیٹا کہیں گھوڑے پر بیٹھا اس کی باگیں پکڑے ہوئے تھا تو کہیں کالی عینک آنکھوں پر چڑھائے ساحل سمندر پر کھڑا تھا۔ وقار صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح اپنے بیٹے کو ان جیتی جاگتی تصویروں میں سے نکال لیں۔ تصویریں دیکھتے دیکھتے جانے ان کے من میں کیا سوجھی کہ انہوں نے البم بند کر کے فون پر ایک نمبر ملانا شروع کر دیا۔

"ہیلو....." دوسری طرف سے نسوانی آواز ابھری۔

"مجھے میری بیٹی کی کچھ تصویریں چاہیے۔" وقار صاحب نے حکم صادر کیا۔

"تصویریں..... میرا بس چلے تو تمہیں اپنی امتل کی آخری آرام گاہ پر بھی جانے سے منع کر دوں.....ارے تم نے اسے دیا کیا ہے؟ بائیس سال تک وہ یتیموں اور لاچاروں کی طرح دھکے کھاتی رہی تمہارے نام سے بھی نفرت کرتی تھی وہ.....اور تم کہتے ہو کہ میں تمہیں اس کی تصویریں دے دوں.....؟" بھرپور سنانے کے بعد دوسری طرف سے فون پٹخ دیا گیا تھا۔ وقار صاحب ریسیور ہاتھ میں پکڑے نم آنکھوں کے ساتھ گم صم رہ گئے تھے۔

"شاید واقعی..... میں نے اپنی امتل کا حق ادا نہیں کیا۔" وہ نڈھال سے ہو کر بڑبڑائے۔

صبح ان کی آنکھ کافی لیٹ کھلی۔ اتنے بڑے گھر میں اب وہ بالکل تنہا رہتے تھے اور یہ بات ان کے ڈیپریشن میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

پہلے تو شاہ نواز کے تیز میوزک اور اس کی اچھل کود سے یہ آنگن چہکتا رہتا تھا مگر اب وہاں دل پر ڈوبنے والی خاموشیاں تھیں جو وقار صاحب کو پاگل بنانے کے لئے کافی تھیں۔

اسی رات نہ جانے کس پہر ان کی آنکھ کھل گئی۔ ان کے دل پر گھبراہٹ کا عالم طاری تھا۔ وہ یکدم بیڈ سے نیچے اترے اور سیدھا ٹیرس کا رخ کیا۔ باہر کافی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ روح کو طمانیت کا احساس ہوا۔

آنکھیں بند کر کے وہ لمبے لمبے، گہرے سانس لینے لگے۔ اسی اثناء میں انہیں یوں لگا جیسے کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ انہوں نے فوراً مڑ کر دیکھا مگر کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ اسے اپنا وہم کیسے گردان سکتے تھے؟ کیونکہ انہوں نے خود ایک ہاتھ کا لمس اپنے کندھے پر محسوس کیا تھا۔ ابھی وہ اسی کشمکش میں تھے کہ انہیں لگا کوئی بھاگ کر ٹیرس کی دوسری جانب گیا ہے۔ اتنی دیر میں وہ اس کی صرف ایک جھلک دیکھ پائے تھے۔ گہرا سبز رنگ کا انتہائی بھاری کپڑے کا لباس تھا۔ جس پر بے شمار جگمگاتے موتی جڑے تھے۔ وہ موتی ایسے تھے کہ ان سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر وقار صاحب تک با آسانی آ رہی تھی۔

"ایسے کپڑے آج کل کے دور میں تو کوئی نہیں پہن سکتا؟" انہوں نے سوچا اور حیران ہو کر ٹیرس سے

اسی حصے کی طرف بڑھے۔ مگر وہ حصہ ہنوز سنسان تھا۔

"کوئی ان دیکھی طاقت تھی، جو ہمہ وقت ان کے اردگرد رہنے لگی تھی۔" ایک لمحہ کو آنے والی اس سوچ نے وقار صاحب کو اندر تک دہلا کر رکھ دیا۔ وہ تیزی سے واپس کمرے میں آ گئے اور بیڈ پر لیٹ کر چادر سر تک تان لی۔ حالانکہ وہ پہلے ہی پسینے میں نہائے ہوئے تھے مگر پھر بھی چادر کی آڑ سے وہ خود کو کسی چیز سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اور پھر وہ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ اور اس طرح صبح ہو گئی۔

"یہ کیا ہے؟" انعام سرحدی اپنے کپڑوں کے بڑے سے بیگ کے ہمراہ آئے تو وقار صاحب پوچھ بیٹھے۔ کیونکہ اس طرح تو وہ کبھی نہیں آئے تھے۔

"میرا اٹرالی بیگ ہے۔ پتا ہے وقار؟ اب میں کچھ دن تک تمہارے پاس رہوں گا۔ اس مسئلے سے تمہاری جان چھڑوانے کی کوشش کروں گا جس میں تم پھنسے ہوئے ہو۔ ایک دوست اگر مصیبت میں بھی اپنے دوست کے کام نہ آئے تو کیسا دوست.....؟" وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگے۔

"مگر! شگفتہ بھابی برا مانیں گی۔ کیا ان سے اجازت لے کر آئے ہو؟" وقار صاحب اپنی وجہ سے ان کے ازدواجی تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"شگفتہ کی فکر مت کرو، وہ بہت اچھے دل و دماغ کی مالک ہے۔ ان فیکٹ، جب میں نے اسے تمہاری مشکل کے بارے میں بتایا تو اسی نے مجھے یہ مشورہ دیا۔ کہ میں تمہاری مشکل آسان کروں۔" انعام اب اپنے جوتے اتار رہے تھے۔

"پھر تو شگفتہ بھابی واقعی بہت اچھی ہیں میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کرنا۔" وقار صاحب کو اپنے دوست انعام کے آنے سے حوصلہ ہوا تھا۔

"شگفتہ کو اچھا تو ہونا ہی ہے۔ آخر بیوی کس کی ہے؟ انعام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو وقار صاحب بھی بے اختیار مسکرا اٹھے۔ مگر ایک کسک سی کہیں اٹھی۔

"ایک بات بتا۔ انعام! شگفتہ بھابی کو اتنا خوش کیسے رکھ لیتا ہے؟ وہ بے تکلفی پر اتر آئے تھے۔ میں نے تو دو شادیاں کیں۔ ندرت اور امتل کو میں نے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد جو لی میرے دل میں آئی۔ وہ صرف اس بات پر مجھے اور میرے شاہ نواز کو چھوڑ گئی کہ شاہ نواز کو "شاہ نواز" میں نے کیوں بنایا۔ اسے جولی کی خواہش کے مطابق "وسیم گرانٹ" کیوں نہیں بنایا۔ ایک عورت کو میں نے چھوڑا۔ دوسری عورت مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ بے حد رنجیدہ تھے۔

"دیکھو وقار! جولی کے معاملے میں تو، تو بالکل حق پر ہے۔ شاہ نواز تیرا بیٹا تھا۔ ایک مسلمان کا بیٹا.....تو کیسے اس کو عیسائی بنا دیتا؟ جولی تجھے چھوڑ کر چلی گئی تو کوئی مسئلہ نہیں مگر ندرت بھابی کے ساتھ تو نے ناقابل برداشت زیادتی کی ہے۔ اتنی بڑی ذمہ داری..... وہ بھی ایک بیٹی کی ذمہ داری.....تو نے ماں بیٹی کو خود غرض معاشرے میں نبھانے کے لئے چھوڑ دیا..... تجھے پتا ہے وقار؟ میری اور شگفتہ کی خوشگوار زندگی کا راز کیا ہے؟ ہم شادی کو ایک مقدس بندھن سمجھتے ہیں.....کبھی نہ ٹوٹنے والا بندھن..... ہماری لڑائیوں میں اگر شگفتہ کی غلطی ہو تو وہ فوراً مجھ سے آ کر سوری کر لیتی ہے اور اگر میں غلطی پر ہوں تو میں بھی شگفتہ سے معذرت کرنے میں دیر نہیں لگاتا..... میں نے شگفتہ کو ہمیشہ اپنا ساتھی اور مہربان دوست سمجھا ہے۔ کبھی اسے اپنی خواہش پر غلام بیوی نہیں سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ آج میرے اور شگفتہ کے خوشگوار تعلقات کی مثال لوگ دیتے ہیں۔"

انعام سرحدی بیڈ پر بیٹھے دھیرے سے وقار کو انکی ندرت کے ساتھ کی گئی بے انصافیوں کو دہرا رہے تھے۔ کہ اچانک جیسے کمرے میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ ان کا بیڈ تیز تیز چلنے لگا۔ وقار صاحب اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور نیچے زمین پر آ گرے۔ کمرے کے تمام بلب اور راڈ خود بخود بجھ گئے اور پھر کسی کی سسکیوں اور آہوں کا طوفان کمرے میں برپا ہو گیا۔

پھر کرخت آواز سنائی دی "تیرا جنم ساتویں بار پورا ہو چکا ہے موہن! اب تجھے مجھ سے کوئی نہیں بچا

www.pdfbooksfree.pk

سکتا۔ اپنے پہلے جنم میں تو نے مجھے دھوکہ دیا تھا جس کی وجہ سے میں آتما ہتھیا کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ پہلے جنم سے لے کر اب تک میں اپنا بدلہ لینے کے انتظار میں تھی مگر ہر بار تیری جنم کنڈلی ایسے مہاراشٹر میں بنتی تھی کہ میں گرو کے وش میں قید ہوجاتی تھی۔ مگر ساتویں بار..... اپنے ساتویں جنم میں تو میرے قابو میں آ گیا..... تیری ڈکری اور تیرا ڈکرا، دونوں ہی کو میں نے مارا ہے..... تا کہ تجھے وہی درد ملے جو صدیوں پہلے میں نے سہا تھا۔

''تیار ہوجا موہن..... اپنے پاپ کی سزا بھگتنے کے لئے.....'' شولڈر کٹ بالوں والی لڑکی خونخوار انداز میں وقار کی طرف بڑھ رہی تھی۔

وقار صاحب زمین پر گر پڑے، شدید زخمی حالت میں تھے۔ وہ لڑکی وقار صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ان کی گردن پر اپنے دانت گاڑنے کے لئے سر نیچے جھکایا ہی تھا کہ ایک کتاب، اس کے اور وقار صاحب کی گردن کے بیچ حائل ہوگئی۔ وہ کتاب جو اس زمین اور آسمانوں کے بادشاہ نے اپنے سب سے محبوب ہستی پر اتاری تھی۔

اچانک لڑکی کی ٹھکی سی بندھ گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کتاب پکڑنے والے ہاتھ کی سمت میں دیکھا تو انعام سرحدی نہایت طمانیت سے ''قرآن مجید'' پکڑے اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔

لڑکی جھٹکے سے اٹھی اور پیچھے ہٹنے لگی۔ انعام بھی قرآن مجید ہاتھوں میں تھامے اس کی طرف بڑھنے لگے۔

''پچھلے چھ جنموں کی طرح تو اس بار بھی میرے دوست کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔ پچھلے چھ جنموں میں اس کی جنم کنڈلی کا مہاراشٹر تیرے راستے کا کانٹا بنا، اور اب اس کا مذہب تیری رکاوٹ ہے..... مذہب..... جو سات جنموں کی نفی کرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تیرے خیالات کے مطابق اس نے پہلے تیرے ساتھ کیا کیا؟''

''مگر ہم لوگ صرف ایک بار جینے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین رکھتے ہیں..... اگر مرنے کے بعد اٹھیں گے تو صرف یوم حساب..... اس کے علاوہ ہمارا مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین نہیں.....'' انعام سرحدی قرآن مجید ہاتھوں میں تھامے لڑکی کی طرف مسلسل بڑھ رہے تھے۔

لڑکی نے اچھل کر انعام پر حملہ کرنا چاہا مگر قرآن مجید سے اس کا ہاتھ چھوتے ہی اچانک ایک شعلہ بھڑکا، پھر اس شعلے نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شعلے بلند سے بلند تر ہونے لگے تو اس کی فلک شگاف چیخیں در و دیوار کو دہلانے لگیں، فضا میں انسانی گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی اور پھر وہ راکھ میں تبدیل ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد راکھ بھی ہوا میں تحلیل ہونا شروع ہوگئی۔ اب وہاں کچھ بھی نہ بچا تھا۔

انعام سرحدی کے کہنے پر وقار صاحب نے فون پر کوئی نمبر ڈائل کیا اور بات کرنے لگے۔

''پتا ہے وقار؟ بعض دفعہ ہمارا ایک اچھا فیصلہ ہماری سب غلطیوں کو مٹا دیتا ہے۔ یہی کام تم نے کیا ہے..... ندرت بھابھی کو منا کر..... انہیں دوبارہ اپنے گھر کی زینت بنا کر..... شام کی چائے پر وقار صاحب، ندرت بیگم، انعام سرحدی اور ان کی بیوی شگفتہ اکٹھے ہوگئے گپ شپ لڑا رہے تھے۔

''یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے انعام..... ورنہ میں تو ساری عمر ندرت کا مقروض رہتا۔'' وقار صاحب نے ممنونیت بھری نظروں سے اپنے جگری دوست انعام کو دیکھ کر کہا۔

''بس ندرت بھابی! اب آپ کو جب بھی میرے یار سے کوئی شکایت ہو تو فوراً اس سے کہہ دیجئے گا۔ دل میں رکھنے سے نفرت تیزی سے پرورش پاتی ہے جبکہ کہہ دینے سے غلط فہمیاں مٹ جاتی ہیں۔'' ندرت نے مسکراتے ہوئے انعام کی بات پر اثبات میں سر ہلایا اور سب ہنسنے لگے۔

سفید کپڑوں میں ملبوس، امتثل اور شاہ نواز کی روحوں نے کمرے میں پیار بھری نظروں سے اپنے ماں باپ کو دیکھا اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر دونوں بہن بھائی کھڑکی کے ذریعے آسمان کی طرف اڑ گئے۔

ترکیب

عبدالحمید ساگر۔ کندیاں

عامل اور معمول کی آنکھوں کا تصادم ہوتے ہی معمول بے حس و حرکت ساکت ہو گیا، اس کے بعد وہ بے چوں و چراں خاموشی سے اٹھا اور خراماں خراماں چلتا ہوا گھر سے باہر سڑک پر آکر اپنے آپ کو گولی مار لی لیکن اچانک.....

اپنے دام میں خود صیاد آ گیا..... اور اس حقیقت کا پتہ کہانی پڑھ کر ہی چلے گا

زمانے کے نشیب و فراز نے اس کے چہرے پر جھریاں پیدا کر دی تھیں۔ گو اس کی عمر اتنی نہیں تھی لیکن غربت کی زندگی نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا تھا۔ سر کے بالوں میں زیادہ نہیں لیکن چند ایک سفید آ گئے تھے۔ چہرے کا رنگ لال مالٹے کی طرح ہونے کے بجائے پیلا پڑ چکا تھا۔ اس کا لباس بھی اس کے جسم کی طرح خاص نہیں تھا۔ اس کے پاس صرف چند ایک سوٹ تھے۔ جنہیں وہ سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا اور ایک سوٹ کو زیادہ عرصہ پہنتا تھا تا کہ باقیوں کی زندگی بڑھ جائے۔ اس کے بوٹوں کے اندر جو جرابیں تھیں وہ پھٹی ہوئی تھیں۔ نئی خریدنے کی اس کی اوقات نہیں تھی۔

اس کا نام ڈیوٹ پال تھا۔ لوگ اسے پال کے نام سے جانتے تھے۔ جنوبی امریکہ کے ایک قصبے

www.pdfbooksfree.pk

میں اس کا چھوٹا سا گھر تھا۔ گھر کیا ایک ڈربہ تھا، جس میں اس کی چار، بہنیں بھی اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس کی ایک بہن اندھی تھی، اور ایک ٹانگوں سے معذور، جبکہ دو اتنی چھوٹی تھیں کہ انہیں بوتل میں اسے دودھ پلانا پڑتا تھا۔ ایک بوڑھی عورت بھی اس کی بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی بہنوں کی دیکھ بھال میں اس کی مدد کرتی تھی۔ اس کا نام میڈم، ٹیم تھا وہ اکثر اسی نام سے پکارتا تھا اسے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ میڈم ٹیم کہاں سے آئی تھی۔ لیکن یہ بات عیاں تھی کہ پال کے گھر میں میڈم ٹیم اہم کردار ادا کر رہی تھی۔

ڈیوٹ پال ایک مایوس شخص تھا۔ زندگی نے اسے کافی مایوس بنا دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے ہمیشہ زندگی کے تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے ایک غریب گھر میں آنکھ کھولی تھی۔ جہاں شراب، اور شباب کی بو آتی تھی۔ ڈیوٹ کی ماں ایک خوبصورت عورت تھی۔ اس کا نام ایڈرا تھا۔ ڈیوٹ کو آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اس کی ماں مجبوری کے باعث جسم فروشی کرتی تھی یا اسے اس ماحول میں جینے کا شوق تھا۔ اسے اس کی ماں اس وقت چھوڑ کر چلی گئی جب وہ چھٹی جماعت میں تھا۔ باپ کی شکل ڈیوٹ کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس میں ڈیوٹ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ مغربی تہذیب میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے معمولی واقعات آج بھی ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ڈیوٹ کی کہانی اور تھی وہ شاید اس ماحول میں جینا نہیں چاہتا تھا شاید اس کا پچھلا جنم مشرقی ماحول میں ہوا تھا۔ جس کے اثرات اس پر ابھی تک عیاں تھے۔

اس کی بہنیں معذور ہونے کی وجہ سے اس کے لئے دولت کمانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی تھی۔ حالانکہ بڑی دو کی عمریں اتنی تھیں کہ وہ مغربی مردوں کو برداشت کر سکتی تھیں۔ لیکن ان کی معذوری نے ان کے حسن کو گرہن لگا دیا تھا۔ کوئی بھی مرد ان کے قریب آنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن اگر وہ معذور تھیں تو پیٹ ضرور رکھتی تھیں۔ ان کو بھی دوسری عورتوں کی طرح بھوک لگتی تھی، اور ان کا پیٹ ڈیوٹ بھرتا تھا۔ جہاں سے بھی ہو، جیسے بھی ہو وہ لاکران کا پیٹ بھرتا تھا۔

پندرہ برس کی عمر میں ڈیوٹ نے پہلی چوری کی تھی جو کہ کامیاب رہی تھی اس نے ایک امیر آدمی کا پرس مار لیا تھا۔ اس میں اسے اتنے پیسے ملے کہ اس نے مہینہ گھر بیٹھ کر آرام سے کھایا اس دوران اس نے گاڑیوں کے ایک گیراج میں ملازمت بھی کر لی، لیکن یہ بہت کم پیسوں والی نوکری تھی ڈیوٹ نے جلد ہی اسے چھوڑ دیا، پھر اس نے چوری کا پیشہ اپنایا وہ بغیر استاد کے چور بنا تھا، اس لئے وہ پیچ وخم نہیں جانتا تھا جو بڑے استاد، چور جانتے جلد ہی پکڑا گیا، اور اسے حوالات کی ہوا کھانی پڑی، لیکن لاوارث، سمجھ کر پولیس نے بھی اسے چھوڑ دیا۔

باہر آ کر اس نے اپنا پیشہ نہیں بدلا، لیکن تھوڑی احتیاط ضرور سیکھ لی، اس نے چوری کرنا پھر شروع کی لیکن چالاکی سے وہ چھوٹا موٹا چور تھا، جو صرف گزر بسر کرنے کے لئے چوری کرتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ علاقے کی پولیس اس کو جان گئی، اور کئی بار اسے مارا پیٹا، لیکن وہ شاید اب ڈھیٹ بن گیا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس زندگی گزارنے کی اور کوئی راہ نہ تھی۔ وقت اور حالات اسے ایسے ملے تھے کہ وہ صرف چوری کرنا ہی سیکھ پایا تھا۔ وقت گزرتا رہا ڈیوٹ چوری چکاری کے ذریعے زندگی گزارتا رہا۔

اس دوران غربت وافلاس کی زندگی گزارتے گزارتے وہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اور اٹھائیس سال کا ہونے کے باوجود چالیس کا لگنے لگا تھا۔ اس کی بہنیں بھی عمر رسیدہ ہو گئی تھیں۔ جبکہ دو جوان ہو گئیں تھیں۔ ڈیوٹ اپنی بہنوں کا مستقبل چاہتا تھا۔ اسے میڈم ٹیم نے کئی بار کہا کہ معذور بہنوں کو کسی ٹرسٹ میں داخل کرادو، وہ لوگ ان کی بہتر پرورش کریں گے۔ ڈیوٹ

صرف پیسوں کی وجہ سے خاموش تھا۔

مغربی تہذیب میں ایسے ادارے مفت میں کسی کو نہیں سنبھالتے ایک اچھی خاصی فیس لیتے ہیں۔

''آپ فکر نہ کرو، میڈم ٹیم میں جلد ہی کچھ کروں گا۔'' وہ اکثر یہی جواب دیتا۔

پھر ڈیوٹ کو انسپکٹر جوزف ملا، انسپکٹر جوزف کا شمار ان پولیس والوں میں ہوتا تھا۔ جو قانون کے نام پر کلنک اور دھبہ تھے۔ اس نے ڈیوٹ کو قاتل بنا دیا۔

''اس کا نام ٹونی ہے وہ ایک گیراج کا مالک ہے۔ کچھ روز پہلے ہماری پارٹی کے ایک امیر آدمی کے ساتھ ہاتھا پائی کی تھی اس نے اب وہ اسے مارنا چاہتا ہے۔ تم اگر اسے مار دو گے تو تمہیں بیس ہزار ڈالر ملیں گے۔ جو تمہاری غربت مٹانے کے لئے کافی ہوں گے کب تک یہ چھوٹی موٹی چوریاں کرتے رہو گے، میری بات مان جاؤ میں تمہیں قانون سے بھی بچالوں گا کیونکہ میں خود قانون ہوں۔ بولو کیا بولتے ہو؟'' یہ انسپکٹر جوزف کے الفاظ تھے۔ جو اس نے ڈیوٹ سے کہے تھے۔

ڈیوٹ کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ انسپکٹر کی بات مان گیا۔ اور چند روز میں اس نے ٹونی کا خون کر دیا۔ اسے بیس ہزار ڈالر ملے لیکن ساتھ میں جیل بھی۔ انسپکٹر جوزف نے اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ بلکہ خود ہی اسے ہتھکڑیاں لگائیں۔ اسے عمر قید کی سزا ہوئی۔ اور چند روز بعد اسے حوالات سے سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔

جیل میں اسے سال ہونے کو تھا جب اسے ایک پرانے قیدی نے بتایا۔

''بے وقوف تم پروفیسر تھامس کے پاس کیوں نہیں گئے؟ وہ بہت بڑا جادوگر ہے۔ اس نے افریقہ میں بہت سی کتابیں پڑھیں ہیں۔ ریسرچ کی ہے۔ اور سنا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی قسمت بتاتا ہے۔ ہاتھ کی لکیریں سمجھتا ہے۔ آنکھوں کا جادو سمجھتا ہے۔ پامسٹری، ہپناٹزم، اور ٹیلی پیتھی کھیل ہے اس کے لئے وہ تمہیں ضرور نکال لیتا غربت کی زندگی سے، اور تمہیں کوئی ایسی ترکیب بتاتا کہ آج تم جیل کے بجائے نیویارک میں کسی لگژری فلیٹ میں عیاشی کر رہے ہوتے، لیکن افسوس، افسوس کہ تم وہاں نہیں گئے۔''

ڈیوٹ جو کہ اب مجرمانہ ذہن کا مالک بن گیا تھا بولا۔

''دوست! اب کیا مشکل ہے۔ اگر تم مجھے جیل

انمول موتی

دنیا کی زندگی تو محض کھیل اور تماشہ ہے آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے۔

(ارشادِ باری تعالیٰ)

جو شخص مسجد سے محبت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھتے ہیں۔ (ارشاد نبویؐ)

بدبخت ہے وہ شخص جو خود تو مر جائے مگر اس کا گناہ نہ مرے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

بے کار ہے وہ عالم جس سے علم کی بات نہ پوچھی جائے، بے کار ہے وہ ہتھیار جس کو استعمال نہ کیا جائے، بے کار ہے وہ مال جس کو کار خیر میں خرچ نہ کیا جائے، بے کار ہے وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

زمانے کے پل پل کے اندر آفات پوشیدہ ہیں۔ (حضرت علیؓ)

(انتخاب۔ ملک فہیم ارشاد۔ فیصل آباد)

www.pdfbooksfree.pk

سے بھاگنے کا راستہ بتاؤ تو میں ابھی پروفیسر تھامس کے پاس چلا جاؤں گا، اور اس سے پوچھ لوں گا، اپنے مسائل کا حل۔"

"حل۔" ہا..... ہاہا..... ہاہاہا....." قیدی ہنسا۔ "اب تمہاری حالت ایسی نہیں ہے۔ ڈیوٹ، اب تم کیا پوچھنا چاہتے ہو اس جادوگر سے اب تو تم تباہ ہو چکے ہو۔ اب وہ تمہیں کیا بتائے گا۔ انسان علاج مرنے سے پہلے کرتا ہے۔ مرنے کے بعد نہیں۔ اور وہ فری میں یہ کام نہیں کرتا ہزاروں ڈالر لیتا ہے۔ اب تمہاری حالت ایسی نہیں ہے اپنا لباس دیکھو، قیدیوں والا، اب تم ہار چکے ہو۔ اب پڑے رہو اسی جیل میں کم از کم کھانا تو ملتا ہے ناں تمہیں۔"

"نہیں..... تم فکر مت کرو، میں اب اس پروفیسر سے ضرور ملوں گا۔ تم صرف مجھے جیل سے باہر نکلنے کا راستہ بتاؤ۔" ڈیوٹ بولا۔

"ٹھیک ہے ڈیوٹ، میں تمہیں ایک شرط پر باہر جانے کا راستہ بتاؤں گا۔ اگر تم مجھے بھی اپنے ساتھ باہر لے جاؤ گے، تم تو جانتے ہو کہ میں ایک ٹانگ سے معذور ہوں۔ میں اس جیل میں صدیوں رہا ہوں، مجھے اس کے ہر سوراخ کا پتہ ہے کہ کونسا راستہ کہاں جاتا ہے۔ لیکن میری معذوری میرے آگے راستے کا پتھر بنی ہوئی ہے۔ باہر جا کے تمہارے راستے الگ اور میرا الگ ہوگا، لیکن یہاں سے تم مجھے سہارا دو گے۔" پرانے قیدی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ڈیوٹ نے کچھ سوچتے ہوئے حامی بھر لی۔

اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے جب پرانے لنگڑے قیدی نے ڈیوٹ سے کہا۔ "مبارک ہو دوست ہم باہر آ گئے، اب ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔ تم پروفیسر تھامس سے ضرور مل لینا، شاید وہ تمہیں امیر بنا دے، وہ اپورسٹی میں رہتا ہے۔ یہاں سے ریل جاتی ہے۔ چند گھنٹوں کا سفر ہے۔"

اس کے بعد لنگڑا قیدی لنگڑاتے ہوئے ایک طرف چل دیا۔ اور ڈیوٹ کا رخ ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا۔

اپورسٹی ایک برفانی مقام تھا۔ شاید کوئی ہل اسٹیشن۔ ہر طرف خوبصورت نظارے تھے۔ پروفیسر تھامس ایک ایسے بنگلے میں رہتا تھا جو ایک پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ پرانے دور کا بنگلہ پروفیسر تھامس کو بہت پسند تھا۔

اس بنگلے کے دوسری طرف ایک گہرا دریا تھا۔ جس کے بہنے کی آواز بنگلے کے اندر بھی آتی تھی۔ پروفیسر تھامس تنہائی پسند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے شہر سے ہٹ کے اپنے لئے جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن انسان اپنے فائدے کے لئے چاند پر بھی پہنچ گیا ہے تو پروفیسر تھامس کیا چیز تھا۔

اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ پروفیسر تھامس ایک سرخ رنگ کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس پر موٹے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس کے جن صفحات کو پروفیسر پڑھ رہا تھا، ان پر انسانی ہاتھ بنے ہوئے تھے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ "رات کے اس وقت..... کون ہو سکتا ہے؟" پروفیسر تھامس بڑبڑایا۔ اتنے میں دوبارہ دستک ہوئی۔

"آ رہا ہوں بھئی" تھامس نے کہا۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ آنے والے شخص نے اس کو ایک دھکا دیا تو پروفیسر اپنے نرم بستر پر گر گیا، وہ حیران تھا۔

"کک کون ہو تم.....؟ کیا چاہتے ہو؟" تھامس نے کہا۔ وہ بہت سہم گیا تھا۔ کیونکہ اندر آنے والے کے ہاتھ میں پسٹل تھی۔ اس نے کالا نقاب پہنا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور پروفیسر کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میرا نام ڈیوٹ ہے، میں قاتل نہیں تھا۔ لیکن بن گیا۔ غربت وافلاس کی زندگی گزارتے، گزارتے یہ دنیا سالی جینے نہیں دیتی، میرے خیال میں غریب آدمی کو اس دنیا میں جینے کا

کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ غریب آدمی کے پاس چند مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اگر وہ ان کو بالائے طاق رکھ کر جیئے تو کوئی اسے شکست نہیں دے سکتا۔ تم جیسا جادوگر بھی نہیں۔ میں نے یہ پسٹل ایک پولیس والے سے چھینا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کا پرس بھی۔ تم جانتے ہو ایسا میں نے کیوں کیا، اس لئے کہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میں نے اس پولیس والے کو ٹرین میں ہی مار دیا، اس پسٹل میں دو گولیاں تھیں۔ ایک استعمال ہو گئی اور ایک تم پر ہو سکتی ہے۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو....."

"تت..... تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں..... تم کیا چاہتے ہو؟" پروفیسر جو بیڈ پر خوف سے پڑا ہوا تھا۔ بولا۔

"شارٹ میں بتاتا ہوں۔" ڈیوٹ بولا۔

"تم سب سے پہلے مجھے چالیس ہزار ڈالر دو گے، کیونکہ مجھے رقم کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بعد مجھے ایک ترکیب بتاؤ گے جس پر عمل کر کے میری زندگی امیر لوگوں کی طرح ہو جائے، ان امیر لوگوں کی طرح جو جیتے ہیں اور عیاشی کرتے ہیں۔ تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات....."

"ہاں..... ہاں..... لیکن" پروفیسر ہکلایا۔

"لیکن ..... لیکن کیا" ڈیوٹ نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کہ تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم کیوں کر رہے ہو ایسا۔"

"بکواس مت کرو۔ پروفیسر! ڈیوٹ چیخا۔"

"اگر اپنی جان عزیز ہے تو میری بات مانو، نہیں تو ترکیب گئی بھاڑ میں۔ میں تمہیں جان سے مار کر تمہاری ساری دولت صاف کر جاؤں گا یہ تو تم خوش نصیب ہو کہ میں تمہاری جان بخش رہا ہوں۔ میں تم سے چالیس ہزار بھی نہ لیتا لیکن میں مجبور ہوں۔ تم جلدی سے پیسے لاؤ، پھر ترکیب بتاؤ۔"

"ڈیوٹ! میں تمہیں چالیس ہزار ڈالر بھی دوں گا لیکن پہلے تم ترکیب سن لو، جس کے ذریعے تم امیر بن سکتے ہو۔ کیا پتہ ترکیب سننے کے بعد، تم مجھ پر رحم کرو اور رقم کا مطالبہ نہ کرو۔" پروفیسر نے کہا۔

"چلو بولو پروفیسر میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔" ڈیوٹ نے کندھے اچکائے۔

"اس کے لئے تمہیں میری آنکھوں میں دیکھنا پڑے گا۔ جب تک میں نہ کہوں میری آنکھوں سے آنکھیں نہ ہٹانا، اسی دوران میں تمہیں جو بھی بات کہوں غور سے سمجھنا۔" پروفیسر بولا۔

"دیکھ لیتے ہیں تمہاری آنکھوں میں بھی بوڑھے پروفیسر۔"

ڈیوٹ نے کہا، اور اگلے ہی لمحے وہ پروفیسر کی آنکھوں میں دیکھنے لگا، اس کی آنکھیں پروفیسر کی آنکھوں سے نین مٹکا کر رہی تھیں بالکل ایسے جیسے دو پیار بھرے دل ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اس دوران کوئی ایک تو شرما جاتا ہے۔

لیکن یہاں پروفیسر تھامس نہیں شرمایا۔ اس کی آنکھیں مسلسل سرخ ہو رہی تھیں، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مکمل سرخ ہو گئیں۔ جیسے انگارے، اچانک پروفیسر کے لب ہلے۔

"ڈیوٹ، امیر بننے کے لئے ضروری ہے کہ تم، ابھی میرے کمرے سے نکلا جاؤ اور باہر سڑک پر جا کر اپنے آپ کو گولی مار دو عین بھیجے کے اوپر، تم اس جنم میں امیر نہیں بن سکتے۔ تم اگلے جنم میں امیر بنو گے، جاؤ وقت ضائع مت کرو۔" اس کے ساتھ ہی ڈیوٹ اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

سڑک زیادہ دور نہیں تھی۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد ایک دھماکے کی آواز سنائی دی تو پروفیسر نے ایک لمبا سانس لیا۔ وہ کافی مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ہپناٹزم نے اس کی جان بچالی تھی۔ اور اس نے ڈیوٹ کو امیر بننے کی ترکیب بھی سکھا دی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

روح کا انتقام

ایس۔امتیاز احمد۔کراچی

ایک انجانی قوت زور زبردستی نوجوان کو قبرستان کی طرف کھینچ رہی تھی۔اور آخر کار وہ قبرستان میں داخل ہو گیا۔ پھر اچانک وہ ایک قبر پر گرا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے گرد سائے وحشیانہ رقص کر رہے ہوں۔

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک خوفناک.....اچھوتی اور انوکھی کہانی

''سنو.....!''

شاہد کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے!اس نے غیر ارادی طور پر گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا، مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا، کچھ بھی نہیں دور دور تک سڑک ویران وسنسان پڑی تھی۔ آس پاس کسی متنفس کو نہ پا کر اس کے جسم میں خوف کی ایک شدید لہر برقی رو کی مانند سرایت کر گئی، اس نے جلدی سے اپنا رخ بدلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا، ابھی وہ چند قدم بڑھا تھا کہ آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی جیسے کوئی اس کے قریب ہی کھڑا سرگوشی کر رہا ہو۔

باریک سریلی آواز اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتی چلی گئی، جیسے کوئی دوشیزہ کسی کو پکار رہی ہو، لہجہ یاس وحسرت اور مایوسی کی تہہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر عام حالات میں نقرئی گھنٹیوں کی طرح سریلی آواز شاہد کے کانوں تک پہنچتی تو شاید اس کے سوچنے کے انداز کچھ اور ہوتا.....مگر تاریک وسنسان رات میں ویران سڑک پر یہ آواز سن کر اس کا جسم لرزنے لگا، اس کا دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے مگر اس کے قدم تو من من بھر کے ہو رہے تھے، چاہنے کے باوجود اس کے قدموں کی رفتار تیز نہ ہو سکی، اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اس کے پاؤں زنجیروں میں جکڑ لئے ہوں..... مایوسی میں ڈوبی ہوئی نسوانی آواز بدستور اس کا پیچھا کر رہی تھی، وہ اس آواز کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ سامنے نالے کا پل پار کر جائے تو اس غیبی آواز سے اس کا پیچھا چھوٹ سکتا ہے، پل ابھی اس سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔

آواز ایک مرتبہ پھر ابھری.....اس نے گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور پوری قوت مجتمع کر کے پل کی طرف دوڑنے لگا، سنسان اور ویران رات میں بھیگی ہوئی سڑک پر اس کے بھاری قدموں کی آواز گونجنے لگی، اس کے ساتھ ہی ایسے محسوس ہوا جیسے وہ غیبی نسوانی آواز مسلسل اسے پکارے جا رہی ہو۔

''سنو.....سنو.....رک جاؤ! تم آگے نہیں جا سکتے.....نہیں جا سکتے۔'' پل دس قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا، اور اس کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میلوں کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کر کے آیا ہو، اس کا سانس بری طرح پھول گیا، اس کے قدم لڑکھڑانے لگے، آواز بدستور اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

"رک جاؤ..... میں تمہیں نہیں جانے دوں گی..... رک جاؤ....." پل اب چار قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا، پھر تین قدم..... دو قدم اور پھر اسے ایسے ہی محسوس ہوا۔ جیسے ہزاروں بدروحیں ایک ساتھ چیخ اٹھی ہوں، رونے اور چیخنے کی آوازیں چاروں طرف سے آرہی تھیں۔ بین کی آوازیں اس کے کانوں میں گھسی جارہی تھیں۔ پل اس کے سامنے تھا..... ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا..... صرف ایک قدم..... جسے وہ پلک جھپکنے میں طے کرسکتا تھا مگر اس کے قدم الجھ گئے۔ وہ لڑکھڑایا، اس کے منہ سے کربناک چیخ نکلی اور وہ سڑک پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

شاہد کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک آرام دہ بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر اپنے چاروں طرف دیکھا، خوبصورت انداز سے سجا ہوا ایک کمرہ تھا جس میں وہ اس وقت موجود تھا۔

کمرے میں ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی، دیواروں پر خوبصورت قدرتی مناظر کی تصویریں آویزاں تھیں، قرینے سے سجا ہوا قیمتی فرنیچر مکینوں کی خوشحالی کا مظہر تھا۔

"یہ کونسی جگہ ہے..... میں یہاں کیسے آیا.....؟" وہ اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگا، اور پھر گزشتہ واقعات کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اس نے اس خیال کے آتے ہی خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔

اور پھر لیٹے ہی لیٹے اسے احساس ہوا جیسے کوئی دبے قدموں اس کی طرف بڑھ رہا ہو، آواز دو مختلف قدموں کی تھی جو اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ اسے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ تنفس کی رفتار بڑھ گئی، چند لمحوں بعد قدموں کی آواز ابھری اور لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہٹنے لگی مگر اس مرتبہ قدموں کی آواز صرف ایک ہی فرد کی تھی.....

"سنو....." کمرے کی خاموش فضا میں ایک نسوانی سرگوشی ابھری۔ شاہد کو ایسے ہی محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ اس کا سانس رکنے لگا، اس نے چیخنا چاہا مگر خوف کی زیادتی کے باعث اس کی آواز سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ ہونٹ پھڑپھڑائے اور اس کے حلق سے بے معنی سی خرخراہٹ کی آواز خارج ہوکر رہ گئی۔

"جی امی جان....." کمرے میں ایک مردانہ آواز ابھری جو پہلی آواز سے قدرے فاصلہ پر تھی۔ "نجانے یہ کون ہے بیچارہ.....؟ ابھی تک ہوش نہیں آیا، تمہارے ابو تو شاید سو گئے ہیں، تم ڈاکٹر کو ٹیلی فون کردو۔"

شاہد کو اپنے قریب ہی نسوانی آواز سنائی دی، اسے کچھ اطمینان ہوا، اس کے دل پر چھائی ہوئی خوف و ہراس کی دبیز چادر رفتہ رفتہ سرکنے لگی! سانس کی آمد و رفت معمول پر آگئی، اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک مرتبہ پھر چاروں طرف تکنے لگا، اگرچہ اسے کسی قدر اطمینان ہوچکا تھا کہ اب وہ محفوظ ہے مگر اس کے باوجود خوف کے سائے اس کے چہرے پر رقصاں تھے، چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ویرانی جھانک رہی تھی۔

"رک جاؤ سلیم..... یہ ہوش میں آگیا ہے، میرے خیال میں اب ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں۔"

شاہد کے سرہانے کی طرف سے پھر وہی نسوانی آواز ابھری، شاہد نے گردن موڑ کر دیکھا، بائیں طرف کمرے کے قریب کھڑا اٹھارہ انیس سال کی عمر کا ایک صحت مند لڑکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا، جو بعد میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچ کر رک گیا، اس دوران پلنگ کے سرہانے کی طرف ایستادہ عورت بھی اس کے سامنے آگئی۔

"کیسی طبیعت ہے اب.....؟" عورت نے مشفقانہ انداز میں شاہد سے پوچھا۔ "جج..... جی..... مم..... میں کہاں ہوں۔ آپ لوگ.....؟" شاہد ہکلا

کر رہ گیا اور وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"لیٹے رہو تمہیں آرام کی ضرورت ہے..... تم....." عورت کچھ کہتے کہتے رہ گئی اور ممتا بھرے انداز میں اس کو دیکھنے لگی۔

شاہد نے بھی دوبارہ اٹھنے کی کوشش نہ کی، وہ اپنے جسم میں نقاہت محسوس کررہا تھا۔ اسے حقیقتاً آرام کی ضرورت تھی، لہٰذا اس نے نیک دل خاتون کا مشورہ قبول کرلینا ہی ضروری سمجھا اور وہ ایک مرتبہ پھر تکیے پر سر ٹکا کر لیٹ گیا۔

اور پھر کچھ دیر بعد جب وہ پوری طرح حواس میں آچکا تھا تو اسے بتایا گیا کہ اس گھر کے مکین رات کے ایک بجے کے قریب کسی شادی کی تقریب سے واپس آرہے تھے کہ وہ پل کے قریب سڑک کے وسط میں انہیں بے ہوش پڑا ہوا ملا، اور وہ لوگ اسے اپنے بنگلے پر اٹھا لائے۔ ان کے پوچھنے پر شاہد نے بھی انہیں ایک فرضی داستان سنا ڈالی کہ وہ رات اپنی ڈیوٹی سے واپس آرہا تھا کہ چند نامعلوم افراد نے اس کا تعاقب شروع کردیا۔ اور پھر جیسے ہی پل کے قریب پہنچا تو انہوں نے اسے گھیر لیا اور نقدی وغیرہ چھین کر اسے بے ہوش کرکے ڈال گئے۔

اور پھر کتنی ہی دیر تک شاہد ان سے باتیں کرتا رہا، اچانک اس کی نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھ گئی جہاں سے دن کی روشنی کمرے کے اندر آرہی تھی۔ باتوں کے دوران اسے خیال ہی نہ رہا، کہ وہ رات بھر گھر سے باہر رہا ہے، اور اس کی غیر حاضری سے اس کے گھر والے فکرمند ہورہے ہوں گے، وہ تیزی سے پلنگ سے اتر آیا۔

"اوہ..... دن چڑھ آیا..... مجھے جانا چاہیے، میرے گھر والے فکرمند ہوں گے۔"

"تم یہاں آرام کرو بیٹا..... ہمیں اپنا پتہ بتا دو! تمہارے گھر میں اطلاع کردی جائے گی۔" عورت نے اسے روکنا چاہا۔

"نہیں نہیں میں یہاں نہیں رک سکتا، خدا حافظ۔" شاہد نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اٹھائیس سالہ شاہد صحت مند سڈول جسم اور خوب صورت شکل و شباہت کا مالک تھا، کالج کے زمانے میں وہ باقاعدہ کسرت کیا کرتا تھا، مگر باپ کے مرنے کے بعد جب سے گھر کا بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا اس کی تمام تر توجہ گھر کی گری ہوئی حالت سنبھالنے کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔

وہ ابھی تھرڈ ائیر ہی میں تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا۔ بادل نخواستہ اس نے تعلیم کو خیر باد کہا اور بوڑھی ماں اور جوان بہن کا پیٹ پالنے کے لئے نوکری کی تلاش میں پھرنے لگا، ڈیڑھ دو ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک رحمدل انسان کی سفارش پر اسے بجلی گھر میں ٹیلی فون اٹینڈنٹ کی نوکری مل گئی..... تنخواہ اگرچہ چار ہزار روپے ہی تھی، مگر اسے بھی اس نے غنیمت سمجھا اور باقاعدگی سے ملازمت پر جانے لگا۔

شاہد کا مکان شہر کے وسط میں تھا اور بجلی گھر چھاؤنی میں، اس طرح پہلے تین چار میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ دو ماہ کی ملازمت کے بعد اسے مستقل طور پر رات کی ڈیوٹی دے دی گئی۔ دفتر آنے جانے کی سہولت کے لئے اس نے ایک سائیکل لے لی، گرمیوں میں تو وہ سائیکل پر ہی آیا کرتا، مگر جیسے ہی موسم میں تغیر پیدا ہوا، ہوا کے نرم، لطیف جھونکوں کے بجائے ہڈیوں میں اتر جانے والی یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ چلنے شروع ہوئے تو اس کے لئے سائیکل چلانا مشکل ہوگیا۔ بالآخر اس نے سائیکل کو خیر باد کہا اور پیدل ہی دفتر آنے جانے لگا۔

ایک رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب دوسرے کلرک کو ڈیوٹی کا چارج دے کر دفتر سے باہر نکلا تو اندھیری رات کا دامن ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ آج دن بھر برفباری ہوتی رہی تھی، دس بجے کے

www.pdfbooksfree.pk

قریب آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادل چھٹ گئے تھے اور اس وقت بارہویں رات کے چاند کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جو برف کی سفید بے داغ چادر سے ٹکرا کر آنکھوں میں چکاچوندی پیدا کر رہی تھی۔ چاروں طرف جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، سفیدی ہی سفیدی نظر آ رہی تھی، برف نے ہر چیز کو ڈھک لیا تھا۔ درخت مکانوں کی چھتیں سڑکیں میدان غرض ہر شے نے برف کا لباس اوڑھ رکھا تھا۔

دفتر سے باہر نکلتے ہی برفیلی ہوا کا تیز جھونکا نوک خنجر کی طرح اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ اس کے پورے جسم میں جھرجھری سے پیدا ہوگئی۔ اس نے جلدی سے گردن کے گرد مفلر لپیٹ کر کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے اور اچھی طرح سے بٹن بند کر کے برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگا، سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک مرتبہ اطراف میں دیکھا اور شہر کی طرف رخ کر کے چل پڑا۔

خون منجمد کر دینے والی ہوا کے تیز جھونکے اس کے جسم سے ٹکراتے رہے اور وہ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے ناک سے نٹر نٹر کی آواز نکالتا ہوا تیز تیز قدم اٹھاتا رہا۔

''سنو.....!''

سرگوشیانہ انداز میں ایک سریلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی، اس کے قدم یک لخت رک گئے۔ اس نے گردن موڑ کر آواز کی سمت دیکھا، مگر وہاں تو کسی تنفس کا وجود نہ تھا، سڑک دور دور تک ویران پڑی تھی، دائیں طرف کچھ ہٹ کر پی ایس پی کوارٹر کی قطاریں تھیں اور بائیں طرف سڑک کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سے چار دیواری کے اندر انگریزوں کا قبرستان تھا۔ قبروں کے تکیوں پر لگی ہوئی صلیبیں چار دیواری کے اوپر سے نظر آ رہی تھیں۔

شاہد کی نگاہیں چکراتی ہوئی اس قبر کے بلند چبوترے پر ٹک گئیں جس کے اوپر مریم کا سنگی مجسمہ تھا، مریم کا سفید مجسمہ چاند کی دودھیا روشنی میں بہت ہی پراسرار لگ رہا تھا، شاہد کی نگاہیں ایک مرتبہ پھر سڑک پر پہنچ گئیں، دفعتاً ماحول پر تاریکی چھا گئی، اس نے نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مہیب بادلوں کے دل کے دل آسمان کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے پھیلتے جا رہے تھے۔

شاہد چند لمحے سڑک کے وسط میں کھڑا سوچتا رہا کہ یہ آواز کیسی تھی، کس نے پکارا تھا، مگر جب آس پاس کوئی بھی ذی روح نظر نہ آیا تو وہ اسے اپنا واہمہ سمجھ کر آگے چل دیا۔

ابھی وہ چند ہی قدم چلا تھا کہ اسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی، انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی عورت اونچی ہیل کا سینڈل پہنے ہوئے محتاط انداز میں چلنے کی کوشش کر رہی ہو، شاہد نے ایک مرتبہ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا مگر آس پاس کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہ تھا۔

اس کے پورے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی یہ اس کا واہمہ نہیں ہوسکتا تھا، اس نے صاف طور پر قدموں کی چاپ سنی تھی۔

''یہ کون تھا..... کوئی عورت..... نہیں کوئی بدروح.....'' اس کے ذہن نے سوچا اور دل پر چھائے ہوئے خوف میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا..... چاروں طرف پھیلی ہوئی برف کی سفیدی، اس سفیدی پر حرکت کرتے ہوئے بادلوں کے سائے ویران اور سنسان سڑک.....

شدت کی سردی ہونے کے باوجود اس کا جسم پسینے سے تر ہوگیا..... وہ تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

''سنو.....!''

آواز ایک مرتبہ پھر ابھری۔

''مجھے اس ویرانے میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو..... نہ جاؤ..... رک جاؤ.....'' آواز میں حسرت ویاس کا تاثر تھا، اور آخری الفاظ سسکیوں میں ڈوب کر رہ گئے۔

دوڑتا ہوا پل کے دوسری طرف پہنچ گیا.....

پل کے دوسری طرف پہنچتے ہی اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کے عقب میں قدموں کی آواز رک گئی ہو..... وہ وہیں سڑک کے کنارے ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنا پھولا ہوا سانس درست کرنے لگا..... اس کی نگاہیں بدستور خوفناک انداز میں ویران وسنسان سڑک پر لگی ہوئیں تھیں۔ جس طرف سے وہ دوڑ کر آیا تھا۔

اچانک بائیں طرف دو روشنیاں سی چمکتی ہوئی نظر آئیں، وہ شاید کوئی ٹرک تھا جس کی آواز فضا میں گونج رہی تھی اور روشنیاں قلعہ اور نالے کے درمیان بنی ہوئی سڑک پر گھومتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

ٹرک جیسے ہی لسٹن روڈ کی طرف مڑا شاہد نے سڑک کے وسط میں کھڑے ہوکر اسے رکنے کا اشارہ کیا، ٹرک رک گیا، ڈرائیور کوئی بھلا مانس ہی تھا جو اسے شہر تک پہنچانے کے لئے آمادہ ہوگیا۔

گھر پہنچ کر بھی اس کے دل پر ایک انجانے خوف کا احساس چھایا رہا، وہ جاتے ہی بستر میں دبک گیا تمام رات آنکھوں میں بیت گئی۔ کبھی اسے احساس ہوتا جیسے کوئی نسوانی آواز سرگوشیانہ انداز میں اسے پکار رہی ہے اور کبھی اسے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگتی۔

رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی..... دن طلوع ہونے کے ساتھ ہی اسے حرارت بھی ہوگئی جب ماں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بھونچکی رہ گئی۔ رات جب وہ گھر میں داخل ہوا تھا تو ماں نے اس کی حالت پر غور نہیں کیا تھا۔ اس نے شاہد سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ ٹال گیا۔

دوسرے دن بھی اس کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا۔ پی۔ ایس۔ پی کوارٹر اور مریم والے قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے پھر عورت کی سرگوشیاں اور قدموں کی چاپ سنائی دی وہ اپنی حالت پر قابو پائے کسی نہ کسی طرح پل پار کر گیا، پل کے دوسری طرف پہنچتے ہی قدموں کی چاپ اور سرگوشیاں ختم ہوگئیں۔

اور پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا۔ اسے ہر روز ہی اس واقعہ سے دوچار ہونا پڑتا..... وہ دل میں بے حد خوفزدہ تھا۔ مگر اسی راستے سے اسے بہرحال گزرنا پڑتا۔ اگر وہ راستہ بدل کر ایم۔ پی ہیڈ کوارٹر کی بھی سمت شارع بوستان سے ہوکر شہر آتا تو اس طرح اسے کم از کم دو میل کا اضافی فاصلہ طے کرنا پڑتا جو اسے کسی طرح بھی گوارہ نہ تھا۔ خون منجمد کر دینے والی سردی میں چند قدم چلنا ہی محال تھا تو پھر یہ اضافی دو میل تو اس کے سامنے قیامت ہی ثابت ہوتے۔

اور آج یہ ساتواں روز تھا۔ وہ جیسے ہی مریم والے قبرستان کی چار دیواری اور پی۔ ایس۔ پی کوارٹرز کے درمیان سڑک کے اس حصے میں پہنچا تو اسے پھر سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

''سنو..... سنو..... رک جاؤ..... تم اس طرح مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے..... نہیں جاسکتے..... میں تمہیں نہیں جانے دوں گی..... رک جاؤ.....

شاہد کی قوت برداشت جواب دے گئی..... اس کا دل خوف کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا وہ چلتے چلتے یک دم دوڑنے لگا۔ اور پھر پل کے قریب پہنچ کر وہ گر گیا۔

تین دن کی غیر حاضری کے بعد شاہد جب دفتر پہنچا تو اس کا ساتھی کلرک اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی شاہد ہے جو تین دن قبل آخری مرتبہ اسے ڈیوٹی کا چارج دے کر گیا تھا۔ اس شاہد اور اس شاہد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کے سامنے کھڑے ہوئے شاہد کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں چہرے پر زردی نظر آ رہی تھی، نقاہت اور کمزوری کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

''ارے یہ تین دن میں تمہیں کیا ہوگیا کیا بہت ہی بیمار ہوگئے تھے......؟'' شاہد کے ساتھی کلرک خالد نے پوچھا۔

''ہاں...... بخار تھا......'' شاہد نے مختصر سا جواب دیا اور میز پر رکھے ہوئے رجسٹر کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگا۔

خالد کو شاہد کی بات کا یقین نہ آیا، بھلا تین دن کے بخار سے انسان کی یہ حالت تو نہیں ہوجاتی کہ اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر رکھ دے۔ اس نے شاہد سے مزید کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ برابر ٹالتا رہا، خالد مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔

خالد کے جانے کے بعد شاہد اسٹور کے قریب کرسی پر ٹک گیا، اس کی ذہنی رو پھر اس پراسرار آواز اور قدموں کی چاپ کی طرف بہک گئی۔ جو کئی روز سے اس کا تعاقب کررہی تھی۔ اور یہ تعاقب بھی ایک محدود حد تک رہا۔ اور پھر بالآخر سوچ بچار کے بعد شاہد نے فیصلہ کرلیا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اس پراسرار آواز کا راز جاننے کی کوشش کرے گا...... یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے دل ودماغ پر چھایا ہوا تمام خوف جھٹک کر پھینک دیا۔ اور بارہ بجنے کا انتظار کرنے لگا جب وہ چھٹی کرکے دفتر سے نکلنے لگا۔

ابھی بارہ بجنے میں بیس منٹ تھے کہ بارش شروع ہوگئی...... بارش شروع ہونے کے ساتھ ہی شاہد کے دل کی بے چینی بڑھ گئی، کیونکہ اس طرح لازمی تھا کہ دوسری شفٹ کا کلرک جسے اس نے چارج دینا تھا بارش میں تو آنے سے رہا، اس کی نگاہیں بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ جاتیں جس کی سوئیاں آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں ہر مرتبہ گھڑی کو دیکھنے کے بعد کھڑکی سے باہر بھی دیکھ لیتا، بارش بھی شدت اختیار کرتی جارہی تھی بارہ بجکر پچیس منٹ پر بارش قدرے تھم گئی اور چندمنٹ بعد ہی دوسرا کلرک بھی آگیا۔ اس نے بتایا کہ راستے میں اسے بارش نے آلیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ایک بنگلے کے برآمدے میں ٹھہر کر بارش تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔

شاہد اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر رجسٹر کھول کر اسے سمجھانے لگا۔ اور پھر دستخط کرکے جلدی سے باہر نکل گیا۔ بارش نے پھوار کی صورت اختیار کرلی تھی۔ ہوا بند تھی مگر اس کے باوجود سردی بہت تھی، وہ اپنے جسم کو اچھی طرح سے اوورکوٹ میں لپیٹ کر بجلی گھر کے کمپاؤنڈ سے باہر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا لسٹن روڈ پر مریم والے قبرستان کی طرف بڑھنے لگا، جیسے جیسے وہ قبرستان کے قریب پہنچتا جارہا تھا، اس کے دل میں ایک انجانا خوف چھاتا جارہا تھا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور آگے بڑھتا رہا۔

قبرستان کے قریب پہنچ کر اس کی رفتار ہلکی ہوگئی وہ قبرستان کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ اور پھر چند قدم آگے نکل گیا۔ کوئی آواز یا قدموں کی چاپ نہیں ابھری شاہد حیران تھا کہ آج ایسا کیوں ہوا۔ کیا گزشتہ دنوں میں رونما ہونے والے واقعات اس کا واہمہ ہی تھے مگر پھر اچانک ہی اس کے دل پر خوف کی ایک لہر چھا گئی، اپنے عقب میں اسے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ قدموں کی چاپ سنتے ہی اس کی تمام دلیری اور بہادری ہوا ہوگئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے مگر اس کے قدم جیسے زمین پر گڑ کر رہ گئے سرگوشی کرتی ہوئی نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی......

''میں جانتی ہوں تم آج یہاں سے آگے نہیں جاسکو گے...... دیکھو...... میری طرف دیکھو...... میں ہر روز تمہارے انتظار میں یہاں کھڑی رہتی ہوں آؤ...... میری طرف آؤ۔''

شاہد نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ گھوم کر دیکھا اور پھر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اس سے چند قدم کے فاصلے پر قبرستان کی چار

دیواری کے قریب ملکوتی حسن کی مالک ایک حسین دوشیزہ کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر سر سے پاؤں تک سفید رنگ کا ایک ہی لباس نظر آرہا تھا۔ سفید ساڑھی نما لباس جو ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لہرا رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی برف کی سفیدی کے پس منظر میں سفید لباس پہنی ہوئی دوشیزہ بہت ہی پراسرار نظر آرہی تھی۔

''رک کیوں گئے...... آگے آؤ...... میں کب سے تمہارا انتظار کررہی ہوں۔'' دوشیزہ نے دونوں بانہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔

دوشیزہ کی ہر قسم کے جذبات سے عاری آواز شاہد کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ اس کے قدم غیراختیاری طور پر اس کی طرف اٹھنے لگے۔

''آؤ...... آؤ...... آجاؤ میرے پاس......''

دوشیزہ کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاہد مسحور کن انداز میں اس کی طرف بڑھتا رہا اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے قدم اپنی مرضی سے نہیں اٹھ رہے بلکہ کوئی مقناطیسی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ دوشیزہ کی بانہیں بدستور اس کی طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ شاہد کی نگاہیں اس کے پرکشش چہرے پر مرکوز تھیں اور قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے درمیان چار قدم کا فاصلہ رہ گیا دوشیزہ کی نگاہوں میں ایک عجیب سی کشش تھی اور اس کی نگاہوں کی یہی کشش شاہد کو کشاں کشاں اس کی طرف لئے جارہی تھی۔

اور پھر یک لخت ایک جھٹکے سے وہ رک گیا۔ حسین دوشیزہ نے اپنا بایاں ہاتھ اس کی کلائی پر رکھ دیا تھا۔ شاہد کو ایسے ہی محسوس ہوا جیسے برف کی سل اس کی کلائی پر رکھ دی گئی ہو۔ کچھ اس قدر ہی سرد تھا وہ ہاتھ جس میں زندگی کی حرارت برائے نام بھی نہیں تھی۔

اپنی کلائی کو اس کی گرفت میں محسوس کرتے ہی شاہد کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یکدم اپنا ہاتھ چھڑا کر یہاں سے بھاگ جائے مگر اس میں تو اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا سکتا، وہ تو بدستور اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ نجانے دوشیزہ کی آنکھوں میں کیسی مقناطیسی کشش تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے نظریں نہ ہٹا سکا۔

دوشیزہ کے یاقوتی لبوں پر پھیلی ہوئی پراسرار مسکراہٹ کچھ اور بھی گہری ہوگئی۔ وہ شاہد کی کلائی تھامے ہوئے مڑی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی قبرستان کی چار دیواری کے چھوٹے سے گیٹ کے راستے اندر داخل ہوگئی۔ شاہد کسی سحرزدہ انداز میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

دوشیزہ اس کا ہاتھ پکڑے چلتے چلتے ایک قبر کے پاس رک گئی، اس نے اپنا دوسرا ہاتھ قبر کے سرہانے ایستادہ کراس کے اوپر رکھ دیا۔ عین اسی وقت ایک عجیب سی گونج شاہد کی سماعت سے ٹکرائی! جیسے بہت سی روحیں مل کر گیت گارہی ہوں۔ کوئی انجانا گیت جو شاہد کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''یہاں نہیں...... میرے ساتھ آؤ...... آؤ...... چلے آؤ...... ڈرو نہیں۔''

دوشیزہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے قبروں کے درمیان ایک طرف چلنے لگی۔ شاہد اس کی گرفت میں چلتا رہا، اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس طرف جارہا ہے، اس کی نگاہیں سفید لبادہ پہنے ہوئے ملکوتی حسن کی مالک حسین دوشیزہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہوکر رہ گئی تھیں۔

برفیلی ہوا کے جھونکے تیز ہوچکے تھے اور ان میں خنجر کی سی کاٹ آگئی تھی۔ مگر شاہد کو کچھ احساس نہیں ہورہا تھا۔ اس کے تو بس قدم اٹھ رہے تھے جو اس کے بس میں نہیں تھے۔

دوشیزہ کا رخ قبرستان کے دائیں پہلو میں بڑے برساتی نالے کی سمت تھا، جیسے ہی وہ دونوں

www.pdfbooksfree.pk

قبرستان کی عقبی چار دیواری کے قریب پہنچے۔ ہوا کے جھونکوں نے جھکڑوں کی صورت اختیار کرلی، ہر طرف بکھری ہوئی برف کی کرچیں اڑاڑ کر سوئیوں کی طرح شاہد کے چہرے سے ٹکرانے لگیں، مگر اسے تو جیسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔

دفعتاً شاہد چونک گیا، اس پر چھائی ہوئی مدہوشی دور ہوگئی۔ اس کے چاروں طرف بھیانک شور گونجنے لگا جیسے ہزاروں بدروحیں ایک ساتھ مل کر چلا رہی ہوں ہوا کے دوش پر آنے والی یہ آوازیں اتنی کرخت تھیں کہ اسے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے وہ یکدم ہوش میں آ گیا اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ساتھ کھڑی دوشیزہ کی طرف دیکھا جس نے اس کی کلائی تھام رکھی تھی دوسرے ہی لمحے اس کی نگاہیں دوشیزہ کے چہرے سے ہٹ کر چاروں طرف گھوم گئیں اسے اپنے چاروں طرف بھیانک سائے رقص کرتے ہوئے دکھائی دیئے جو سفید لباس پہنے ہوئے بکھری برف کے پس منظر میں نہایت پراسرار اور حد درجہ بھیانک نظر آرہے تھے، ناچنے کے ساتھ عجیب وغریب آوازوں میں چلا رہے تھے۔ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری کرخت آوازیں جو شاہد کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتری جارہی تھیں، اس نے ایک مرتبہ پھر سامنے کھڑی دوشیزہ کی طرف دیکھا۔

''کک.....کون ہوتم.....؟'' شاہد ہکلا کر رہ گیا اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، مگر اس کی گرفت سخت ہوچکی تھی۔

شاہد نے وحشت زدہ نگاہوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا، اپنے چاروں طرف رقص کرتے ہوئے سایوں کو دیکھ کر اس کے دل پر دہشت چھاگئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی کلائی چھڑانے کے لئے بازو کو پورے زور سے جھٹکا دیا، اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ اس کی کلائی دوشیزہ کے ہاتھ سے آزاد ہوگئی اور وہ دیوانہ وار قبروں کو پھلانگتا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔

اس کے بھاگتے ہی دوشیزہ کے لبوں سے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ آزاد ہوا، اس کے ساتھ ہی چیخنے چلانے اور بین کرنے کی آوازیں تیز ہوگئیں۔ شاہد دیوانوں کی طرح دوڑتا رہا.....

اور پھر اچانک چار دیواری کے قریب پہنچ کر وہ منہ کے بل ایک پختہ قبر پر گرا۔ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا گرنے سے اس کی پیشانی پختہ قبر کے چبوترے سے ٹکرائی اور اس کی پیشانی سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا گرتے ہوئے اسے صاف محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اس کی ٹانگ میں ٹانگ الجھادی ہو۔

اس نے گردن موڑ کر خوفزدہ انداز میں پیچھے کی طرف دیکھا..... دوشیزہ دونوں بانہیں پھیلائے قہقہے لگاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی آرہی تھی.....اس کے ساتھ ہی چاروں طرف پھیلے ہوئے بھیانک سائے وحشیانہ انداز میں چلاتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

رات کے سناٹے میں بدروحوں کی چیخنے چلانے کی آوازیں قبرستان کا پرہیبت ماحول اور اپنے آپ کو مجبور و بے کس دیکھ کر شاہد کا دل ڈوب گیا، وہ ہمت کر کے اٹھا اور پوری قوت سے چار دیواری کی طرف دوڑا مگر دو ہی قدم بعد اس کی ٹانگ پھر الجھ گئی اور وہ ایک مرتبہ پھر قبروں کے درمیان گر گیا گرتے ہی اس کے منہ سے ایک طویل خوفناک چیخ ابھری جو رفتہ رفتہ قبرستان کی تاریکی اور سناٹے میں ڈوب کر رہ گئی۔

دوبارہ جب شاہد کی آنکھ کھلی تو مارے خوف کے اس کی گھگھی بن گئی۔ وہ ایک وسیع وعریض کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ کمرے میں موجود فرنیچر اور دیگر سامان عجیب بے ترتیبی کی حالت میں بکھرے پڑے تھے کمرے کے فرش اور تمام چیزوں پر گرد جمی ہوئی تھی ایسا لگتا تھا جیسے طویل عرصہ سے کسی کے استعمال میں نہیں آیا۔ چھت پر 5 فٹ لمبی تار کے ساتھ بلب لٹکا ہوا تھا جس کے اوپر سفید رنگ کا شیڈ بھی موجود تھا، بلب جل رہا تھا۔

کمرے کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں..... اور باہر تیز ہوا کی سائیں سائیں کی آواز ماحول پر کچھ اور بھی ہیبت طاری کئے دے رہی تھی..... دفعتاً ہوا کا ایک تیز جھونکا، شمالی کھڑکی کی راہ سے اندر آیا اور چھت کے ساتھ لٹکا ہوا بلب ہلنے لگا..... بلب ہلنے سے کمرے میں بکھری چیزوں کے سائے ادھر ادھر حرکت کرنے لگا۔

شاہد نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا اس کی پیشانی میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ اس کا ہاتھ بے اختیار پیشانی پر پہنچ گیا۔ پیشانی کے زخم پر خون جم چکا تھا۔ کچھ دیر تک وہ زخم کو سہلاتا رہا۔ اور دوبارہ ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا، کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھا دروازے کے پٹ بند تھے۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ تو مضبوطی سے بند تھا، اس کے جسم میں سراسیمگی سی پیدا ہوگئی۔ وہ پھٹی پھٹی سے نظروں سے ایک مرتبہ پھر کمرے کا جائزہ لینا لگا۔ اور پھر شمالی کھڑکی کی طرف بڑھا، مگر جیسے ہی وہ کھڑکی کے قریب پہنچا، اس کے پٹ بھیانک انداز میں چرچراہٹ کی آواز پیدا کرتے ہوئے بند ہوگئے، شاہد نے ہاتھ کے دباؤ سے کھڑکی کے پٹ کھولنا چاہے مگر ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے کیلیں ٹھونک دی ہوں۔

وہ تیزی سے دوسری کھڑکی کی طرف لپکا، مگر وہاں بھی یہی کچھ ہوا جیسے ہی وہ کھڑکی کے قریب پہنچا اس کھڑکی کے پٹ بھی چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ بند ہوگئے۔

شاہد کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی اور پورے بدن میں لرزہ سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی حالت کو سنبھالا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے تیسری کھڑکی کی طرف بڑھا جو اس کی امیدوں کا آخری سہارا تھی۔

مگر جیسے ہی وہ کھڑکی کے قریب پہنچا کمرے میں ایک بھیانک نسوانی چیخ ابھری اس کے ساتھ ہی چھت کے ساتھ لٹکا ہوا بلب بجھ گیا، کمرے میں اندھیرا پھیلتے ہی ہر طرف رونے اور چلانے کی بھیانک آوازیں آنے لگیں۔ شاہد کا پورا جسم پسینے سے تر ہوچکا تھا، اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی۔ اس نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ کھڑکی کی طرف بڑھائے جو اس کے بھڑے ہوئے پٹوں سے ٹکرا کر رہ گئے۔ اس لمحہ چیخنے چلانے اور رونے کی آوازوں میں شدت پیدا ہوگئی۔

شاہد پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کی تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا..... کمرے کی چھت کے قریب بنے ہوئے چھوٹے سے روشندان سے چاند کی مدھم روشنی اندر آنے لگی۔ شاید بادل چھٹ گئے تھے۔

ایک کھنکھتا ہوا نسوانی قہقہہ کمرے کی فضا میں گونجا.....

شاہد نے آنکھیں پھاڑ کر آواز کی سمت دیکھا، عین اس جگہ جہاں روشندان کی راہ سے آنے والی چاند کی روشنی پڑ رہی تھی اسے وہی دوشیزہ کھڑی دکھائی دی۔ کمرے میں پھیلی ہوئی تاریکی میں چاندنی کے ایک مختصر سے ہالے میں سفید لباس میں ملبوس دوشیزہ نہایت پراسرار نظر آرہی تھی.....شاہد کی سمجھ میں نہ آسکا کہ بند کمرے میں یہ دوشیزہ کہاں سے آ گئی۔

اس خیال کے آتے ہی شاہد کے جسم پر رعشہ طاری ہوگیا۔ ''کک.....کون ہوتم..... خدا کے لئے بتاؤ تم کون ہو..... اور کیوں میرے پیچھے پڑی ہو.....؟'' شاہد کی پھنسی پھنسی سی آواز کمرے میں ابھری۔

www.pdfbooksfree.pk

"میں....." دوشیزہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ "میں جو کوئی بھی ہوں مگر تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"مم.....مگر.....تم ہو کون.....؟" کچھ تو بتاؤ تم کیا چاہتی ہو.....؟" شاہد ہکلایا.....

"انتقام.....میں انتقام چاہتی ہوں.....اپنی محبت کا انتقام....." دوشیزہ کے لب ہلے شاہد کا دل دہل گیا۔

"انتقام....." وہ خوفزدہ انداز میں بڑبڑایا۔ "مگر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے.....؟ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔"

"تم اگر اپنے دل سے خوف نکال پھینکو تو شاید یہ جان سکو کہ میں کون ہوں۔" دوشیزہ نے جواب دیا۔

عین اسی وقت بلب روشن ہوگیا.....شاہد نے اپنے خوف پر کسی قدر قابو پا کر ایک مرتبہ پوری توجہ سے دوشیزہ کے چہرے کی طرف دیکھا.....اسے اس کے نقوش کچھ جانے پہچانے لگے، یہ شاید اس تاثر کا نتیجہ تھا کہ اس نے کسی حد تک اپنے خوف پر قابو پالیا تھا وہ بغور دوشیزہ کے چہرے کی طرف تکتا رہا مگر وہ یہ نہ جان سکا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا ہے۔

"نن.....نہیں.....میں تمہیں نہیں جانتا....."

"ایلن ہوں.....ایلن شیپرڈ.....تم آٹھ سال پہلے اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاؤ تو تمہیں سب کچھ یاد آجائے گا۔" دوشیزہ بولی۔

"ایلن شیپرڈ"

شاہد کے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر خوفزدہ انداز میں ایلن کی طرف دیکھا۔ وہی بالکل وہی اس کے ذہن نے جواب دیا۔

ایلن شیپرڈ.....ایک برطانوی دوشیزہ.....جو آٹھ سال قبل سیاحت کے شوق میں اس ملک میں آئی تھی.....وہ اکیلی نہیں تھی، اس کے ساتھ چند افراد اور بھی تھے جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی سیاحوں کی یہ پارٹی چھ روز تک کوئٹہ میں رہی شہر کے بہت سے نوجوان سیاح لڑکیوں سے تعارف حاصل کرنے کے لئے ہمہ وقت ان کے گرد منڈلانے لگے، مگر ان سیاحوں نے کسی کو لفٹ نہ دی۔ عامر وہ واحد شخص تھا جوان سے تعارف حاصل کرسکا اور بہت جلد ان سے گھل مل گیا۔ شاہد بھی عامر ہی کے توسط سے ان سے متعارف ہی تھا۔ اور پھر یہ ہوا کہ حسین ایلن خوبرو عامر کے سامنے دل ہار بیٹھی، چھ روز قیام کے بعد جب پارٹی روانگی کی تیاری کرنے لگی تو ایلن نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا، اس بات پر ان کی آپس میں بڑی لے دے بھی ہوئی۔

ایلن کے ساتھیوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ عامر کو چھوڑ کر جانے کو تیار نہ تھی، نتیجہ اس کے ساتھی اسے کوئٹہ ہی میں چھوڑ کر چلے گئے کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور شخص عامر اور ایلن کے راستے میں دیوار بن گیا، اس نے ایلن کو حاصل کرنے کی کوشش کی اسے عامر کے خلاف بھڑکانا چاہا مگر ایلن نے اسے بری طرح سے ڈانٹ دیا.....

اور پھر ایک دن عامر اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔

ایلن اس کی موت کی خبر سن کر پاگل سی ہوگئی.....اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اس شخص کے متعلق شبہ کا اظہار کیا مگر وہ شخص تو اس طرح غائب ہوگیا تھا، جیسے اس کا وجود ہی نہ رہا ہو، پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارتی رہی، مگر وہ دستیاب نہ ہوسکا۔

اور پھر ایک دن ایلن بھی اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی، اسے بھی گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا، گلے پر انگلیوں کے نشانات سے ثابت ہوچکا تھا کہ ایلن کا قاتل وہی شخص ہے جو عامر کا قاتل تھا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد ایک بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ایلن کی ہلاکت سے پہلے اس کی آبروریزی کی گئی تھی۔

عامر، شاہد کا دوست تھا۔ اسے عامر اور ایلن کی موت کا دکھ ہوا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ جبکہ پولیس بھی قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں بے بس ہوچکی تھی۔

قتل کی ان وارداتوں سے پورے شہر میں تہلکہ سا مچ گیا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ اس واقعہ کو فراموش کرگئے۔

اور اب آٹھ سال بعد ایلن شاہد کے سامنے کھڑی تھی "تو کیا ایلن زندہ ہے.....؟" شاہد نے خوفزدہ انداز میں سوچا

"نہیں.....نہیں وہ تو مرچکی ہے.....یہ.....یہ ایلن نہیں ہوسکتی.....تت.....تو کیا یہ ایلن کی روح ہے جو انتقام لینے کے لئے دوبارہ اس دنیا میں آگئی ہے۔"

"ہاں.....میں ایلن کی روح ہوں....." دوشیزہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا گویا اس نے شاہد کے ذہن کی بات پڑھ لی ہو۔

"آٹھ سال تک میں انتقام کی آگ میں سلگتی رہی ہوں.....میں پیاسی ہوں....."

"انتقام.....مم.....مگر مجھ سے تم کس بات کا انتقام لینا چاہتی ہو۔" شاہد دیوار کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔

"تم سے نہیں.....میں اپنا انتقام تمہارے ذریعے سے لینا چاہتی ہوں، عامر کا اور میرا قاتل آٹھ سال بعد اس شہر میں واپس آگیا ہے.....میں جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے مگر.....میں اس سے انتقام نہیں لے سکتی.....میں اسے موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتی....." ایلن کی آواز میں یاسیت ابھر آئی۔

"تو پھر.....تم کیا چاہتی ہو.....؟" شاہد نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم اسے قتل کردو۔" ایلن نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

قتل.....شاہد کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ "نہیں.....نہیں.....یہ نہیں ہوسکتا۔" شاہد چلایا۔

"یہ ہوگا....."

ایلن نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم قاتل سے میرا انتقام لوگے، اگر تم ایسا نہ کرسکے۔ تو تم بھی میری طرح بھٹکتے رہوگے، تمہیں کہیں بھی چین نہیں ملے گا.....تم.....تم انتقام لوگے....."

اس وقت کمرہ ایک مرتبہ پھر رونے اور بین کرنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ کھڑکیوں کے پٹ جو آپ ہی آپ کھل گئے تھے، تیز ہوا کی زوردار آواز کے ساتھ دھڑ دھڑانے لگے.....کمرے سے باہر تیز ہوا کی سائیں سائیں کی آواز اس پراسرار ماحول کو اور بھی ہیبت ناک بنا رہی تھی۔

شاہد سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کی ایڑی تک پسینہ سے تر ہوچکا تھا۔ اس نے خوفزدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر یک لخت کھڑکی کی طرف چھلانگ لگا دی، مگر دوسرے ہی لمحے وہ ہوا میں اچھلتا ہوا کمرے کے وسط میں فرش پر آن گرا.....

اسے ایسا ہی لگا تھا جیسے کسی غیبی قوت نے اٹھا کر پھینک دیا ہو شاہد نے خوفزدہ نگاہوں سے ایلن کی طرف دیکھا اور پھر نظریں کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں، جو اس وقت کھلا ہوا تھا، اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے جسم کی پوری قوت جمع کی اور دروازے کی طرف دوڑا مگر اس مرتبہ پھر کسی غیبی قوت نے اسے اٹھا کر کمرے کے وسط میں پھینک دیا.....اور اب شاہد کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ایلن دروازے پر کھڑی تھی۔

"تت.....تم.....مجھے نہیں.....روک سکتیں....." شاہد نے پھولے ہوئے سانس کے دوران کہا اور دوسری کھڑکی کی طرف دوڑا۔

کھڑکی کے پٹ ایک زوردار آواز کے

www.pdfbooksfree.pk

ساتھ بند ہوگئے..... کمرے میں رونے کی آوازیں ایک دم بڑھ گئیں ڈر اور خوف کے مارے شاہد کے جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا، اس نے ایلن کی طرف دیکھا جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہی تھی..... اس کے ہاتھوں کی پھیلی ہوئی مخروطی انگلیاں دیکھ کر شاہد کو نگاہوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی..... ایلن کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے دبوچ لینا چاہتی ہے..... شاہد خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹنے لگا۔ اور پھر دیوار کے ساتھ ٹک کر ایک طرف سرکنے لگا ایلن بدستور اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ہوا کے زور سے چھت سے لٹکا ہوا بلب زور زور سے ہلنے لگا۔ ہوا کی سائیں سائیں رونے اور چلانے کی آوازوں کے ساتھ مل کر کانوں کے پردے پھاڑنے لگی شاہد کی نگاہوں کے سامنے تاریکی سی چھانے لگی اور پھر.....

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی گردن کسی آہنی شکنجہ میں جکڑی گئی ہو..... ایلن کے برف کی طرح سرد اور بے جان ہاتھ اس کی گردن کے گرد اپنا حلقہ تنگ کرتے جا رہے تھے شاہد کے منہ سے گھٹی گھٹی سی ایک چیخ نکلی اور وہ دیوار کے ساتھ جھکتا چلا گیا۔

شاہد کو جب دوبارہ ہوش آیا تو بدستور اس کمرہ کے فرش پر دراز تھا۔ جہاں ایلن کی روح نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔ خیال آتے ہی اس کا ایک ہاتھ بے اختیار اپنا گلا سہلانے لگا۔ پھر اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ ہر چیز بدستور اپنی جگہ موجود تھی چھت پر لٹکا ہوا بلب بھی جل رہا تھا۔ اس نے کھڑکیوں کی طرف دیکھا سب کی سب بند تھیں وہ بمشکل اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکیوں پر زور آزمائی کرنے لگا۔ مگر کھڑکیاں تو اس قدر مضبوطی سے بند تھیں جیسے ان میں میخیں ٹھونک دی گئی ہوں..... پھر بے اختیار اس کی نگاہ چھت کے قریب روشن دان کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں سے ہلکا ہلکا اجالا اندر آ رہا تھا۔ اس نے روشندان کے راستے فرار کے متعلق سوچا مگر روشندان اتنا اونچا تھا کہ وہاں تک پہنچنا ہی مشکل نظر آ رہا تھا۔ اور اگر وہ کسی نہ کسی طرح روشندان تک پہنچ بھی جاتا تو اس کے راستے باہر نکلنا ناممکن ہی تھا کیونکہ روشندان اتنا تنگ تھا کہ اس کے ذریعے ایک تین سال کا بچہ بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

کمرے کی محدود فضا میں سکوت طاری تھا۔ گہرا سکوت..... جو اس کے دل پر ہیبت طاری کیے دے رہا تھا۔ دفعتاً اس خاموش فضا میں چرچراہٹ کی آواز ابھری شاہد نے تیزی سے گھوم کر گھبرائے انداز میں آواز کی سمت دیکھا کمرہ کا دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ مکمل طور پر کھل گیا۔

شاہد اپنی جگہ پر سکوت و جامد آنکھیں پھیلائے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ کئی منٹ بیت گئے مگر کچھ بھی نہ ہوا دروازہ بدستور کھلا رہا۔ وہ اپنے خوف پر قابو پا کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چوکنے انداز میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے ڈرتے ڈرتے ایک پیر دروازے کی دہلیز کے دوسری طرف رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے آگے بڑھتے ہی دروازہ بند ہو جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، دروازہ بدستور کھلا رہا، اس نے دوسرا قدم بھی دروازے کے باہر رکھ دیا۔

اب وہ ایک چھوٹی سی گیلری میں کھڑا تھا گیلری میں ملگجا سا اجالا تھا اور یہ اجالا چھت کے قریب بنے ہوئے روشندان سے اندر آ رہا تھا۔ گیلری میں دونوں طرف چار کمرے تھے۔ جن کے دروازے کھلے ہوئے تھے ایک کمرہ بالکل سامنے تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا شاہد نے ڈرتے ڈرتے پہلے کمرے کی طرف بڑھا مگر دروازے کے قریب پہنچتے ہی اس کا دروازہ بند ہوگیا، باقی تین کمروں کے قریب پہنچ کر بھی اس کے ساتھ یہی ہوا۔

اب وہ پانچویں کمرے کے قریب کھڑا تھا جس کا دروازہ بند تھا، وہ دروازے کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا..... اس کے دل پر خوف کے سائے گہرے ہونے لگے وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

چند لمحوں تک ماحول پر ہیبت ناک سناٹا چھایا رہا اور سناٹے کی آواز اس وقت مجروح ہوئی جب چرچراہٹ کی پراسرار آواز ابھرنے لگی۔ شاہد پر تشنجی سی کیفیت طاری ہوگئی اس نے گردن موڑ کر آواز کی سمت دیکھا، پانچویں کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا..... وہ چند لمحوں تک وہیں کھڑا رہا اور پھر ڈرتے ڈرتے کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں عین وسط میں فرش پر پڑے ہوئے ایک تابوت پر مرکوز ہوگئیں، تابوت پر نظر پڑتے ہی شاہد کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس نے تیزی سے مڑ کر باہر نکل جانا چاہا مگر دروازہ بند ہو چکا تھا، اس کے جسم سے پسینہ اس طرح بہنے لگا جیسے وہ پانی میں بھیگا ہوا ہو۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا تابوت کی طرف بڑھنے لگا، تابوت کے قریب پہنچ کر اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے تابوت کا ڈھکنا اٹھا دیا اٹھتے ہی کمرے میں یک لخت چیخوں اور کراہوں کی بھیانک آوازیں گونجنے لگیں۔ شاہد کے ہاتھ زور زور سے کانپنے لگے اس نے ایک جھٹکے سے تابوت کا ڈھکنا پیچھے کو الٹ دیا، تابوت کے اندر نظر پڑتے ہی وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

تابوت کے اندر عامر کی لاش پڑی تھی..... اس کا دوست عامر..... جسے آٹھ سال قبل گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا لاش بالکل درست حالت میں تھی، اس کے چہرے کو بغور دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کوئی لاش نہیں زندہ جاوید انسان گہری نیند سو رہا ہے جس میں زندگی کی حرارت موجود ہے۔

شاہد کی ذہنی کیفیت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ ہر لمحہ بعد ایک نیا لرزا دینے والا واقعہ رونما ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی گرتی ہوئی حالت پر قابو پایا اور ایک مرتبہ پھر تابوت کے قریب آ کر عامر کی لاش کو دیکھنے لگا، جو آٹھ سال بعد بھی بالکل تازہ ہی دکھائی دے رہی تھی۔

دفعتاً اس کی نگاہ تابوت سے ہٹ کر کمرے کی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور دن کا ملگجا اجالا کھڑکی کی راہ سے اندر آ رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے کھڑکی کی طرف بڑھا، کھڑکی کے قریب پہنچ کر

جواب.....!

اشفاق احمد کہتے ہیں کہ مجھے ایک سوال نے بہت پریشان کیا کہ مومن اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟

میں نے کئی لوگوں سے پوچھا مگر تسلی بخش جواب نہ ملا۔ ایک دن ایک گاؤں سے گزر ہوا۔ ایک بوڑھا مزدور گنے کا رس نکال رہا تھا میں نے اس سے سوال کیا۔ ''مومن اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟''

اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور فرمایا۔

''مسلمان وہ ہے، جو اللہ کو مانتا ہے اور مومن وہ ہے جو اللہ کی مانتا ہے۔''

ایک ان پڑھ سے ایسا دانش مندانہ جواب سن کر میں حیران رہ گیا۔

(مرتب۔ایس۔امتیاز احمد۔کراچی)

www.pdfbooksfree.pk

وہ رک گیا، اس نے پٹوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے، کھڑکی کے پٹ بند نہیں ہوئے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اطمینان کیا کہ اب کھڑکی بند نہیں ہوگی...... وہ پھرتی سے کھڑکی کے اوپر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کودنے سے پہلے اس نے چہرہ گھما کر کمرہ میں پڑے ہوئے تابوت کی طرف دیکھنا چاہا مگر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کمرہ خالی تھا۔ تابوت کا نام ونشان تک نہیں تھا...... اس وقت کمرہ میں ایک کھنکھتا ہوا قہقہہ گونجا۔

شاہد نے تیزی سے دوسری طرف چھلانگ لگا دی اور بے تحاشہ ایک طرف کو دوڑنے لگا۔ چاروں طرف بڑی بڑی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں وہ ان میں الجھنے کی پرواہ کئے بغیر دوڑتا رہا...... دوڑتا رہا...... وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے...... وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس منحوس مکان سے دور نکل جائے...... اتنی دور کہ وہ اس کے تصور کی پہنچ سے بھی باہر ہو جائے۔

وہ دوڑتا رہا...... دوڑتا رہا...... اس کا سانس بری طرح پھول گیا۔ مگر وہ رکا نہیں دوڑتا ہی رہا۔ اور جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ لڑکھڑا کر ایک جگہ گر گیا۔

کتنی ہی دیر بعد جب وہ اپنے حواس سنبھال چکا تو اس نے اپنے آپ کو سیشن کورٹ کی عمارت کے سامنے نالے کے کنارے بنے ہوئے پارک میں پایا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا...... صبح کا ملگجا اجالا دن کی روشنی میں بدل رہا تھا۔ چاروں طرف برف ہی برف بکھری ہوئی تھی اور برف کے اوپر پھیل کر آنیوالی ہوا اس کے جسم سے ٹکرا کر سنسنی پیدا کر رہی تھی۔

شاہد بمشکل وہاں سے اٹھا اور کسی بدمست شرابی کی طرح جھومتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا...... اور پھر تقریباً دو گھنٹے کی مسلسل جدوجہد کے بعد گھر پہنچ گیا۔

چھ روز ہو گئے شاہد گھر سے باہر قدم نہ نکال سکا، وہ تو اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ چارپائی سے اتر کر صحن تک بھی جا سکتا...... گزشتہ دنوں میں رونما ہونے والے واقعات نے اس کے جسم کا تمام خون نچوڑ کر رکھ دیا تھا، اب تو وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی رہ گیا تھا، ماں اور بہن اس کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں انہوں نے لاکھ سر کھپایا کہ شاہد انہیں کچھ بتا دے مگر اس نے تو جیسے کچھ نہ بتانے کی قسم کھا رکھی تھی۔

شاہد تمام دن اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا سوچتا رہتا، اس کی سوچوں کا محور مس ایلین شیپرڈ کی روح تھی۔

ایلین کے تصور کے ساتھ ہی اس کی نگاہوں کے سامنے اس پراسرار مکان کے کمرے میں پڑا ہوا وہ تابوت گھوم جاتا جس میں عامر کی لاش اس قدر تروتازہ کیوں تھی اور اس کا تابوت اس مکان میں کس طرح پہنچا۔ مزید حیرت کہ وہاں سے تابوت غائب کیسے ہو گیا۔

شاہد نے کئی مرتبہ اس پراسرار مکان کے متعلق بھی سوچا جہاں اس کے ساتھ یہ واقعہ رونما ہوا تھا، مگر ہزار سوچنے کے باوجود اسے یاد نہ آ سکا کہ وہ مکان کون سا تھا۔ اور کس جگہ واقع تھا کیونکہ وہ جب وہاں سے بھاگا تھا تو اسے صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی بھاگتے وقت اس نے مکان کے محل وقوع پر توجہ نہیں دی تھی، موقع ہی نہیں تھا...... وہ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ کھڑکی سے کود کر مکان کے پائیں باغ میں آیا تھا۔ جہاں ہر طرف بے ترتیب خودرو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے زیادہ وہ اس مکان کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے کوئی سایہ اپنی طرف بڑھتا محسوس ہوا۔

''ایلین......'' شاہد پوری شدت سے چلایا، اس وقت کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا

جانے لگا، اس کے ساتھ ہی شاہد کی ماں اور بہن چلا چلا کر اسے دروازہ کھولنے کو کہہ رہی تھیں۔ مگر شاہد کے جسم میں تو اتنی قوت بھی نہ رہی تھی کہ وہ اٹھ کر دروازہ کھول سکتا، اس کا جسم پسینے سے تر تھا اور بدن کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

دروازہ بدستور کھٹکھٹایا جا رہا تھا ساتھ ہی چلانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں اور پھر ایسا محسوس ہوا جیسے دروازہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

شاہد بستر پر دراز بری طرح ہانپ رہا تھا اس کی نظریں خوفناک انداز میں کمرے کا طواف کر رہی تھیں، اور پھر دروازے کا ایک پٹ خوفناک آواز کے ساتھ ٹوٹ کر اندر کی طرف آن گرا شاہد کی ماں اور بہن دیوانوں کی طرح دوڑ کر اس کے قریب پہنچیں اور پھر اس کی حالت دیکھ کر دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاہد کتنی ہی دیر تک ویران ویران نگاہوں سے ان کے چہروں کو تکتا رہا، اور جب وہ اپنے حواس سنبھال چکا تو ماں کے پوچھنے پر بھی نہ بتا سکا کہ اندر سے دروازے کی کنڈی کس طرح لگائی تھی، کیونکہ اس میں طاقت نہیں تھی کہ وہ خود اٹھ کر کنڈی لگا سکتا۔

اور پھر وہ رات آنکھوں میں بیت گئی، ماں اور بہن تمام رات اس کے قریب بیٹھی رہی، اس کے بعد ہر رات ایلین کی روح شاہد کے کمرے میں گھس آتی۔ اور اسے انتقام لینے پر مجبور کرتی رہتی، شاہد دن بدن اپنے حواس کھوتا جا رہا تھا کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے وہ قہقہے لگانے لگتا اور کبھی کسی سے باتوں کے دوران اس کی ذہنی رو بہک جاتی اور وہ دیوانوں کی سی باتیں کرنے لگتا۔

اور پھر ایک روز جبکہ رات سیاہ چادر اوڑھے دبے قدموں اپنی منزل کی طرف گامزن تھی، سردی بہت شدت اختیار کر چکی تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ کچھ ہی دیر بعد برف باری شروع ہو جائے گی۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو گئی۔ شاہد خاموشی سے بستر سے نکلا اور دبے قدموں چلتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا، سڑک پر پہنچ کر وہ تیزی سے ایک طرف چلنے لگا۔ اس کا اندازہ اور رفتار دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی شاہد ہے جو کچھ دیر قبل مردوں کی طرح بستر پر پڑا تھا۔

شہر کے دو تین سڑکیں اور گلیاں طے کرنے کے بعد وہ ایک گلی میں داخل ہو کر ایک مکان کے سامنے رک گیا چند لمحے آس پاس کا جائزہ لینے کے بعد وہ انتہائی پھرتی سے مکان کی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا...... مکان کے اندر پہنچ کر وہ ایک کمرے کی طرف بڑھا۔

''اس طرف......'' اس کے کان کے قریب سرگوشی ابھری، آواز ایلین ہی کی تھی شاہد سحر زدہ انداز میں دوسری طرف گھوم گیا اور کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کا دروازہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر آپ ہی آپ کھل گیا۔

شاہد کمرے کے اندر داخل ہو گیا...... اندر داخل ہوتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے وہ اکیلا کمرے میں داخل نہیں ہوا بلکہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی اندر آیا تھا۔

سامنے پلنگ پر کوئی شخص لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ شاہد نے سحر زدہ انداز میں آگے بڑھ کر آہستگی سے لحاف کھینچ لیا۔

بستر پر جمال سو رہا تھا...... شاہد اور عامر کا مشترکہ دوست جمال...... جو ایلین کے کہنے کے مطابق عامر اور ایلین کا قاتل تھا۔ لحاف سرکتے ہی جمال کسمسایا......

مگر دوسرے ہی لمحے شاہد کے استخوانی ہاتھ اس کا گلا دبوچ چکے تھے، جمال مچل مچل کر اپنے آپ کو اس اچانک افتاد سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا مگر نجانے شاہد کے کمزور ونحیف جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اس کے سامنے سے ہٹنے کا جمال کا

www.pdfbooksfree.pk

جمال کی آنکھیں حلقوں سے ابل آئیں، اس نے آخری مرتبہ مزاحمت کی کوشش کی اور پھر اس کی تمام مدافعت ختم ہوگئی۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے.....

شاہد کا ہاتھ پوری قوت سے اس کا گلا دبائے رہے اور جب یقین ہوگیا کہ جمال ختم ہو چکا ہے تو وہ اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔

دفعتاً کمرے کی فضا میں ایلن کا کھنکھناتا ہوا قہقہہ گونجا اس کے ساتھ چیخنے اور چلانے کی صدائیں کمرے میں گونجنے لگیں..... جو رفتہ رفتہ ڈوبتی چلی گئیں۔

آوازوں کے ختم ہوتے ہی شاہد کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پلنگ پر پڑی ہوئی لاش اور کمرے کا جائزہ لیا۔

''قتل.....'' شاہد کے ذہن میں گونجا۔ پھر اس خیال کے آتے ہی کہ جمال اس کے ہاتھوں قتل ہوا ہے، اس کا جسم پسینے میں تر ہوگیا۔ اس کا رواں رواں کانپ اٹھا، خوف کی ایک شدید لہر اس کے جسم میں سرائیت کرگئی۔ وہ تیزی سے مڑا اور مکان سے نکل کر اندھا دھند ایک طرف کو بھاگ نکلا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا رخ کس سمت ہے وہ تو بس دوڑا جا رہا تھا..... اپنی جان بچانے کے لئے ..... دوڑتے دوڑتے اچانک اس کا رخ لسٹن روڈ کی طرف ہوگیا لسٹن روڈ پہنچ کر اس کی رفتار میں کچھ اور بھی تیزی آ گئی..... اس کا رخ مریم والے قبرستان کی طرف تھا جیسے جیسے وہ قبرستان کے قریب پہنچتا جا رہا تھا اس کے کانوں میں چیخنے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں جو لحہ بہ لحہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔

پل کراس کراتے ہی آوازوں میں شدت آ گئی جیسے ہزاروں روحیں ایک ساتھ مل کر چلا رہی ہوں اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے، مگر وہ دوڑتا رہا، اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

دوڑتے دوڑتے وہ قبرستان کی چار دیواری میں داخل ہوگیا، ایک قبر کے قریب پہنچ کر اس کے قدم بری طرح لڑکھڑائے اور وہ قبر کے اوپر گر گیا..... قبر پر گرتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے گرد بہت سے چیختے چلاتے ہوئے سائے رقص کر رہے ہوں، وحشیانہ رقص۔

شاہد نے سر اٹھا کر دیکھا..... اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کئی سائے وحشیانہ رقص کرتے ہوئے ہاتھوں کے پنجے بڑھائے اس کے قریب پہنچ رہے تھے۔ شاہد کو اپنا سینہ پھٹتا ہوا محسوس ہوا اس کا دل ایک مرتبہ پوری قوت سے اچھلا اور پھر ساکت ہوگیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے..... اس وقت برف باری شروع ہوگئی اور برف کے گالے شاہد کے اوپر گرنے لگے۔

دوسرے روز مریم والے قبرستان سے پولیس نے شاہد کی لاش اٹھالی۔ لاش کی اطلاع پی۔ ایس۔ پی کوارٹروں میں رہنے والے ایک شخص نے دی تھی جو صبح ہی صبح رفع حاجت کے لئے قبرستان سے ملحق نالے کی طرف جا رہا تھا..... پولیس نے لاش اپنے قبضے میں لے لی، پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی موت انتہائی خوف کی حالت میں حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی ہے۔

تحقیقات کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ جس قبر پر شاہد کو سر دہ حالت میں پایا گیا تھا۔ وہ ایک برطانوی سیاح لڑکی کی تھی جو آٹھ سال قبل سیاحت کی غرض سے آئی تھی۔ اور پھر یہیں پر رہ گئی تھی۔ بعد میں اس کے محبوب اور پھر اسے بھی کسی نے ہلاک کر ڈالا، اس سیاح لڑکی کو اس قبر میں دفن کیا گیا تھا مگر وہ راز آج تک کوئی بھی نہیں جان سکا کہ شاہد اس قبرستان تک کیونکر پہنچا۔

ہاتھ کی لکیریں

ذکاءاللہ قریشی۔ کندیاں

حالات کے نشیب و فراز میں گردش دوراں کا سفر جاری رہا، کسے معلوم تھا کہ وقت ایک دن ایسے دوراہے پر لا کھڑا کرے گا، جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آنکھ جھپکتے ہی ہر شخص انگشت بدنداں ہو جائے گا اور پھر.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ ہاتھ کی لکیروں میں ماضی حال اور مستقبل کا راز پنہاں ہوتا ہے؟

آج کے اخبار نے مجھے پھر ماضی کی بھول بھلیوں میں الجھنے کو دھکیل دیا ہے۔ ایک خلش، ایک چبھن تا حیات میرے دل میں رہے گی کہ زیست کے سفر میں بعض اوقات ''ایسا بھی ہوتا ہے'' جسے بھلا پانا ممکن ہی نہیں۔

بعض اوقات، ٹریجڈی، اتنی ناقابل یقین ہوتی ہیں کہ انہیں عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن ہی نہیں۔ یہ کہانی میری اپنی ہی کاسٹ (ذات، قوم) کے لوگوں کی آپ بیتی ہے۔ صرف نام فرضی ہیں۔

میرا نام فرزانہ ہے میرا تعلق ایک ایسے گھرانے اور علاقے سے تھا جو روایات اور اقدار پر آنکھیں بند کر کے چلنا اپنا فرض سمجھتا تھا، قدامت پرستی اور تو ہم پرستی اس گھرانے کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ لیکن ایسے میں کوئی راہی منزل سے بے پرواہ ہو کر باغیوں کی فہرست میں

www.pdfbooksfree.pk

بھی شامل ہوجاتا ہے۔ سو بالکل یہی معاملہ میرے بابا جان کا تھا۔ انہوں نے خاندانی روایات واقدار کو یہ کہہ کر توڑ دیا کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر اپنی اولاد کو تعلیم دلوائیں گے۔ اگر بابا جان نے اپنے بیٹے کے لئے یہ قدم اٹھایا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی مگر ہم دو بہنوں کی تعلیم دلوانے کی ضد سے خاندان والوں کو اعتراض تھا۔

بابا جان ایک تو اکلوتے ہونے کے باعث اور دوسرے اپنے مزاج کی وجہ سے اپنی ضد میں کامیاب ہوئے۔ یوں ہم بھائی بہنوں نے خاندان بھر میں سب سے پہلے اسکول کی شکل دیکھی۔ اپنی ضد کی خاطر بابا جان کو قربانی بھی دینا پڑی مگر وہ پیچھے نہ ہٹے۔

ہمارے خاندان میں بچپن ہی میں اولے بدلے کے رشتے ناتے طے ہوجاتے ہیں لیکن خاندان والوں کے نزدیک بابا جان نے روایات واقدار کو پامال کیا تھا اس لئے خاندان میں ہم سے کوئی بھی رشتہ کرنے کو تیار نہ تھا۔ یہ سزا تو بہت معمولی تھی ورنہ جس خاندان میں بات بات پر گولی چلتی ہو، بھلا وہاں اس سزا کی کیا حقیقت.....!

دن یونہی گزرتے رہے ہم پہلی سے دوسری، تیسری سیڑھی پھلانگتے ہوئے تعلیمی منازل طے کرتے رہے۔ جب میں اور میری بہن نویں جماعت میں آئے تو بابا جان نے ہمیں برقع اوڑھنے کو کہا ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ "اسلام میں عورتوں کے لئے آواز کے پردے کا بھی حکم ہے، سو تمہاری آواز کسی نامحرم کے کانوں میں نہ پڑے۔" اسی لئے ہماری گاڑی کے ڈرائیور نے بھی ہماری آواز تک نہیں سنی تھی۔

دن یونہی گزرتے رہے، ہم دونوں بہنیں بی ایس سی سال اول میں تھیں کہ ہماری کلاس میں ایک لڑکی سارہ نے داخلہ لیا۔

چند ہی دنوں میں پورے کالج میں وہ ایسی مشہور ہوئی کہ سائنس تو سائنس آرٹس سیکشن کی لڑکیاں بھی اسے ڈھونڈتی ہوئی ہماری کلاس میں آنے لگیں۔ اس کی وجہ شہرت دست شناسی کا علم تھا۔ وہ حال تو حال ماضی کا احوال بھی یوں بتاتی کہ عقل محو حیرت رہ جاتی۔

لڑکیاں بے چینی سے اس سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھنے کے لئے اصرار کرتی رہتیں۔

مجھے اور میری بہن کو یہ معلوم تھا کہ سارہ ہاتھ بہت اچھا دیکھتی ہے۔ ایک دن ہم بھی اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اس نے ہم سے کہا۔ "میں آج کے دن ہاتھ نہیں دیکھتی اس کا بھی ٹائم اور دن مقرر ہوتا ہے سو پلیز! آج نہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا "فنکار یونہی نخرے کرتے ہیں نخرے وخرے چھوڑو اور ہاتھ دیکھو ورنہ میں ایسا ہاتھ دکھاؤں گی کہ تم بھی میرے ہاتھ کو ہمیشہ یاد رکھو گی۔ تم نے نہ کبھی ایسا ہاتھ دیکھا ہوگا نہ آئندہ دیکھوں گی۔"

وہ پھر بھی نہ مانی جوں جوں وہ منع کررہی تھی میرا اصرار بڑھ رہا تھا کہ بابا جان کی ضد کی عادت تو میری بھی فطرت تھی، بالآخر میری ضد کے آگے وہ مجبور ہو ہی گئی۔ اس نے میرے ماضی کے بارے میں صرف وہی باتیں بتائیں جو میرے ماضی کا حصہ تھیں۔ میں بہت متاثر ہوئی۔

میں نے اس سے کہا ..... "اب مستقبل کے بارے میں بھی گل افشانی کردو!" ہاتھ دیکھتے دیکھتے وہ کچھ چپ ہوگئی۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا، "تمہارے ہاتھ میں دو شادی کی لکیریں ہیں۔"

"دو شادیاں وہ بھی میری؟ واہ بھئی واہ ابھی تک تو ایک کے آثار پیدا نہیں ہوئے، تم دو کی بات کرتی ہو! کیا دوسری بڑھاپے میں ہوگی؟" میں ہنس کر بولی۔

"دیکھو فرزانہ جو کچھ تمہارے ہاتھ کی لکیروں سے ظاہر ہورہا ہے وہی کچھ میں نے بتایا ہے، ویسے بھی ہاتھ کی لکیریں بدلتی رہتی ہیں۔ ان باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے چلو کینٹین چلتے ہیں۔"

"جی نہیں! تم نے فرزانہ کا تو ہاتھ دیکھ لیا ہے اب میری باری ہے۔" میری بڑی بہن آمنہ نے اپنا ہاتھ سارہ کے آگے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھا سارہ آج تمہارا واسطہ کیسے ڈھیٹ فقیر سے پڑا ہے دست سوال دراز ہے مدد کرو اس کی" میں نے اپنی بہن کی طرف داری کرتے ہوئے مزاحاً سارہ سے کہا۔

سارہ ہاتھ دیکھتے دیکھتے متفکر انداز میں

بڑبڑائی، "بہت حیرت انگیز!"

"کیا ہوا؟" ہم دونوں بہنوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"تم دونوں بہنوں کے ہاتھ میں اتنی مماثلت ہے کہ میں نے آج تک کسی کے ہاتھ میں نہیں دیکھی۔ ایک سا ماضی۔ ایک سا حال، اور ایک سا مستقبل! آمنہ تمہارے ہاتھ میں بھی شادی کی دو لکیریں ہیں۔"

"میرا ہاتھ چھوڑو سارہ! ہم نے تم سے خواہ مخواہ ضد کی، آج تمہارا ہاتھ دیکھنے کا موڈ ہی نہیں تھا۔ اسی لئے تم ایسی باتیں بتا رہی ہو، میرا دل جلا رہی ہو، اٹھو!" فرزانہ نے کہا "کیا خبر یہ تھوڑی ہی دیر میں ہماری تیسری شادی کروادے، ہم لوگوں میں پورے خاندان کی کسی بھی لڑکی کی شادی خاندان سے باہر نہیں ہوئی اور نہ ہی دو شادیاں، لڑکیاں بیوگی کے بعد والدین کے گھر بوڑھی تو ہوسکتی ہیں مگر ان کی دوسری شادی کا تصور بھی کوئی نہیں کرسکتا، یہ ناممکن ہے سارہ!"

آمنہ اس وقت اتنے غصے میں تھی کہ میں نے سارہ کے پاس سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔ گو کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس سے اور بھی باتیں پوچھوں۔

بی ایس سی فائنل میں آکے ہم دونوں بہنوں کی توجہ پڑھائی کی طرف مبذول ہوگئی، ہمیں معلوم تھا کہ اب آخری امتحان دینا ہے، بابا جان مخلوط تعلیم کے خلاف تھے۔ وہ بھلا کب ہمیں یونیورسٹی میں داخلہ دلواتے۔

اتفاق اور حادثات کا چولی دامن کا ساتھ ہے سو ایسا ہی ہمارے ساتھ ہوا۔ بابا جان کے بچھڑے ہوئے دوست کی بابا جان سے ملاقات عرصہ بیس سال بعد اس صورت میں ہوئی کہ بابا جان نے اخبار میں آڑو، سیب کے باغات ٹھیکے پر دینے کا اشتہار دیا تھا۔ اس اشتہار میں بابا جان کا پتہ بھی تھا جسے دیکھ کر بابا جان کے دوست بابا سے ملنے نہ صرف خود آگئے بلکہ اپنی بیگم کو بھی ساتھ لے آئے۔ ان کی بیوی نے ہم دونوں بہنوں کو اپنے بیٹوں کے لئے پسند کرلیا۔

جب باقاعدہ رشتہ آیا تو اماں جان نے جہاں سکون واطمینان کا سانس لیا وہیں بابا جان نے اس رشتے کو اس لئے پسند کیا کہ لڑکے تعلیم یافتہ تھے بلکہ ہمارے اپنے خاندان میں بھی ہمیں کوئی پوچھ نہیں رہا تھا اور جو ایک آدھ رشتہ آیا بھی تو وہ بابا جان نے اس لئے انکار کیا کہ لڑکے ان پڑھ تھے جبکہ یہ لڑکے امریکہ سے تعلیم حاصل کرکے آئے تھے، یوں بابا جان نے روایات واقدار کو دوسری مرتبہ بھی ٹھوکر مار دی تھی۔ ہمارے ہاں لڑکی ساری عمر بیٹھی رہے لیکن اس کی شادی خاندان سے باہر نہیں ہوتی۔

رشتہ طے ہونے کا اعلان ہونا تھا کہ خاندان کے لوگوں نے ہم سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی۔ بابا جان اپنے تئیں جس بات کو صحیح سمجھتے تھے، اس پر بے دھڑک عمل بھی کرتے تھے۔ لیکن جس بات پر ان کے منہ سے "نہیں" نکل جائے ساری عمر کوئی سر پھوڑ کے مرجائے ان کے منہ سے کوئی "ہاں" نہیں نکلوا سکتا تھا۔ بالکل ایسا معاملہ اس وقت درپیش ہوا جب ہماری سسرال والوں نے پوری کوشش کی کہ لڑکے خود لڑکیوں کو انگوٹھیاں پہنائیں گے، بابا جان کا انکار، اقرار میں نہیں بدل سکا، ایک دوسرے کو دیکھنا تو کجا، تصاویر تک نہیں دکھائی گئیں۔

چوری چھپے بھی دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے یہاں لڑکے شادی سے پہلے سسرال کی چوکھٹ پر قدم نہیں رکھتے، پھر بھی ہم دونوں بہنیں خوش تھیں کہ فیملی معزز اور تعلیم یافتہ تھی۔

مستقبل کے خوش آئند سپنوں میں کھوئی ہوئی ہم دونوں بہنیں اپنے اپنے دولہاؤں کے نام کی مالا جپتے ہوئے جہیز کی تیاریوں میں لگی تھیں۔ دن خوشگوار ہوں تو بھلا گزرتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے۔ سو وہ دن بھی آ گیا جس کے انتظار میں لڑکیوں سے دن کاٹے نہیں کٹتے۔

ہم دونوں بہنوں کو جہاں جہیز ایک سا دیا جارہا تھا، وہاں بری بھی بالکل ایک سی آئی تھی۔ مہرون کلر کا لہنگا بھی ہم دونوں کا ایک ساتھ نا ہمارے گھر والوں نے

www.pdfbooksfree.pk

فرق رکھا، نہ ان لوگوں نے کوئی کسر چھوڑی۔

رخصتی کے بعد سسرال والوں نے اپنی رسمیں کیں۔ اس کے بعد ہمیں ہمارے گھروں تک پہنچادیا گیا۔

دوسری صبح ہم رواج کے مطابق ہمارے گھر والے ناشتہ لے کر آ گئے اور واپسی میں ہم بھی ان کے ساتھ میکے آ گئیں۔

یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ میرے بابا گھر پر ہی تھے، جب بھائی اور اماں نے ان سے جانے کو کہا تو وہ فوراً ہمارے سسرال گئے اور وہاں سے ہمارے سسرال والوں کو لے کر لوٹے۔

ہم دونوں بہنوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے؟ جب عقدہ کھلا تو ہم دونوں بہنیں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھیں۔

میرے سسرال والے اور خاندان کے ایک آدھ بزرگ جو شادی میں شریک ہوئے تھے وہ سب اس وقت سر جوڑ کے بیٹھے تھے، اس وقت سب کسی الجھن میں گرفتار تھے۔

میرے بابا جان جو روایات سے انحراف کر کے خاندان سے کٹے ہوئے تھے لیکن پھر بھی سر اٹھا کر چلتے تھے، اس وقت سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سسرال والے الگ پریشان کہ آج ولیمے کی جگہ، ان کی جگ ہنسائی کے اسباب پیدا ہو گئے تھے، ہم دونوں بہنیں جو کل تک مستقبل کے خوش آئند سپنوں کے تانے بانے بن رہی تھیں۔ آج اپنے مستقبل سے خوفزدہ تھیں۔ ہماری نگاہوں کے سامنے ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ ”اب کیا ہوگا.....؟“

غلطی کی ابتداء کس نے کی تھی یہ تو معلوم نہیں لیکن اس کی ابتداء یوں ہوئی تھی کہ ہم دونوں بہنوں کو غلط کاروں میں بیٹھا دیا گیا تھا.....اور یوں کار سے کمرے تک کا سفر بھی اسی بنیاد پر طے ہوا تھا۔

ہمارے سسرال والوں نے رخصتی کے بعد ہمارے منہ بھی کھول کر نہیں دیکھے تھے کہ ریت کے مطابق پہلے دولہا منہ دیکھتا ہے پھر کوئی اور۔

مولویوں اور علماء سے رابطہ کیا گیا اور ان کی آراء کے مطابق طے یوں ہوا کہ عزت بچانے کے لئے ولیمہ شام کو حسب معمول ہوگا لیکن میری بہن کا جس لڑکے سے نکاح ہوا تھا اسے میرا شوہر اور میرا جس حضرت سے نکاح ہوا تھا اسے میری بہن کا شوہر کہہ کر لوگوں کو متعارف کروایا جائے گا۔ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوگا اور ذلت و رسوائی اور جگ ہنسائی بھی نہ ہوگی، وہ لوگ جن کی کوئی خطاء کوئی غلطی بھی نہیں وہ بھی تباہ ہونے سے بچ جائیں گے۔

پروگرام کے مطابق ولیمہ ہو گیا۔ علماء کی رائے کے مطابق ہم دونوں بہنوں کو اسی دن طلاق ہو گئی۔ ہم نے عدت والدین کے گھر گزاری، پھر بالکل خاموشی سے ہمارا نکاح ان حضرات سے ہوا جن کے ساتھ رات گزاری تھی۔

اب ہم ہر طرح سے اپنے گھر میں خوش و خرم ہیں، لیکن ایک کسک ایک چبھن آج بھی ہمارے دل میں ہے کہ ایسا ہوا کیوں؟

سارہ کی بات آج بھی جب یاد آتی ہے کہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں دو شادی کی لکیریں ہیں تو مجھے آج بھی افسوس ہوتا ہے کہ کاش! میں نے بات مذاق میں نہ اڑائی ہوتی بلکہ اس سے کچھ اور پوچھ لیتی، تو شاید حادثے سے بچا جا سکتا تھا، لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو یوں بہلا لیتی ہوں کہ انسان تدبیر کر رہا ہوتا ہے اور تقدیر دور کھڑی مسکرا رہی ہوتی ہے۔ بھلا تقدیر کے آگے بھی کسی کا زور چلا ہے۔

آج اخبار میں خبر ہے کہ دلہنیں بدل گئیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

ایسا کیوں نہیں ہو سکتا اس کی ایک زندہ مثال ہم دو بہنوں کی آپ بیتی ہے۔ میری تو بس یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کی آزمائش و امتحان سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

خونی کتے

شہزادہ چاند زیب عباسی۔ کراچی

اپنی طاقت کے نشہ میں وہ ظلم کرتا رہا، وہ بھول بیٹھا تھا کہ وقت کبھی پلٹ بھی سکتا ہے اور پھر یہی ہوا جب وقت اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ تھر تھر کانپنے لگا، اس کے لئے ایسی سزا منتخب ہوئی جسے دیکھ کر وقت بھی لرز گیا۔

جسم و جاں میں خوف کی لہر دوڑاتی..... ظلم و بربریت کی ایک خوفناک اور ہولناک کہانی

وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ شکاری کتے موت کی صورت میں اس کے پیچھے تھے۔ کتوں کے پیچھے گھوڑوں پر چوہدری عابد اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے آ رہے تھے۔ فضا چوہدری اور اس کے ساتھیوں کے قہقہوں سے گونج رہی تھی۔ سلطان پور نامی وہ گاؤں بہت ہی خوبصورت تھا۔ وہ ایک پہاڑی علاقہ تھا۔ جس کے درمیان ایک دریا بہتا تھا۔ اس گاؤں کی خوبصورتی کی کوئی مثال نہ تھی۔ وہاں کا حاکم چوہدری عابد ایک ظالم انسان تھا۔ گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ چوہدری عابد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی لہٰذا والدین کے مرنے کے بعد تمام دولت و جائیداد اور آبائی حویلی چوہدری عابد کو ملی۔ گاؤں کی جس خوبصورت لڑکی پر اس کا دل آ جاتا۔ اسے اٹھا کر حویلی لے آتا اور اس کی عزت لوٹنے کے بعد لڑکی کو

www.pdfbooksfree.pk

اپنے پانچ خونخوار کتوں کے آگے پھینک کر اس کی موت کا تماشہ دیکھتا اور خوش ہوتا۔

بھاگتے، بھاگتے لڑکی تھک گئی اس کی رفتار سست ہونے لگی کتوں نے قریب پہنچتے ہی لڑکی پر چھلانگیں لگا دیں لڑکی زمین پر گر کر چیخنے لگی۔ اس کی چیخیں بہت ہی اذیت ناک تھیں کتے لڑکی کو بری طرح بھنبھوڑ رہے تھے چوہدری عابد اور اس کے حواری گھوڑوں پر بیٹھے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ظالمانہ کھیل چند منٹ ہی جاری رہا اب زمین پر لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ انسانی گوشت کے عادی کتے لڑکی کے گوشت سے اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

صبح کا وقت تھا 30 سالہ محمد شہزاد تیز قدموں سے چلتا ہوا اسکول کی طرف جا رہا تھا۔ شہزاد سلطان پور کے ایک اسکول میں ٹیچر تھا۔ اچانک ہی اس کے کانوں میں کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز آئی۔ شہزاد نے آواز کی سمت دیکھا۔ گاؤں کے ایک کسان رمضان کی بیٹی رضیہ بھاگتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے گھوڑوں پر چوہدری عابد اور اس کے ساتھی تھے۔

"شہزاد بھائی مجھے ان ظالموں سے بچاؤ انہوں نے میرے باپ کو مار ڈالا ہے اور اب میرے پیچھے پڑے ہیں۔" لڑکی لڑکھڑا کر شہزاد کے قریب گری۔

"چل لڑکی تو نے ہمیں بہت بھگایا" چوہدری عابد نے گھوڑے سے اتر کر لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

"لعنت ہے چوہدری تم پر ....." شہزاد نے چوہدری کو پیچھے دھکیلا۔ یہ دیکھتے ہی چوہدری کا دست راست ہاشم اور دوسرے کارندے پھرتی سے اپنے گھوڑوں سے اترے۔ ہاشم نے نیچے اترتے ہی شہزاد کے جبڑے پر گھونسہ مارا۔ شہزاد لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ہاشم کے دوسرے ساتھی بھی شہزاد پر حملہ آور ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود رائفلوں کے دستے شہزاد کے بدن کے مختلف حصوں پر پڑ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں شہزاد زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ چوہدری کے غنڈوں نے چیختی چلاتی رضیہ کو اٹھایا اور حویلی کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

اب حویلی کے صحن میں خونخوار کتے بے بس چیختی چلاتی رضیہ پر اپنے پنجوں اور خوفناک دانتوں سے حملہ آور تھے۔ کتے اس کی چیخوں سے بے نیاز اسے چیر پھاڑ کر کھا رہے تھے۔ رضیہ کو برباد کرنے کے بعد چوہدری نے حسب معمول اسے کتوں کے آگے ڈال دیا تھا اور خود اس کا تماشہ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ چوہدری عابد بچپن ہی سے ظالم تھا 12 سال کی عمر میں اس نے اپنے لئے چائے لے کر آنے والے ملازم کو محض معمولی سی بات پر گولی مار دی تھی۔ جس کپ میں ملازم چائے لایا تھا اس کا کنارہ معمولی سا ٹوٹا ہوا تھا۔ گاؤں والے چوہدری سے ڈرتے تھے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے چوہدری کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

شہزاد شام کے وقت اپنی بیوی شبانہ اور 5 سالہ بیٹے راجو کے ساتھ صحن میں بیٹھا بات چیت کر رہا تھا۔ چوہدری والے واقعے کو ہفتہ گزر چکا تھا۔ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

"کون ہے آ رہا ہوں بھائی۔" شہزاد دروازے کی طرف لپکا۔ جیسے ہی شہزاد نے کنڈی کھولی۔ چوہدری عابد، ہاشم اور ان کے دیگر ساتھی شہزاد کو دھکیلتے ہوئے گھر میں گھس گئے۔

25 سالہ ہاشم ورزشی جسم کا مالک ہونے کے علاوہ لڑائی بھڑائی کا ماہر بھی تھا۔ "تم نے کیا سمجھا کہ میں اپنا راستہ روکنے والے کو معاف کر دوں گا۔ ہاشم اسے اور اس کے بیوی بچوں کو حویلی لے چلو۔" چوہدری نے حکم دیا۔

"کمینے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" شہزاد چوہدری پر جھپٹا ہی تھا کہ راستے میں ہاشم آ گیا۔ ہاشم کا زوردار پنچ شہزاد کی کنپٹی سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ہوش میں آنے کے بعد شہزاد نے خود کو درخت سے لٹکا ہوا پایا وہ درخت کی ایک مضبوط شاخ سے الٹا لٹکا ہوا تھا اسے رسی کی مدد سے باندھا گیا تھا۔ سامنے ہی زمین پر اس کی بیوی پھٹے ہوئے کپڑوں میں رو رہی تھی۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑے اس پر بیتی کہانی سنا رہے تھے قریب ہی اس کا 5 سالہ بیٹا راجو ہاتھ پاؤں سے بندھا زمین پر پڑا تھا ان کے اردگرد چوہدری اور اس کے حواری کتوں کی زنجیریں تھامے کھڑے تھے۔ "چوہدری ان کو چھوڑ دو ان کا کوئی قصور نہیں تمہارا راستہ میں نے روکا تھا جو کرنا ہے میرے ساتھ کرو۔" شہزاد چلایا

"تیری باری بھی آئے گی ماسٹر پہلے اپنے گھر والوں کا حشر دیکھ لے۔" چوہدری نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ چوہدری کا اشارہ پاتے ہی ہاشم اور دوسروں نے کتوں کی زنجیریں کھول دیں۔ کتے آزاد ہوتے ہی ان ماں بیٹے پر غراتے ہوئے لپکے۔ دونوں ماں بیٹے چیختے رہے اور چوہدری قہقہے لگاتا رہا۔ شہزاد کا کمزور دل وہ منظر نہ دیکھ سکا، وہ بے ہوش ہو گیا۔ کھیل چند لمحوں میں ختم ہو گیا۔ ان مظلوم ماں بیٹے کی لاشیں کتے ادھیڑ کر کھانے میں مصروف تھے۔ شہزاد درخت سے بے ہوش الٹا لٹک رہا تھا۔

"اس ماسٹر کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں پھینک آؤ۔" چوہدری نے ہاشم کو حکم دیا۔

☆.....☆.....☆

ادھر دریا کے کنارے زبیر بیٹھا گہری سوچوں میں گم تھا۔ زبیر کے والد نوجوانی میں سلطان پور سے روزگار کے سلسلے میں شہر گئے اور فوج میں بھرتی ہو گئے اسی دوران زبیر کے والد اشرف کے والدین ایک حادثے میں چل بسے۔ اشرف صاحب وہیں کے ہو کر رہ گئے شہر میں ہی شادی کر لی وہیں زبیر پیدا ہوا۔ کچھ مہینے قبل جب زبیر کی والدہ جمیلہ بیگم انتقال کر گئیں تو اشرف صاحب کا دل شہر میں نہ لگا۔ فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے لہٰذا شہر کو الوداع کہہ کر اپنے اکلوتے بیٹے زبیر کے ہمراہ اپنے گاؤں سلطان پور آ گئے اور دریا کنارے اپنی زمینوں میں خوبصورت سا مکان بنا لیا۔

چوہدری کے مظالم کے بارے میں کبھی کبھی ان کے کانوں میں بھی کچھ نہ کچھ پڑتا مگر وہ اسے نظر انداز کر دیتے۔ وہ اپنے حال میں مست رہنے والے انسان تھے نئی جگہ نیا ماحول زبیر اکثر بے چین ہو کر گھر سے نکل کر دریا کنارے آ بیٹھتا۔ اس وقت بھی دریا کنارے بیٹھے رہنے کا سبب یہی وجہ تھی۔ زبیر اچانک چونک پڑا۔ اس نے دریا میں کسی چیز کو بہتے دیکھا۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کوئی انسان ہے، زبیر ماہر تیراک تھا۔ اس نے فوراً ہی دریا میں چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا پانی میں بہتے شخص تک جا پہنچا تھوڑی سی جدوجہد کے بعد زبیر اس شخص کو دریا سے نکال لایا۔ اس شخص کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ نبض دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ زبیر نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ پاؤں کھولے اور اس کے پیٹ پر دباؤ ڈال کر اس کے پیٹ سے پانی نکالنے لگا

☆.....☆.....☆

شہزاد ایک سرنگ کے اندر دوڑ رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے اسے سرنگ کے اندر دوسرے کنارے پر اپنی بیوی اور بیٹا دکھائی دیئے وہ انہیں پکارتے ہوئے اور تیز رفتاری سے دوڑنے لگا اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا گرتے ہی سرنگ کا منظر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے ہوش آ گیا۔

"پاپا....." اس کے کانوں سے ایک چہکتی آواز ٹکرائی اور شہزاد نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ایک کمرے میں چارپائی پر لیٹا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک 50-55 سالہ نورانی چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سفید داڑھی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ چارپائی کے دائیں طرف ایک 18 سالہ صحت مند خوبصورت لڑکا کھڑا تھا۔ "بیٹا کون ہو تم؟ اور کس نے تمہیں باندھ کر دریا میں پھینکا تھا۔" بابا کے ہمدردانہ لہجے میں پوچھنے پر شہزاد کا دل بھر آیا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"کیا ہوا بیٹا؟" بابا نے شفقت سے شہزاد کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔

"بابا میں جینا نہیں چاہتا میری دنیا لٹ چکی ہے۔" شہزاد روتے ہوئے بولا۔

www.pdfbooksfree.pk

"آخر ایسا کیا ہوا ہے کہ تم زندگی سے بیزار ہو.....؟"

شہزاد نے روتے ہوئے اپنی داستان انہیں سنادی۔

"بیٹا میرا نام اشرف ہے اور یہ میرا بیٹا زبیر ہے اسی نے تمہاری جان بچائی ہے۔ ظالم سے ڈرنا غلط ہے، مزہ تو تب ہے ظالم کو اس کے ظلم سے روکا جائے۔ اس کا مقابلہ کیا جائے۔"

"بابا میں کمزور ہوں چوہدری کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

"کوئی بھی انسان جو حق پر ہو کمزور نہیں میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم چوہدری کا مقابلہ کیسے کرو گے۔ خاموشی سے ظلم سہنا ظالم کو مزید طاقتور بناتا ہے ظالم کے ہاتھ کو روک کر اس سے لڑنا سیکھو۔ درد کو سہنا سیکھو۔ ہمیں جب چوٹ لگتی ہے تو ہم جتنا درد محسوس کرتے ہیں ہمیں اتنا ہی درد ہوتا ہے اگر ہمیں درد نہ ہو، اگر ہم بھوک اور پیاس برداشت کرلیں۔ تن آسانی سے پیچھا چھڑالیں تو ہم فولاد سے بھی مضبوط بن سکتے ہیں میں ریٹائر فوجی اور مارشل آرٹ کا ماہر بھی ہوں، میں تمہیں فولاد بنادوں گا۔ اب تمہیں نئی زندگی جینا ہوگی سب سے پہلے تمہیں قوت برداشت پیدا کرنا ہوگی ہر قسم کی تکلیف سہنا سیکھنا ہوگا۔ جب تک تم چوہدری کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہیں چھپ کر رہو۔ کسی کے سامنے مت جاؤ تاکہ وہ ظالم تمہیں مردہ ہی سمجھتا رہے۔ آج آرام کرو، کل سے تمہاری ٹریننگ شروع۔"

دوسرے دن سے شہزاد کی ٹریننگ شروع ہوگئی پہلے پہل تو وہ جلدی تھک جاتا مگر جب اپنی بیوی اور بیٹے پر بیتے ظلم اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتے تو وہ جنونی ہوجاتا۔ وہ بغیر رکے میلوں بھاگتا رہتا۔ بند کمرے میں گھنٹوں سینڈ بیگ سے مصروف رہتا وہ خود کو سخت ترین ورزشوں میں غرق کردیتا۔ اس کے پاؤں سوج جاتے۔ ہاتھوں اور پاؤں سے خون نکلنے لگتا۔ اذیت کا حصول اس کا مشغلہ بنتا جارہا تھا کبھی کبھی اسے لگتا وہ بے ہوش ہونے والا ہے مگر وہ رکتا نہیں اس کے کانوں میں بابا کی آواز گونجتی وہ دیوانوں کی طرح لگا رہتا پھر چکرا کر گر جاتا پھر اٹھتا پھر شروع ہوجاتا۔ اس کا جسم تکلیف سہنے کا عادی ہوچکا تھا۔ سخت سردی اور بارش کے باوجود دریا کنارے بھاگتا رہتا۔ بعض اوقات درختوں اور دیواروں کو چوہدری تصور کرکے گھونسے مارنے لگتا اور لہولہان ہوجاتا اور زخمی ہونے کے باوجود وہ رکتا نہیں۔

زبیر جو خود بھی بلیک بیلٹ تھا بابا کے کہنے پر شہزاد سے فائٹ کرتا۔ پہلے پہل تو شہزاد صرف مار کھاتا رہا مگر کچھ مہینوں بعد وہ زبیر کا سامنا کرنے کے قابل ہوگیا ایک سال بعد شہزاد بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ اس کی ٹریننگ مکمل ہوچکی تھی۔ بابا نے اسے اسلحہ چلانا بھی سکھادیا تھا۔

"شہزاد اب تم فولاد بن چکے ہو۔ جاؤ اپنا بدلہ لینے کے ساتھ ساتھ مظلوموں کو بھی چوہدری کے ظلم سے بچاؤ اپنی طاقت کو کسی مظلوم پر استعمال مت کرنا بلکہ مظلوموں کی مدد کرنا، اللہ تمہاری مدد کرے گا۔" بابا نے کہا تو شہزاد بابا اور زبیر کے گلے سے لگ گیا۔

بہرحال جیسے جیسے وقت گزرتا گیا چوہدری عابد کے ظلم میں اضافہ ہوتا گیا۔ شیکھر نامی ایک ہندو کہیں سے گھومتا ہوا سلطان پور آپہنچا یہاں اس کی ملاقات چوہدری عابد سے ہوئی شیکھر نے اپنے عقائد میں چوہدری عابد کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا اب چوہدری عابد نے بھی بتوں کی پوجا شروع کردی۔ حویلی میں کالی کا بت رکھ لیا گیا اور معصوم بچوں کو اس بت کی بھینٹ چڑھایا جانے لگا چوہدری عابد کا پرانا مشغلہ بھی جاری تھا اس وقت بھی ہاشم اپنے 3 ساتھیوں کے ہمراہ گاؤں کے ایک غریب مزارعے کی بیٹی کو اغوا کرکے حویلی کی طرف جارہا تھا۔ لڑکی جیپ میں رسی سے بندھی پڑی تھی۔

اچانک جیپ کے سامنے ایک نقاب پوش آکر کھڑا ہوگیا۔ "کون ہو تم؟ ہاشم کا راستہ روکنے کی تم نے ہمت کیسے کی.....؟" ہاشم جیپ سے چھلانگ لگا کر جیپ سے اترا۔

"ہاشم میں تیری موت ہوں، آج تو نے اپنے کیے گئے ہر ظلم کا حساب دینا ہے آج کا دن تیرے لئے

یوم حساب ہے۔" شہزاد نے اپنے چہرے پر بندھا رومال اتار کر پھینک دیا۔

ہاہا..... ہاہا..... اگر زندہ بچ ہی گئے تھے تو ہاشم کے سامنے آکر مرنے کی بیوقوفی مت کر ماسٹر۔" ہاشم نے اپنے ہولسٹر میں سے پستول نکال کر اس کا رخ شہزاد کی طرف کیا اور اس کے سامنے جا پہنچا۔ "اب تو بھی اپنی بیوی اور بیٹے کے پاس جا۔"

ابھی الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ ایک بجلی سی کوندی۔ شہزاد نے ٹانگ چلائی۔ اس کے پستول ہاشم کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا فوراً ہی سائیڈ کک ہاشم کے سینے پر لگی ہاشم الٹ کر گرا مگر فوراً ہی کھڑا ہوگیا ہاشم کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ یہ دیکھ کر ہاشم کے تینوں ساتھی بھی جیپ سے اتر آئے، انہوں نے اپنی آٹومیٹک رائفلیں شہزاد پر تان لیں۔

"کوئی بیچ میں نہیں آئے گا۔ نہ ہی گولی چلائے گا اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے میں خود اسے سبق سکھاؤں گا۔" ہاشم کے روکنے پر ان تینوں نے اپنی رائفلیں دوبارہ اپنے کندھے سے لٹکالیں۔

ہاشم اندھا دھند شہزاد سے جا ٹکرایا۔ اس کا سر شدت سے شہزاد کے سینے سے ٹکرایا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کا مدمقابل اب عام شخص نہیں فولاد ہے اس کے سر کی ٹکر سے شہزاد پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور پھر تیزی سے آگے آیا۔ شہزاد کا گھونسہ ہاشم کے جبڑوں پر پڑا تو اس کی آنکھوں میں ستارے سے رقص کرگئے، یکا یک وہ کسی جانور کی طرح شہزاد پر پل پڑا چند سیکنڈ میں شہزاد کو درجنوں ضربیں اپنے جسم پر سہنا پڑیں۔ پھر اس کا داؤ چل پڑا تھوڑا پیچھے ہٹ کر شہزاد نے فلائنگ کک لگائی تو ہاشم لڑکھڑا کر گرا۔ مگر گرتے ہی اٹھ گیا۔ شہزاد نے ہاشم کے چہرے پر پنچ مارنے کی کوشش کی تو ہاشم نے جھکائی دے کر خود کو بچایا۔

اور پھرتی سے شہزاد کی پشت پر پہنچ کر اس کی گردن کے گرد اپنا بازو لپیٹ لیا۔ ہاشم نے شہزاد کی گردن پر اپنا دباؤ بڑھانا شروع کردیا۔ شہزاد کی آنکھوں میں تکلیف کے آثار نمایاں ہونے لگے اس کی سانس رکنے لگی، پھر شہزاد نے اپنے جسم کو پیچھے کی طرف جھکایا اور ہاشم کا کالر پکڑ کر داؤ لگایا، ہاشم شہزاد کے اوپر سے اڑتا ہوا جیپ کے بونٹ پر جا گرا تو چند لمحوں کے لئے ہاشم بے حس و حرکت ہوگیا اسی لمحے سے فائدہ اٹھا کر شہزاد نے زمین پر پڑا ہاشم کا پستول اٹھایا اور پھرتی سے ہاشم کے تینوں ساتھیوں کا نشانہ لے کر فائر کھول دیا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنی رائفلیں کندھے سے اتارتے شہزاد ان کے جسم میں پستول کی گولیاں اتار چکا تھا۔ ان کو جہنم رسید کرنے کے بعد شہزاد اٹھتے ہوئے ہاشم کی طرف لپکا اور اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ دس منٹ بعد ہی ہاشم زمین پر ادھ موا پڑا تھا۔ شہزاد نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا اور ہاشم پر پے در پے وار کرکے موت کی نیند سلا دیا۔ شہزاد نے ہاشم کا ہولسٹر اور پستول اٹھایا، لڑکی کو کھولا اور اسے لے کر اس کے گھر چھوڑنے کے لئے روانہ ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

کالی کے بت کے قدموں میں چوہدری عابد اور شیکھر نے ایک بچے کو لٹایا ہوا تھا جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے بچہ خوف سے چیخ رہا تھا۔ شیکھر نے بچے کے سینے پر اپنا پاؤں رکھا اور گردن پر تیز دھار چھرا چلادیا۔ بچے کی گردن سے بہنے والا خون کالی کے بت کے قدموں کو رنگین کرنے لگا۔ شیکھر اور چوہدری ہاتھوں سے خون بت پر اچھالنے لگے اسی اثنا میں چوہدری کا ملازم تہہ خانے میں داخل ہوا۔ "چوہدری صاحب غضب ہوگیا۔"

"کیا مصیبت آگئی جو تو نے ہماری پوجا میں خلل ڈالا۔" شیکھر غرایا۔

"کسی نے ہاشم اور اس کے ساتھیوں کو قتل کردیا ہے ان کی لاشیں کچی سڑک پر پڑی ہیں۔" ملازم خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"کیا بکواس کررہا ہے، کس کی ہمت ہے جو چوہدری کے بندوں پر ہاتھ اٹھائے، شیکھر تم اپنے ساتھ

www.pdfbooksfree.pk

میرے بندے اور شکاری کتے لے جاؤ اور دشمن کو کتوں کے آگے ڈال کر آؤ۔" چوہدری نے حکم دیا۔

شیکھر اپنے ساتھ پانچ بندے اور پانچوں آدم خور شکاری کتوں کے ہمراہ جیپ میں سوار ہوا اور اس مقام پر جا پہنچا جہاں ہاشم اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں پڑی تھیں چوہدری کے بندوں نے کتوں کی زنجیریں تھام رکھی تھیں۔ شیکھر نے لاشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ اچانک اس کی نظر ایک رومال پر پڑی یہ وہ رومال تھا جو شہزاد نے چہرے پر باندھ رکھا تھا۔ شیکھر نے رومال اٹھا لیا۔ کتوں کے قریب لے آیا، کتے رومال سونگھتے ہی بھونکنے لگے۔ ان کی زنجیریں کھول دو۔ شیکھر نے حکم دیا۔ کتے آزاد ہوتے ہی ایک سمت بھاگنے لگے۔ شیکھر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جیپ میں سوار ہوا اور جیپ کتوں کے تعاقب میں روانہ ہوگئی۔

ادھر شہزاد لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ کر تھوڑی دیر چلتا رہا پھر دریا کنارے بیٹھ گیا کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اس کے کانوں میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شہزاد نے ہولسٹر سے پستول نکال کر آواز کی سمت دیکھا تو اسے چوہدری کے خونخوار کتے اور ان کے پیچھے آتی جیپ نظر آ گئی جیسے ہی وہ پستول کی رینج میں آئے شہزاد نے گولیاں چلا دیں۔ ایک گولی ایک کتے کے سر میں لگی دوسری گولی دوسرے کتے کے سینے میں اور تیسری گولی جیپ کے ڈرائیور کے سینے میں جا لگی اسی اثنا میں بچ جانے والے تینوں کتوں نے شہزاد پر چھلانگ لگا دی۔ ڈرائیور کو گولی لگتے ہی تیز رفتار جیپ لہرا کر دریا میں جا گری۔

شہزاد کتوں کے بوجھ تلے زمین پر جا گرا۔ "کتوں نے شہزاد کی ٹانگ میں دانت گھسیڑ دیئے اور تیسرا شہزاد کے سینے پر سوار ہوگیا۔ شہزاد نے پھرتی سے پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا اور سینے پر سوار کتے کی گردن میں اتار دیا۔ تیز دھار خنجر نے کتے کو وہیں ڈھیر کر دیا شہزاد کی ٹانگ سے لپٹے کتے پلٹ کر شہزاد پر سوار ہو گئے اور خنجر شہزاد کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ہمت کر کے شہزاد نے دونوں کتوں کو اچھال کر پرے پھینکا اور اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔ خونخوار کتوں نے شہزاد کو زخمی کر دیا تھا۔ شہزاد اپنی قوت برداشت کے سہارے بھاگ رہا تھا۔ دونوں کتے کسی بلا کی طرح اس کے تعاقب میں تھے۔ بابا سے لی گئی ٹریننگ اس کے کام آ رہی تھی، کتوں اور شہزاد کے بیچ چند گز کا فاصلہ تھا جو کسی بھی لمحہ کم ہو سکتا تھا۔ قوت ارادی کے سبب زخمی ہونے کے باوجود شہزاد دوڑ رہا تھا۔

بھاگتے بھاگتے ایک درخت کے قریب سے شہزاد نے پھرتی سے جمپ لگایا اور نیچے جھکی ہوئی مضبوط شاخ کو پکڑ کر اس کے اوپر چڑھ گیا۔ کتوں کے قریب پہنچتے ہی وہ بلندی پر پہنچ چکا تھا، کتوں نے پہلے تو اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے اب کتے درخت کے نیچے کھڑے بھونک رہے تھے اور شہزاد کا درخت سے نیچے اترنے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ وہ کتے تھے جنہیں چوہدری عابد نے انسانی گوشت سے پالا تھا۔ آدم خور خونی کتے بھوک سے بے حال ہو رہے تھے اور بار بار درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے ادھر زخموں کی وجہ سے شہزاد کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ بار بار سر جھٹک کر خود کو بے ہوش ہونے سے بچا رہا تھا۔ ہوش میں رہنے میں ہی اس کی زندگی تھی۔ بے ہوش ہوتے ہی وہ درخت سے گر جاتا اور کتے اسے چیر پھاڑ دیتے۔ زخموں سے بہتا ہوا خون اسے کمزور کئے جا رہا تھا لیکن آخر کب تک اس کے ذہن پر دھند چھانے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ سنبھلتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ زمین سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ بے ہوش ہو کر گرتا چلا گیا۔ اسے درخت سے گرتا دیکھ کر کتے بھونکتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔

☆.....☆.....☆

لیکن اس جگہ سے تھوڑی دور زبیر ہاتھ میں رائفل تھامے شکار کی تلاش میں گھوم رہا تھا اس کے کانوں سے خونی کتوں کے بھونکنے کی آواز ٹکرائی۔ اس نے اپنی رائفل لوڈ کی اور تیز قدموں سے آواز کی سمت

جانے لگا۔ آواز لحہ بہ لحہ اس کے قریب آتی جا رہی تھی۔

اچانک اس نے اپنی زندگی کا خوفناک منظر دیکھا۔ درخت کے اوپر سے ایک شخص لڑکھڑا کر گرنے لگا اور تین خونی دیوہیکل کتے اس کی طرف لپکے۔ زبیر نے اپنی رائفل کا رخ کتوں کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ زبیر کا نشانہ بے مثال تھا وہ اڑتے ہوئے پرندوں کو شکار کر لیا کرتا تھا۔ گولیاں ٹھیک نشانے پر لگیں اور خونی کتے ڈھیر ہو گئے۔ زبیر نیچے گرے شخص کی طرف لپکا، اس نے جیسے ہی اسے سیدھا کیا تو حیران رہ گیا۔ وہ شہزاد تھا جو بے ہوش پڑا تھا زبیر نے شہزاد کو کندھے پر لادا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہزاد اپنی قوت ارادی کے سبب چند گھنٹوں میں ہوش میں آ چکا تھا۔ بابا نے اس کی مرہم پٹی کر دی تھی۔ ہوش میں آتے ہی وہ حیران رہ گیا۔ پورا گاؤں زبیر کے گھر پر جمع تھا۔ "حیران مت ہو دوست! اب پورا گاؤں بیدار ہو چکا ہے، بابا نے انہیں سمجھا دیا ہے اب یہ سب چوہدری سے ٹکرانے کو تیار ہیں، تم نے جس ہمت اور بہادری سے تن تنہا چوہدری کا مقابلہ کیا ہے یہ سب اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ چلو چوہدری سے اس کے ظلموں کا حساب لے کر آج کے دن کو اس کا یوم حساب بنا دیتے ہیں۔"

شہزاد بستر سے اٹھ کھڑا ہوا زبیر اور شہزاد کی قیادت میں گاؤں والوں کا جلوس حویلی کی طرف بڑھنے لگا کسی نے کلہاڑی اٹھا رکھی تھی تو کسی نے لاٹھی اور کسی نے خنجر۔ زبیر اور شہزاد کے ہاتھوں میں رائفلیں موجود تھیں، ابھی وہ کچھ دور ہی چلے تھے کہ دور سے انہیں دو جیپیں آتی دکھائی دیں۔

"درختوں کی آڑ میں ہو جاؤ، جیسے ہی وہ نزدیک پہنچیں گے۔ ہم ان پر حملہ کر دیں گے۔" شہزاد نے ہدایت کی۔ وہ سب جلدی جلدی چھپنے لگے۔ کوئی درختوں کی آڑ میں ہو گیا اور کوئی کھیتوں میں جا چھپا۔ شہزاد اور زبیر بھی درختوں کی آڑ میں چھپے بیٹھے تھے۔ انہوں نے رائفلیں تان لیں۔ اور جیپوں کے نزدیک آنے کا انتظار کرنے لگے۔ دونوں جیپیں جیسے ہی نزدیک پہنچنے لگیں۔ شہزاد اور زبیر نے نشانہ لے کر فائر کھول دیا۔ دونوں جیپوں میں چوہدری سمیت دس افراد سوار تھے۔ پہلے حملے میں ہی چوہدری کے چھ افراد مارے گئے۔ دونوں جیپیں درختوں سے ٹکرا کر الٹ گئیں تو گاؤں والوں نے الٹی پڑی جیپوں پر حملہ کر دیا۔ "رک جاؤ۔" شہزاد چلایا۔ شہزاد کے پہنچتے پہنچتے گاؤں والے چوہدری کے بچ جانے والے ساتھیوں کو اور چوہدری کو مار مار کر اچھا خاصا زخمی کر چکے تھے۔

شہزاد نے چوہدری کے ہاتھوں میں رسی باندھی۔ گاؤں والوں کی مدد سے ایک جیپ کو سیدھا کیا اور رسی کا دوسرا سرا جیپ سے باندھ دیا۔

"شہزاد میری سب دولت لے لو پر مجھے معاف کر دو۔" چوہدری عابد گڑگڑایا۔

"تمہارے گناہ ناقابل معافی ہیں۔ کاش! موت سے بڑی کوئی سزا ہوتی۔" شہزاد نے کہا اور جیپ میں بیٹھ کر جیپ چلا دی۔ چوہدری عابد جیپ کے پیچھے گھسٹنے لگا، اس کی چیخیں نکل رہی تھیں وہ راستے میں آنے والے پتھروں اور خودرو جھاڑیوں سے ٹکراتا رہا اور چلاتا رہا۔ گاؤں والے جیپ کے پیچھے چلتے ہوئے بھاگتے ہوئے۔ چوہدری پر جوتے اور پتھر پھینک رہے تھے۔ یہ سفر حویلی تک جاری رہا۔ حویلی پہنچنے تک چوہدری عابد کی لاش چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گاؤں والوں نے حویلی کو آگ لگا دی۔

"دوستو! ظالم کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لئے ہمیں خود ہمت کرنی ہوگی، ظلم کو روکنے، برائی کو ختم کرنے کے لئے ہمیں اتفاق سے رہنا ہوگا۔ آؤ عہد کریں کہ آج کے بعد ہر ظلم، ہر برائی کے خلاف ہم خاموش رہنے کے بجائے ہم ظلم سے لڑیں گے....." وعدہ کرتے ہیں....." گاؤں کے سارے لوگ ایک آواز سے بولے تو شہزاد اور زبیر نے سجدہ شکر ادا کیا۔

www.pdfbooksfree.pk

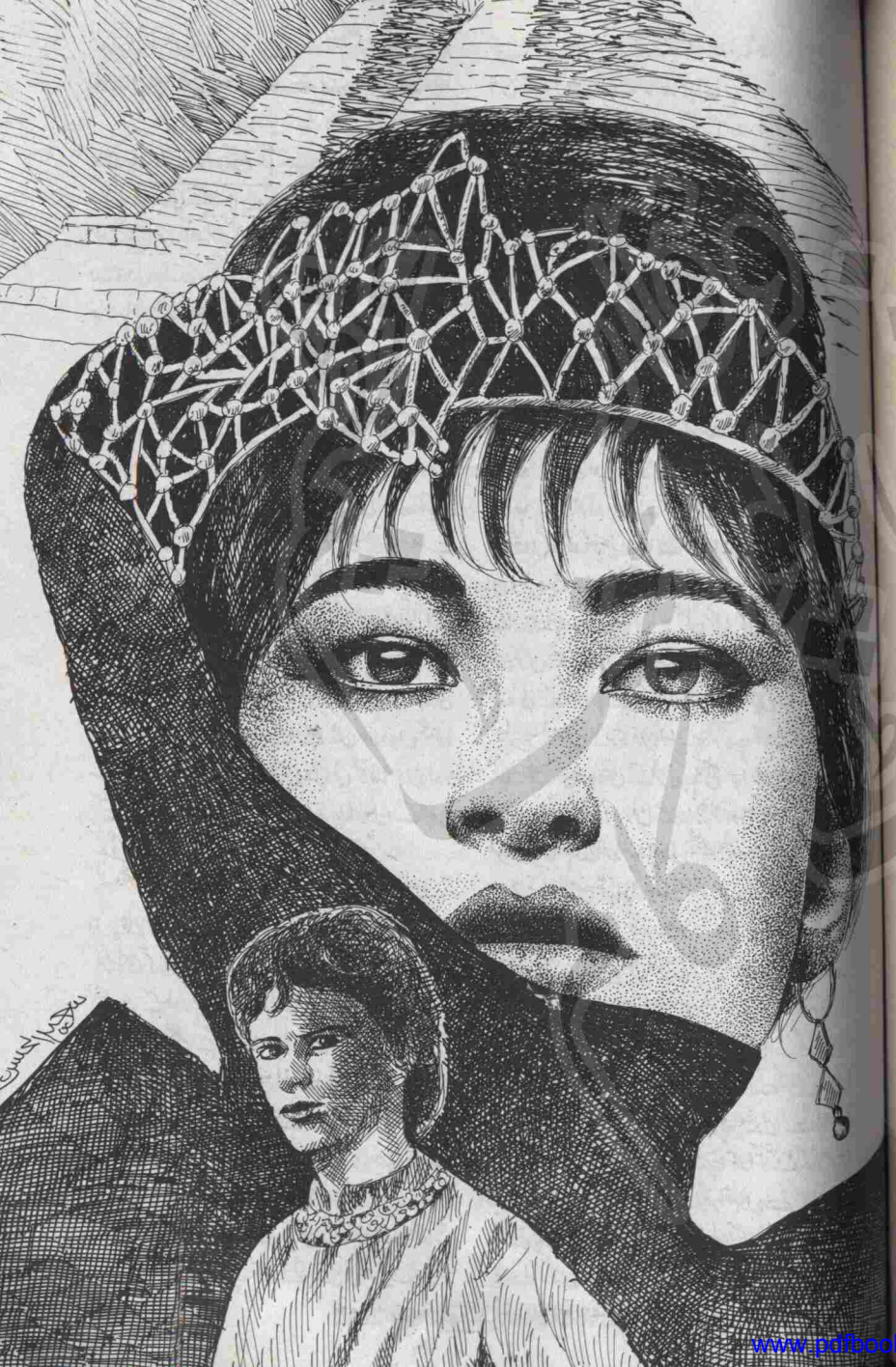

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر:2

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

لوگو! جب کسی کہانی کار کے دل میں اس قسم کا خوف ابھرنے لگتا ہے۔ تو سمجھ لینا چاہیے۔ کہ اب کچھ نہ کچھ ضرور ہو کر رہے گا۔ چنانچہ یہ ہی ہوا۔ میں شہزادے کی معیت میں عبرانیوں کی بستی کی طرف جانے کے لئے محل سے نکلا ہی تھا کہ فرعون مصر کے ایک خاص غلام نے آ کر پیغام دیا۔

"ولی عہد مصر کو خدائے مصر اپنے دربار میں طلب فرما رہے ہیں۔" کسی کی مجال نہیں تھی کہ فرعون مصر کے حکم کے آگے اپنی زبان ہلا سکے۔ مگر شہزادے پر تو کچھ اور ہی بھوت سوار تھا۔ منہ بنا کر بولا۔

"میری طرف سے دست بستہ ان کے حضور میں عرض کردو کہ اس وقت کی حاضری سے بالکل معذور ہوں۔"

"ایسا غضب نہ کیجئے حضور۔" میں نے شہزادے کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "فرعون مصر کے عتاب اور غصے کو دعوت نہ دیجئے عبرانیوں کی بستی میں ہم لوگ کچھ دیر سے بھی جا سکتے ہیں۔ لیکن عقل اور مصلحت کا تقاضہ ہے کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے دربار میں ضرور چلیں۔"

شہزادے کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ مگر شکر ہے اس نے میری بات مان لی۔ اور ہم دونوں غلام کے ساتھ ہی دربار کی طرف روانہ ہو گئے۔

دربار میں سب ہی اہم ہستیاں موجود تھیں۔ فرعون کے قدموں میں وزیر قابوس بیٹھا تھا۔ دائیں جانب شہزادی فرطانہ طلائی کرسی پر براجمان تھی۔ ولی عہد کی طلائی کرسی اس کی بغل میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد مختلف وزراء، امراء، کاہنوں، جادوگروں اور پجاریوں کی کرسیاں تھیں مجھے سب سے آخر میں دروازے کے پاس جگہ ملی۔

ولی عہد آداب بجالا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو فرعون یوں گویا ہوا۔

"عبرانی ہمارے لئے دردسر بنے ہوئے ہیں ہم نے سوچا تھا کہ قید و بند کی مصیبتیں جھیل کر وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس وہ روز بروز سرکش ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی باتوں میں کچھ ایسا سحر اور جادو ہے کہ اب تک سینکڑوں مصری اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر ان کے مذہب کو اپنا چکے ہیں۔ کسی پر بے جا ظلم کرنا ہماری عادت نہیں۔ ہم نے تمہیں اپنے دربار میں اسی لئے طلب کیا ہے کہ اگر

www.pdfbooksfree.pk

تمہاری نظر میں کوئی ایسا حل ہو۔ جو ہم لوگوں کو ان کے فتنے سے بچا سکے۔ تو اسے ہمارے گوش گزار کرو۔"

"میری نظر میں اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے عالی جاہ! جسے میں وقتاً فوقتاً آپ کی خدمت میں پیش کرتا رہا ہوں۔ اور آج بھی میرا خیال یہ ہی ہے کہ عبرانیوں کو آزاد کر دیا جائے۔ اور انہیں کھلی اجازت دے دی جائے۔ کہ دریائے نیل پار کر کے وہ جہاں جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔"

شہزادی فرطانہ جلدی سے بولی۔

"کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ عظیم طاقت والے خدائے مصر نے معمولی اور بے حیثیت عبرانیوں سے شکست تسلیم کر لی.....؟"

"شہزادی صاحبہ!" وزیر قابوس نے ایک بھاری آواز میں کہا۔ "بے شک اس کا یہ ہی مطلب ہوگا۔ میں آپ کی تائید کرتا ہوں۔"

"شہزادی فرطانہ کیا تمہارے ذہن میں۔ اس مشکل کا کوئی حل ہے.....؟" فرعون نے پوچھا۔

"سارے نوجوان عبرانی مرد اور عورت تہہ تیغ کر دیئے جائیں شہزادی کے لہجے میں جلادوں جیسی سفاکی تھی۔ "ان کے بوڑھوں، بچوں کو غلاموں اور کنیزوں کے طور پر مصر کے اعلیٰ عہدیداروں کے سپرد کر دیا جائے۔

"بہت مناسب اور بہت عاقلانہ فیصلہ ہے۔" وزیر قابوس نے اپنا سر ہلایا۔ "اس میں اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ ان کا سارا مال و متاع خزانہ شاہی میں مال غنیمت کے طور پر داخل کر لیا جائے۔"

"یہ ظلم ہے۔ سراسر ظلم ہے۔" شہزادے نے کہا۔ "فرعون کے عدل اور انصاف کو دیکھتے ہوئے۔ ان سے یہ توقع کرنا فضول ہے کہ وہ بغیر کسی قصور اور جرم کے عبرانیوں کو ایسی سزا دیں جو آج تک آسمان کے نیچے کسی قوم اور قبیلے کو نہیں دی گئی۔

"ہمیں ولی عہد کے خیال سے پورا پورا اتفاق ہے۔" فرعون نے اپنے جھوٹے عدل کی تعریف سن کر کہا۔ "بس ہم اس مسئلے کو یونہی چھوڑنا نہیں چاہتے۔ آج ہم اس عزم کے ساتھ یہاں رونق افروز ہوئے ہیں کہ کوئی نہ کوئی مناسب حل ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔"

ایک کاہن اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آداب بجا لا کر بولا۔ "چھوٹا منہ اور بڑی بات ضرور ہے۔ اگر خدائے مصر کی اجازت ہو تو میں بھی کچھ کہنے کی جسارت کروں۔"

"اجازت ہے۔"

"خدائے مصر کے سامنے اس وقت دو حل پیش کئے گئے ہیں ایک حل میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ عبرانیوں کو آزاد کر کے مصر سے باہر نکلنے کی اجازت دی جائے۔ اور دوسرے حل میں ارشاد کیا گیا ہے کہ عبرانیوں کا خدا، جیت جائے تو انہیں آزاد کر دیا جائے اور اگر دیوتا سیاسیہ فتح حاصل کرے تو شہزادی صاحبہ کے بتائے ہوئے حل پر عمل کیا جائے۔ دونوں صورتوں میں خدائے مصر بے جا رحم دلی، یا بے جا سنگدلی کے الزام سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔"

فرعون نے کاہن کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچ کر زمین بوس ہوا۔ فرعون نے قیمتی ہیروں سے جڑا ہوا اپنا ہار اس کی طرف انعام کے طور پر اچھال دیا۔

"ہمیں تمہارا فیصلہ منظور ہے۔" فرعون کی آواز گونجی۔

"یہ..... یہ کس طرح ممکن ہے۔" شہزادے نے بوکھلا کر کہا۔

"قبل از وقت کچھ نہ کہو۔" فرعون نے گرجدار آواز میں اسے ڈانٹا۔ ہم اپنی طرف سے تمہیں اس کام کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ کہ عبرانیوں سے جا کر کہہ دو کہ وہ پرسوں یعنی بدھ کو اپنے خدا کو لے کر دیوتا سیاسیہ کے مندر میں آ جائیں۔ اگر انہوں نے کسی مکر یا بہانے بازی سے کام لیا اور مقابلے کے لئے اپنے خدا کو لے کر نہیں آئے تو یہ سمجھ لیا جائے گا کہ ان کا خدا ہار

گیا ہے۔ اور ایسی صورت میں ہم عبرانیوں کے خلاف ہر اقدام کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔"

"مگر..... مگر....."

دربار برخواست.....!" فرعون اٹھ کھڑا ہوا۔

اور اس کے کھڑے ہوتے ہی سارے درباری اپنی نگاہیں جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ننگی تلواروں والے حبشی غلاموں کے جلو میں چھوٹے چھوٹے پروقار قدم اٹھاتا ہوا فرعون خوابگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہزادہ سبوعہ ابھی تک..... "مگر..... مگر" کی گردان کئے جا رہا تھا۔

"کیا انہوں نے ہمارے پروردگار کو اپنے دیوتا جیسا سمجھ رکھا ہے.....؟ کیا تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس قسم کا مقابلہ عمل میں نہیں آ سکتا.....؟ کیا ان لوگوں کی عقلیں بالکل ہی مسخ ہو گئی ہیں.....؟" نزائلہ کے چچا نے کہا۔

"مجھے فرعون کے پاس لے چلو۔ میں اسے بتاؤں گا کہ جب تک ہمارے پیغمبر واپس نہ آ جائیں ہم لوگ کسی قسم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر اس میں ہمت ہے تو ہمارے پیغمبر کی واپسی کے بعد جب چاہے اور جس قسم کا چاہے مقابلہ منعقد کرا سکتا ہے۔"

اس وقت ہم لوگ نزائلہ کے گھر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ شہزادے نے نزائلہ کے چچا تک پیغام پہنچا دیا تھا۔ اور نزائلہ کا چچا یہ حکم سننے کے بعد جذبات سے مغلوب ہو کر نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

ایک رات کی سہاگن نزائلہ خاموش بیٹھی ہوئی شہزادے کے چہرے کو کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ شہزادے کے چہرے پر خوف و ہراس عیاں تھا۔ تو میری حیثیت ایک تماشائی سے کم نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم جیسوں کی زندگی کہانیوں کی طرح رنگین بھی ہوتی ہیں۔ اور سنگین بھی۔

نزائلہ کا چچا خاموش ہوا تو شہزادہ بولا۔ "فرعون مصر نے صرف ایک دن کا وقفہ سوچنے سمجھنے کے لئے دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عبرانیوں نے مقابلے سے احتراز کیا تو سارے عبرانیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اور بوڑھوں، بچوں کو غلام بنا کر مصریوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔"

"اپنے ارمان نکالنے کے لئے اس نے جان بوجھ کر یہ ناٹک رچایا ہے۔ اس سے کہو کہ ایک دن کے وقفے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ کل ہی اپنے لاؤ لشکر کو لے کر آ جائے۔ اور ہم غریب نہتے عبرانیوں کو چن چن کر مار ڈالے۔" چچا نے جواب دیا۔ "یہ میرا فیصلہ نہیں ساری عبرانی قوم کا فیصلہ ہے۔ ہم سے یہ توقع رکھنا بے عقلی جہالت اور بیوقوفی ہے کہ ہم اس مقابلے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ بالکل فضول ہے۔ جاؤ اسے بتا دو کہ ہم سب مرنے کے لئے تیار ہیں یہ مقابلہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

"مقابلہ ہوگا۔ اور ضرور ہوگا۔" نزائلہ ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسا نورانی جلال تھا جس پر ساری دیویوں کو قربان کیا جا سکتا تھا۔

"ہم نے باطل کی ہر دعوت مبارزت پر لبیک کہا ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کفران خود چل کر ہمارے پاس آئے ہمیں مقابلے کے لئے للکارے اور ہم منہ چھپا لیں۔ مقابلہ کرنے کے بجائے چوہوں جیسی موت مرنا گوارہ کر لیں، نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہمیں دل و جان سے مقابلہ کرنے کی دعوت منظور ہے۔"

"نادان لڑکی! یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم انسانوں یا بتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کو لے کر سیاسیہ کے مندر میں پہنچ جائیں۔ اور وہاں دونوں کے دست بدست لڑائی کرائیں۔"

"نہیں۔ ہمیں انسانوں یا بتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کو سیاسیہ کے مندر میں لے جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہمارا عقیدہ ہے۔ وہ ہر جگہ ہے۔ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سن رہا ہے۔ جب وہ ہر جگہ ہے اور سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔ تو سیاسیہ کا مندر بھی اس

www.pdfbooksfree.pk

سے مستثنیٰ نہیں۔ میں خود سیاسیہ کے مندر جاؤں گی اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کروں گی اور ایک بار پھر وہ حق و باطل کے فرق کو واضح کردے۔

''تمہیں امید ہے کہ وہ تمہاری بات سن لے گا.....؟'' شہزادے نے پوچھا۔

''امید نہیں مجھے یقین کامل ہے۔'' وہ اسی عزم کے ساتھ بولی۔ ''وہ میری ہی نہیں ہر ایک کی سنتا ہے۔ ہر ایک کی مدد کرتا ہے۔ اگر وہ ایک لمحہ کے ہزارویں حصے کے لئے بھی اپنے بندوں کی نہ سنے تو ساری کائنات چور چور ہوکر ریت کے ذروں کی طرح بکھر جائے۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شہزادے کے پاس آئی۔ ''مجھے اپنے رب کی عبادت کے لئے تنہا چھوڑ دو۔ اگر میں مقابلے میں کامیاب ہوگئی تو سرخرو ہوکر اسی شام کو تم سے ملوں گی۔ اور اگر ناکام رہی تو جنت میں تمہارا انتظار کروں گی۔ میرے سرتاج اب تم جاؤ، فرعون اور اس کے حواریوں سے کہہ دو کہ مقابلے کا انتظار کریں۔''

''لوگو! میں نے بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔ بے شمار عجیب و غریب کردار اور واقعات تشکیل دیئے ہیں۔ بے شمار عقل سے ماورا باتوں کو اپنے قلم کی قوت سے درست بنا کر پیش کیا ہے۔ مگر زندگی کی یہ ماوراء العقل باتیں مجھ جیسے ذہین و فطین کہانی کار کے لئے بھی انوکھی تھیں۔ میں حیرت سے اس ناٹک کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا ہر نیا منظر چونکا دینے والا تھا۔ اور جس کے بارے میں یہ پیشن گوئی نہیں کی جاسکتی تھی کہ آگے چل کر کیا ہوگا.....؟

مقابلے کے دن تک انتظار، تکلیف، امید و بیم کی جو جان لیوا گھڑیاں میں گزاری ہیں۔ ان کا ذکر کرکے میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ دن سکھ کے ہوں۔ یا دکھ کے بہرصورت گزر ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ انتظار کا وقت ختم ہوا اور مقابلہ کا دن آپہنچا۔

سیاسیہ کے مندر میں پورا شہر امنڈ آیا تھا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ ناسازی طبع کے باعث فرعون مصر اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے نہ آسکا تھا۔ باقی سارے درباری مع شہزادی فرطانہ کے مندر میں موجود تھے۔ سیاسیہ دیوتا کا بت جو لمبائی میں پچاس گز اور چوڑائی میں دس گز تھا۔ مندر کے وسط میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی دائیں جانب ایک بڑے سے آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ مشہور تھا کہ یہ آگ ہزاروں سال سے روشن ہے۔ بائیں جانب قربان گاہ تھی۔ جہاں نوجوان لڑکیوں اور معصوم بچے سیاسیہ دیوتا کی خوشنودی کے لئے بھینٹ کئے جاتے تھے۔

نزائلہ کے ساتھ روشنی اور نور میں ڈھلا ہوا انسانی مجسمہ آگے بڑھا۔ مندر کے بڑے پجاری کے سامنے جاکر اس نے اپنا ادنیٰ لبادہ اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔

اگرچہ اس واقعہ کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن میں آج بھی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں اتنی حسین، دلکش اور اتنی نورانی لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جتنی اس وقت نزائلہ نظر آرہی تھی۔

''وہ متعدد عام مصری تو اسے دیکھتے ہی سجدے میں گر گئے۔'' ''عبرانیوں کا خدا..... عبرانیوں کا خدا۔''

نزائلہ نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ ''میں خدا نہیں۔ اس کی ایک ناچیز اور حقیر مخلوق ہوں۔''

پجاری نے کڑک دار آواز میں دریافت کیا۔ ''لڑکی! کیا تم یہاں تن تنہا آئی ہو.....؟''

''نہیں..... نزائلہ بولی۔ ''میں یہاں اپنے شوہر اپنے چچا اور اپنے قریبی عزیزوں کے ساتھ آئی ہوں۔''

''میرا مطلب یہ نہیں۔'' پجاری نے کہا۔ ''میں تو صرف یہ دریافت کررہا ہوں۔ کہ تم اپنے خدا کو لے کر آئی ہو یا نہیں.....؟''

''جو پہلے ہی ہر جگہ موجود ہو۔ اسے کہیں لانے اور لے جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہارا خدا یہاں موجود ہے۔''

''ہاں میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔''

''اگر موجود ہے تو نظر کیوں نہیں آتا.....؟''

''آنکھوں پر گناہ، تعصب اور جہالت کے پردے پڑے ہوں تو وہ نظر نہیں آتا۔''

''کیا تمہارا دیوتا ہمارے سیاسیہ دیوتا سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے.....؟''

''تمہارا سیاسیہ دیوتا میرے خدا کے سامنے مکھی کے پر سے بھی حقیر اور ذلیل ہے۔''

''کفر کے کلمات مت بک لڑکی ورنہ سیاسیہ دیوتا کے عتاب کا نشانہ بن جائے گی۔''

نزائلہ نے دیوتا کے پر ہیبت مجسمے پر سر سے پاؤں تک ایک گہری نگاہ ڈالی اور کہا۔ ''جو دیوتا اپنے جسم پر بیٹھے ہوئے ایک مچھر کو نہ ہٹا سکے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''لڑکی..... ی..... ی.....'' پجاری بہت زور سے گرجا۔ مجمع میں موجود تقریباً ہر شخص لرز گیا۔ لیکن نزائلہ ویسے ہی اطمینان کے ساتھ کھڑی رہی۔

''اگر تمہارا دیوتا ایسی ہی طاقت والا ہے۔ تو مجھے اپنے غصہ کا نشانہ کیوں نہیں بناتا۔ اس سے کہو کہ یہ لڑکی گستاخ، اور بے ادب، اور منکر ہے۔ اس میں اگر کچھ حمیت اور غیرت، دم خم ہے تو وہ مجھے نیست و نابود کردے۔''

پجاری بوکھلا کر بولا۔

''سیاسیہ دیوتا! قہر ہی کا دیوتا نہیں۔ بلکہ کبھی کبھی رحم و کرم بھی فرماتا ہے۔ ہوسکتا ہے۔ اسے تمہاری خوبصورتی اور جوانی پر رحم آ گیا ہو۔''

نزائلہ ہنس پڑی۔

اس کے سفید دانت یوں چمکے گویا بجلیاں کوند گئی ہوں۔ ''تمہارا دیوتا بھی خوب ہے۔ جو طالب رحم نہیں اور بار بار اس کے غصے اور عتاب کو دعوت دے رہی ہے۔ اس کی خوبصورتی اور جوانی پر رحم فرما رہا ہے۔

''دیوتا کی باتیں دیوتا ہی جانے۔'' پجاری کی پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے دیوتا کی عاجزی اور بیچارگی کو تسلیم کرتے ہو۔''

شہزادی فرطانہ نے پجاری کو لاجواب ہوتے ہوئے دیکھا۔ تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بلند آواز میں بولی۔ ''ہمارے دیوتا عاجز نہیں قادر ہیں۔ انہوں نے صرف اس لئے تمہیں کوئی سزا نہیں دی کہ ابھی انہیں تمہارے خدا کا مقابلہ کرنا ہے۔ تم اپنی نسوانی عشوہ طرازیوں سے پجاری کو متاثر کرسکتی ہو۔ لیکن ہمارے دیوتا کو نہیں۔ اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ فضول قسم کی باتیں بنانا چھوڑو..... اور اپنے خدا سے کہو کہ وہ سیاسیہ دیوتا سے مقابلہ کرے۔''

''میرا خدا یہاں موجود ہے۔ اور یہ سب دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے۔'' نزائلہ نے کہا۔ ''لیکن میں چاہتی ہوں کہ پہلے وہ فیصلہ سن لوں جو عبرانیوں کے بارے میں تمہارے خدائے مصر نے کیا ہے۔''

''ان کا فرمان ہے کہ اگر عبرانیوں کا خدا ہار گیا تو سارے نوجوان عبرانی مردوں اور عورتوں کو قتل کردیا جائے گا۔ اور ضعیفوں، بچوں کو غلام بنا لیا جائے گا۔ تمہیں منظور ہے یہ فیصلہ.....؟''

''جو فیصلہ زبردستی سر پر تھوپا جائے۔ اس میں کسی کے منظور یا نامنظور کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال مجھے اس فیصلہ کی دوسری شق سے بھی آگاہ کیا جائے۔''

''خدائے مصر کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر سیاسیہ دیوتا کو شکست ہوئی تو سارے عبرانیوں کو مصر چھوڑنے کی اجازت دے دی جائے گی۔''

''تمہیں منظور ہے یہ فیصلہ.....؟'' نزائلہ نے ایسی آواز میں کہا کہ سب کے دل دہل گئے۔

www.pdfbooksfree.pk

''روئے زمین پر کسی میں اتنی جسارت نہیں کہ وہ خدائے مصر کے فیصلے کے خلاف زبان دراز کرے۔'' شہزادی فرطانہ نے جواب دیا۔

''اے مصریو! گواہ رہنا۔'' نزائلہ نے کہا۔ پھر وہ سیاسیہ دیوتا کے بت کی طرف پشت کر کے کھڑی ہوگئی۔ اس نے دعا کے لئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ اس وقت اس کے چہرے پر نور کا ہالہ صاف نظر آ رہا تھا۔

''اے خدائے قدوس، اے پاک بے نیاز..... اپنی ناچیز بندی پر رحم فرما۔ متکبروں کے غرور کو توڑ دے، ایک بار پھر حق و باطل کا معرکہ ہو رہا ہے۔ ان ظالموں کو بتا دے کہ باطل پر حق ہمیشہ غالب رہا ہے اور ہمیشہ غالب رہے گا۔''

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور آتش دان کی صدیوں سے جلتی ہوئی آگ اچانک اس طرح بجھ گئی گویا کبھی جلی ہی نہیں تھی۔ خوف و دہشت سے لوگ چلائے۔

''یہ کافی نہیں ہے۔ میرے خدا! تو کافروں کی فطرت کو جانتا ہے بعد میں یہ لوگ یہی کہیں گے۔ کہ آگ بجھنا اتفاقی حادثہ تھا۔ انہیں کوئی ایسی نشانی دکھا کہ اپنے بت کی بیچارگی ان پر عیاں ہو جائے۔ اور یہ لوگ تیرے وجود کو تسلیم کر لیں۔''

پھر ہوا کا دوسرا جھونکا آیا اور سیاسیہ دیوتا کا سر گردن سے اکھڑ کر پکے فرش پر اس زور سے گرا کہ چکنا چور ہو گیا۔ تیسرے جھونکے میں پورا بت زمین پر آ گرا اور چاروں طرف اس کے ٹکڑے پھیل گئے۔ لوگ ڈر اور خوف و حیرت سے چلانے لگے۔

شہزادی فرطانہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ خدائے مصر کا فرمان تھا کہ عبرانیوں کے خدا اور سیاسیہ دیوتا کا مقابلہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس فرمان پر عمل کرنے کے بجائے عبرانیوں نے اپنے ہاں کی ایک جادوگرنی کو یہاں بھیج دیا۔ پوری قوم جانتی ہے کہ عبرانی بہت بڑے جادوگر ہیں۔ تاہم آج کے واقعہ سے یہ ضرور ثابت ہو گیا ہے کہ عبرانی اپنے خدا کو ہمارے دیوتاؤں کے مقابلے میں لانے سے بالکل قاصر ہیں۔''

''حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ شہزادی۔'' نزائلہ نے کہا۔ ''فرعون کے فیصلے کے مطابق تمہیں اجازت دینی ہوگی کہ عبرانی مصر کے باہر چلے جائیں۔''

خدائے مصر کے ہوتے ہوئے کسی کو عبرانیوں کو روکنے یا اجازت دینے کا اختیار نہیں میں آج کا سارا واقعہ جس میں سارا دخل تمہارے جادو کا ہے۔ خدائے مصر کے کانوں تک پہنچا دوں گی۔ اور پھر وہاں سے جو فیصلہ ہوگا۔ اس سے تمہیں جلد ہی آگاہی ہو جائے گی۔''

اور یوں یہ معرکہ حق و باطل، حق کی فتح پر ختم ہو کر، حق کے خلاف ایک نئے عزم کو جنم دینے کا باعث بن گیا۔

☆.....☆.....☆

شام کو فرعون کا قاصد شہزادے کو بلانے کا پیغام لے کر پھر آ موجود ہوا۔

ہم لوگ دربار پہنچے تو وہاں کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ ہر شخص خاموش، متفکر اور سہما ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ شاہی آداب بجا لا کر جونہی شہزادہ اپنی کرسی کی طرف بڑھا۔ فرعون نے گرج کر کہا۔

''ٹھہرو.....''

''شہزادہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

''ولی عہد کی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے تمہیں ہمارے چند سوالوں کا جواب دے کر اپنے آپ کو اس کرسی کا مستحق کرنا پڑے گا۔'' فرعون نے کہا۔ ''آج صبح سیاسیہ دیوتا کے مندر میں جو کچھ ہوا۔ اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے.....؟''

''میں سمجھتا ہوں عبرانی جیت گئے۔''

''نالائق! تجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ کیا تو نے اپنی آنکھوں سے عبرانیوں کے خدا سیاسیہ دیوتا کو دو بدو لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ عبرانی جادو اور نظر بندی کے فن میں ماہر ہیں۔''

''اگر آپ کی یہ دلیل تسلیم بھی کر لی جائے۔ تب بھی دیوتا کی بے بسی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سوچنے کی بات ہے۔ عالی جاہ! عبرانیوں کے خدا سے مقابلہ کرنے والا دیوتا ایک لڑکی کے جادو سے مار کھا گیا۔ تو اس سے زیادہ بے بس اور لاچار اور کون ہو سکتا ہے.....؟''

''اس کا مطلب ہے کہ ہماری پیاری بیٹی! فرطانہ نے تمہارے تبدیلی مذہب کی جو اطلاع ہمیں پہنچائی تھی۔ وہ درست تھی۔'' فرعون نے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ تم خود اپنے منہ سے اس بات کا اقرار کرو کہ عبرانیوں کا جادو تمہیں بھی شکار کر چکا ہے۔''

شہزادے نے ادب کے ساتھ سر جھکا کر کہا۔ ''جادو والی بات کی تردید کرتے ہوئے میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے کافی غور و خوض کے بعد اچھی طرح سوچ سمجھ کر حضرت موسیٰ کا دین اختیار کر لیا ہے۔''

''کیا یہ بھی اقرار کرتے ہو کہ سیاسیہ دیوتا کے مندر میں آنے والی جادوگرنی سے تم شادی کر چکے ہو.....؟''

''جادوگرنی کے لفظ کی تردید کرتا ہوا عالی جاہ میں اس بات کا بھی اقرار کرتا ہوں۔''

''اور کیا تم یہ بھی اقرار کرتے ہو کہ تمہیں اپنی سگی بہن شہزادی فرطانہ کو اپنی بیوی بنانے پر اعتراض ہے۔''

''جی ہاں..... عالی جاہ..... میں یہ بھی اقرار کرتا ہوں۔''

''پھر تم ولی عہد کی کرسی پر ہرگز نہیں بیٹھ سکتے۔'' فرعون نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تاہم تمہیں تائب ہونے کے لئے تین ماہ کی مہلت دی جاتی ہے اگر اس عرصے میں تم نے رجوع کر لیا تو کرسی بحال کر دی جائے گی۔ ورنہ یہاں ہمارا دوسرا شہزادہ جس کی عمر اس وقت سات سال کی ہے اور جو شہزادی فرطانہ کا ماں جایا بھی ہے بیٹھے گا اور ہمیں امید ہے کہ ہماری چہیتی بیٹی ہنسی خوشی اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جائے گی۔''

''تخت و تاج کا حقیقی وارث پیدا کرنے کے لئے میں خدائے مصر کے ہر حکم کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرتی ہوں۔'' شہزادی نے جلدی سے اٹھ کر کہا۔ شاید اسے خوف تھا کہ فرعون اپنی کسی دوسری بیوی کی اولاد کے حق میں کوئی جملہ نہ کہہ دے۔

''سبوعہ۔'' فرعون نے حکم دیا۔ ''تمہارے سارے شاہی خطابات اور تمہاری ساری شاہی مراعات تین مہینے کے لئے ختم کی جاتی ہیں۔ تین مہینے کے اندر، اگر تم نے پشیمانی کا اظہار کر کے ہم سے معافی نہیں مانگی تو خود بخود ہمارے اس فیصلے کی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توثیق ہو جائے گی.....''

''آپ کا حکم مجھے دل و جان سے منظور ہے۔ عالی جاہ!''

''اب تم اپنے موجودہ محل میں بھی نہیں رہ سکو گے البتہ چاہو تو صحرائے سینا کے اس محل میں قیام کر سکتے ہو۔ جو ہم نے موسم سرما کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ لیکن وہاں بھی تمہارے قیام کی مدت تین ماہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اور تم اپنے ساتھ کوئی ایسا ملازم نہ رکھ سکو گے جسے شاہی خزانے سے تنخواہ ملتی ہے۔ اور محض تین ماہ تک ضروری اخراجات کے لئے تمہیں سونے کے پچاس سکے بھی ملتے رہیں گے۔''

شہزادے نے کسی قسم کا تبصرہ کئے بغیر عرض کیا۔ ''جناب والا سے میں یہ پوچھنے کی جرات کر سکتا ہوں۔ کہ آج کے واقعہ کے بعد عبرانیوں کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا.....؟''

''ان کے ستارے اچھے ہیں۔ ہم نے ان پر فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ لیکن ہم انہیں آزاد ہونے اور مصر چھوڑنے کی اجازت بھی نہیں دیں گے۔ انہیں یہیں رہنا پڑے گا۔ تاوقتیکہ وہ اپنی حرکتوں سے

www.pdfbooksfree.pk

باز آ جائیں اور ایک نظر نہ آنے والے خدا کو چھوڑ کر ہمیں اپنا خدا تسلیم نہ کرلیں۔ اور اب دربار برخواست.....!''

شہزادہ نزائلہ کے ساتھ محل میں منتقل ہوگیا اس کا کہنا تھا۔ کہ اگر میں چاہوں تو اپنے گھر واپس جاسکتا ہوں کیونکہ اب وہ اس قابل نہیں ہے کہ تنخواہ کے طور پر مجھے ماہ بہ ماہ سونے کے تیس تیس سکے ادا کرتا رہے۔ شہزادے کی ملازمت کا زمانہ میں چونکہ میرے لباس اور طعام کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ اس لئے اس کے ہاں سے ملنے والی تنخواہ میرے پاس جوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔ ایک بار میں نے اس میں سے کچھ رقم اپنے والد کو بھیجی تھی۔ جوان کی تجہیز و تکفین پر کام آئی۔ اپنی بہن کو بھی کچھ رقم پابندی سے بھیجنا چاہتا تھا۔ لیکن وطن سے آنے والوں نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کسی دوسرے علاقہ میں منتقل ہوگئی ہے۔ اور اس کا موجودہ پتہ کسی کو نہیں معلوم چنانچہ جب شہزادے نے مجبوری کا اظہار کیا تو میں نے ایک بڑے قبیلے میں سونے کے سارے سکے بھر کر اسے پیش کردیئے۔ پہلے تو وہ انہیں لینے سے انکار کرتا رہا۔ لیکن جب میں نے بہت زیادہ مجبور کیا اسے یاد دلایا کہ وہ مجھے اپنا دوست کہہ چکا ہے۔ تو بادل نخواستہ اس نے اس شرط پر وہ سکے قبول کرلئے۔ کہ یہ رقم اس کے ذمہ قرض رہے گی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ لیکن اسی وقت دل ہی دل میں سارا قرض معاف کردیا۔ کیونکہ دین موسوی کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک روز اسے موجودہ محل سے بھی نکلنا پڑے گا۔

انہی دنوں ہمیں معلوم ہوا کہ عبرانیوں کے پیغمبر واپس آگئے ہیں۔

پھر ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ وہ فرعون کے دربار میں گئے تھے۔ اور وہاں انہوں نے فرعون کو تنبیہ کی ہے کہ اگر اس نے ایک ہفتہ کے اندر عبرانیوں کو مصر چھوڑنے کی اجازت نہیں دی تو پورے ملک کا پانی خون میں تبدیل ہو جائے گا۔

ایک ہفتہ گزرتے ہی نیل کا پانی گاڑھے گاڑھے خون میں تبدیل ہوگیا۔ پھر ایسا ہوا کہ کنوؤں اور تالابوں اور جوہڑوں سے پانی کے بجائے خون نکلنا شروع ہوگیا۔ نہ پینے کے لئے پانی تھا۔ نہ کھانا پکانے کے لئے، پورا مصر ایک ہی دن میں چیخ اٹھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ جن مصریوں نے دین موسیٰ کو اختیار کرلیا تھا۔ انہیں پانی کے بارے میں کوئی شکایت نہ ہوئی۔ خود ہمارے محل میں صاف ستھرا پانی آرہا تھا۔ دور دور سے لوگ ہمارے ہاں۔ پانی پینے آتے البتہ اگر ان میں سے کوئی شخص ہمارے ہاں کا پانی باہر لے جانے کی کوشش کرتا تو محل سے باہر نکلتے ہی سارا کا سارا پانی خون میں تبدیل ہو جاتا۔

دوسرے دن پورے ملک میں خون کی بدبو اور سڑاند پھیل گئی۔ ہر شخص بوکھلایا ہوا تھا۔ خود فرعون کے ہاں۔ دو دن سے نہ کسی نے پانی پیا تھا اور نہ کھانا کھایا تھا۔

تیسرے دن جانور مرنے لگے اور دریائے نیل نے مردہ مچھلیوں اور مگرمچھوں اور دوسرے دریائی جانوروں کو ساحل پر اگلنا شروع کردیا اور بھوکے پیاسے باشندوں کا جم غفیر فرعون کے محل کے سامنے کھڑا ہو کر مطالبہ کرنے لگا، کہ عبرانیوں کے پیغمبر کی بات مان لی جائے۔ اور عبرانیوں کو مصر سے باہر نکلنے کی اجازت دی۔ اس وقت کئی وقتوں کے بھوکے پیاسے فرعون کی سمجھ میں آیا کہ حضرت موسیٰ کی بات نہ مان کر اس نے کتنی فاش غلطی کی ہے۔ فوری طور پر اس نے تیز رفتار گھڑسواروں کو شاہی فرمان کے ساتھ عبرانیوں کی بستی کی طرف روانہ کیا۔ فرمان میں تحریر کیا گیا تھا۔ کہ فرعون مصر کو عبرانیوں کے پیغمبر کی بات منظور ہے۔ عبرانیوں کی پوری قوم کو آزاد کیا جاتا ہے۔ اب وہ لوگ جہاں چاہیں اور جب چاہیں مصر چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔

ہم لوگوں کو فرعون کے اس فرمان کا تقریباً نصف شب کو اس وقت پتا چلا کہ جب نزائلہ کے چچا

نے محل میں آ کر نزائلہ سے کہا کہ وہ مصر چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ کیونکہ فرعون کی طرف سے عبرانیوں کو ملک سے جانے کی عام، اجازت مل چکی ہے۔

شہزادہ سبوعہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ نزائلہ اگر اسے چھوڑ کر جانا چاہے تو بے شک جاسکتی ہے۔

''نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' نزائلہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''میرا مرنا۔ میرا جینا تمہارے ساتھ ہے۔ میں اپنی ساری زندگی تمہارے قدموں میں گزار دوں گی۔''

نزائلہ کے چچا نے کہا۔ ''میں بڑی آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ تمہیں لینے آیا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ نہیں گئیں تو قیامت کے دن تمہارے باپ کے سامنے کس طرح سرخرو ہوسکوں گا۔ کس طرح اس سے کہہ سکوں گا کہ میں نے اپنی بھتیجی کی حفاظت جی جان سے کی ہے۔''

''مجھ پر رحم کرو چچا! خدا کے واسطے مجھے اپنے ساتھ نہ لے چلو۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں تمہیں دشمن مصریوں کے رحم وکرم پر کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اور اکیلا ہجرت کیسے کرسکتا ہوں.....؟''

پھر اچانک میری سمجھ میں ایک بات آئی۔ میں نزائلہ کے چچا کو ایک طرف لے گیا۔ اور اس سے کہا۔ ''میں کہانی کار ہوں۔ لوگوں کے دلوں کو پڑھنا میرا کام ہے۔ مجھ سے فضول باتیں نہ بنانا۔ اور جو کچھ میں کہوں اس کا صحیح صحیح جواب دینا۔ ورنہ یہ یاد رکھو کہ ہاتھ میں رقم رکھنے والے تلوار سنبھال لیں تو اس وقت تک میان میں نہیں ڈالتے۔ جب تک اس کی پیاس نہ بجھ جائے۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟''

وہ مسکرایا۔ ''اناطوق! تم واقعی لوگوں کے دلوں کو پڑھنے کا فن جانتے ہو۔ یوں سمجھ لو کہ اب میں مصر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جارہا ہوں۔ یہ آخری موقع ہے۔ جب شہزادے سے کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس سے کہو کہ وہ اپنی ساری نقدی اور محل کا سارا سامان میرے حوالے کردے۔ اور نزائلہ کو اپنے پاس روک لے۔''

''تم اتنا سامان کس طرح لے جاؤ گے.....؟''

''دو اونٹ گاڑیاں پہلے ہی اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ جو سامنے کے میدان میں کھڑی ہوئی میرے اشارے کی منتظر ہیں۔''

اور اس طرح شہزادے کا سارا سامان اور ساری نقدی اور سارے ہیرے جواہرات لے کر اور پورے محل میں جھاڑو لگا کر نزائلہ کا چچا دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوگیا۔

خبریں آنا شروع ہوئیں۔ عبرانی زور وشور سے واپسی کی تیاریاں کررہے ہیں۔ بیگار پر گئے ہوئے عبرانی اپنی بستی میں واپس آرہے ہیں۔ اور آخر میں یہ خبر موصول ہوئی کہ عبرانیوں کا قافلہ اپنے پیغمبر کی سربراہی میں کل صبح سویرے کوچ کرنے والا ہے۔

اسی شام کو شہزادی فرطانہ ہمارے اجڑے ہوئے محل میں کئی محافظوں اور کنیزوں کے ساتھ شہزادے سے ملنے کے لئے آئی۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

''وقت نے ثابت کردیا ہے کہ تم نے خدائے مصر کو جو مشورہ دیا تھا۔ وہ بالکل حق بجانب تھا۔ آخر میں خدائے مصر کو تمہاری بات مان کر عبرانیوں کو ملک چھوڑ کر جانے کی اجازت دینی پڑی۔ لیکن..... لیکن..... وہ دوبارہ مردود قابوس، کاہنوں اور جادوگروں کے بھڑکانے میں آگئے ہیں۔ انہوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے عبرانیوں کے پیغمبر سے کہلوایا ہے۔ کہ اگر ایک عبرانی نے بھی مصر چھوڑنے کی کوشش کی تو مزاحمت کی جائے گی۔''

www.pdfbooksfree.pk

”تمہارے خدائے مصر کے خدائی فیصلے بچوں کی حرکتوں سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔“ شہزادے نے کہا۔

”میری ناچیز رائے میں جب تک تمہارے خدائے مصر پورے مصر کو اللہ کے قہر و غضب کا شکار بنا کر تباہ و برباد نہیں کرادیں گے، نہ خود چین سے بیٹھیں گے اور نہ کسی دوسرے کو اطمینان کا سانس لینے دیں گے۔“

”یہی بات تو میں تم سے کہنے آئی ہوں۔“ شہزادی نے کہا۔

”تم انہیں منع کرو۔ انہیں مشورہ دو کہ اب عبرانیوں سے ٹکرانے کی کوشش نہ کریں ورنہ پورا مصر تباہ ہوجائے گا۔ عبرانیوں کا خدا پورے ملک کو ایک بڑا کھنڈر بنادے گا۔“

”مجھے امید نہیں کہ وہ میری مان لیں گے۔“

”تم کہہ کر تو دیکھو میں تمہاری تائید کروں گی۔ جب ہم دونوں ایک زبان ہوکر انہیں کوئی رائے دیں گے تو دربار کے کسی دوسرے شخص کو تردید کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ اور خدائے مصر کو ہماری بات تسلیم کرنا پڑے گی۔“

”تم کہتی ہو تو میں ایک بار پھر پتھر، میں جونک مار لگانے کی کوشش کروں گا۔“ شہزادے نے کہا۔ ”اب تم جاؤ۔ کل صبح میں دربار میں حاضر ہوجاؤں گا۔“

نزائلہ کو معلوم ہوا کہ شہزادہ صبح کو محل میں جانے کا وعدہ کر چکا ہے، تو وہ اس کے سینے سے لپٹ کر خوب روئی۔ ”تم کہیں نہ جاؤ شہزادے، مجھے بہت خوف محسوس ہو رہا ہے۔“

رات گئے تک شہزادہ اسے سمجھاتا رہا۔

صبح کو جب ہم دونوں دربار کی طرف روانہ ہوئے تو رات بھر کی جاگی ہوئی نزائلہ گہری نیند سو رہی تھی۔ محل میں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ عبرانیوں کے پیغمبر نے سختی کے ساتھ فرعون کے حکم کو رد کرکے اپنی قوم کو کوچ کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ اور فرعون مصر اپنا سارا لاؤ لشکر لے کر عبرانیوں کی گوشمالی کے لئے روانہ ہوگیا ہے۔ شہزادی فرطانہ یہ سن کر ننگے پاؤں محل سے باہر نکل آئی۔ ”ابھی خدائے مصر زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ تم انہیں راستے ہی میں روک لو۔ پورے مصر کی نگاہیں اس وقت تم پر لگی ہوئی ہیں۔“

ہم دونوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی۔ اور دوپہر ڈھلے فرعون کو جالیا۔ اس وقت فرعون اور اس کا لشکر جرار ایک ایسے اونچے مقام پر تھا۔ جہاں تقریباً ڈھائی تین میل کے فاصلے پر عبرانیوں کا قافلہ دریائے نیل کے نشیبی ساحل کی طرف رواں دواں نظر آرہا تھا۔

”بے مذہب...... بے دین...... بے ادب......“ فرعون نے شہزادے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں بھی آموجود ہوئے ہماری بیٹی فرطانہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ تم عبرانیوں پر ہونے والے حملے کی خبر کی تاب نہ لاسکو گے۔ اور ہمیں روکنے کے لئے دوڑ پڑو گے۔“

”یہ...... یہ...... بات آپ سے فرطانہ نے کہی تھی......؟“

”بے شک......“ فرعون نے جواب دیا۔ ”ہم شروع ہی سے اس کی عقل مندی کے قائل رہے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ہمارے تاج و تخت کی وارث ہے جس وقت عبرانیوں کے پیغمبر نے اپنے جادو کے زور سے پورے مصر کے پانی کو خون میں تبدیل کردیا تھا۔ اس وقت ہماری بیٹی شہزادی فرطانہ نے مشورہ دیا تھا کہ جادو کا زور توڑنے کے لئے عبرانیوں کو مصر چھوڑنے کی اجازت دے دیں اور جب عبرانی ایک قافلے کی صورت میں یکجا ہوکر روانہ ہوجائیں تو ہم ان پر ٹوٹ پڑیں۔

اور ان کے بڑوں اور چھوٹوں سب کو چن چن کر ختم کردیں۔ تاکہ مصر ہمیشہ کے لئے پاک و صاف ہوجائے اور ہماری بیٹی شہزادی فرطانہ نے یہ بات بھی ہمیں پہلے سے بتادی تھی کہ تم ہمیں منع کرنے کے لئے ضرور آؤ گے۔“

شہزادے کو اب محسوس ہوا کہ اس نے فرطانہ کی بات مان کر کتنی زبردست غلطی کی ہے۔

”دیکھو نیل کے ساحل پر عبرانیوں کا پورا قافلہ جمع ہوچکا ہے۔ ہمارے حکم سے سارے ملاحوں کو ایک دن پہلے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اب ایک عبرانی بھی دریا پار نہیں کرسکتا۔ ان کے سامنے بپھرا ہوا دریا اور پیچھے ہماری خونخوار فوج۔ آج ان کا خدا بھی چاہے تو انہیں نہیں بچاسکتا۔“

عبرانیوں اور مصریوں کا درمیانی فاصلہ طویل تھا۔ لیکن خوشگوار موسم اور بلند جگہ پر ہونے کے باعث ان کی حرکات و سکنات ہماری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ عبرانیوں کے لئے اب نجانے رفتن رہی تھی۔ اور نہ پائے ماندن۔“

اچانک ہم نے دیکھا کہ دریا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ اس کی دونوں اطراف کا پانی اونچی اونچی دیواروں کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ اور دریا کے درمیان ایک خوب صورت چوڑی سی سڑک بن گئی ہے۔ اور عبرانی کسی قسم کا خوف اور خطرہ محسوس کئے بغیر اس سڑک سے گزرنا شروع ہوگئے ہیں۔

”جوانو! دلیرو......“ فرعون پوری قوت سے چلایا۔ ”دیکھتے کیا ہو۔ بھوکے شیروں کی طرح ایک ایک عبرانی کو چٹ کرجاؤ۔“

پھر وہ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کے پیچھے ننگی تلواریں لہراتا ہوا اس کا لشکر تھا۔ ہم دونوں وہیں کھڑے ہوئے اس منظر کو دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ عبرانیوں کا پورا قافلہ دریا کے درمیان میں بنی ہوئی سڑک کو پار کرگیا۔ عین اسی وقت فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت دریا کے کنارے پہنچ گیا۔

دو تین لمحوں کے لئے وہ ٹھٹھکا۔ پھر اپنی تلوار کو بلند کرکے اس نے لشکر کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دریا کے درمیان میں بنی ہوئی سڑک پر گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا تاکہ عبرانیوں کو بروقت ختم کیا جاسکے۔

اور جب اس کا پورا لشکر اس سڑک پر آگیا تو اچانک پانی کی بنی ہوئی دونوں دیواریں گر پڑیں۔ میری گنہگار آنکھوں نے فرعون کو تمام لشکر سمیت دریا میں اس طرح غائب ہوتے دیکھا۔ گویا وہ سب نمک کی مورتیاں تھیں جو پانی میں جاتے ہی تحلیل ہوگئیں۔

دریائے نیل ایک بار پھر اپنی سابقہ آب و تاب کے ساتھ بہنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”اناطوق!“ شہزادے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم نے دیکھا کہ فرطانہ کی عیاری نے بالآخر فرعون مصر کو ڈبو ہی دیا۔

میں نے کہا۔ ”آپ نے فرطانہ کا نام لیا ہے تو حضور میرے دل میں ایکا ایکی یہ بات آئی ہے۔ کہ جب اس نے فرعون کو عبرانیوں کا پیچھا کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ تو وہ آپ کے پاس یہ کہنے کیوں آئی کہ آپ فرعون کو روکنے کی کوشش کریں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ آپ کو دھوکہ دے کر آپ کی غیر موجودگی سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہتی ہو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو اناطوق۔“ شہزادے نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔ ”نزائلہ کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔“

ہم دونوں ہانپتے کانپتے اپنے رہائشی محل پہنچے تو وہی دیکھا جس کا پہلے سے ڈر تھا۔ خوابگاہ میں زخمی نزائلہ پڑی ہوئی کراہ رہی تھی۔ اس کے جسم پر خنجر کے کم و بیش پندرہ سولہ گہرے زخم تھے۔ شہزادہ دوڑ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اس کے سر کو اپنے زانوں پر رکھ لیا۔

”تم آگئے۔ شہزادے......؟“ نزائلہ نے آنکھیں کھول کر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن بہت دیر میں آئے۔ بہت دیر لگادی تم

www.pdfbooksfree.pk

نے۔ تمہارے جاتے ہی کئی حبشی محل میں گھس آئے۔ انہوں نے میرے جسم پر خنجر مارے اور جب میں گر گئی تو میں نے ایک عورت کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''بس کرو...... کمبخت ختم ہو چکی ہے۔ اب جلدی جلدی گھر کی ساری چیزیں ادھر ادھر بکھیرو۔ تاکہ جب شہزادہ سبوعہ واپس آئے تو وہ یہ سمجھے کہ ڈاکوؤں نے اس کی بیوی کو ختم کیا ہے۔''

''مجھے معاف کردو نزائلہ مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔''

نزائلہ نے شہزادے کی بات سنی ان سنی کردی۔ اور پوچھا۔ ''عبرانیوں پر کیا بیتی شہزادے......؟''

''سب کے سب بخیر وعافیت دریا کے پار چلے گئے۔ البتہ میرا باپ فرعون اپنے لشکر سمیت اپنے غرور کے دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوگیا۔''

میں نے کہا۔ ''حضور! میری گستاخی درگزر فرمائیں اور مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیں کہ باتیں تو پھر بھی ہوتی رہیں گی۔ اس وقت تو آپ ملکہ کے مناسب علاج کی فکر کیجئے۔''

''ملکہ......؟''

''ہاں حضور! اپنے باپ کی وفات کے بعد آپ جائز طور پر فرعون مصر ہیں اور آپ کی بیگم ملکہ۔''

عین اس وقت جب میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ محل میں قابوس اور کاہن پجاری اور امراء داخل ہوئے اور شہزادے کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔ ''تخت وتاج آپ کے منتظر ہیں۔ خدائے مصر......'' قابوس نے سجدے میں سے سر اٹھا کر کہا اور پھر دوبارہ سجدے میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

ہم لوگ شاہی محل میں منتقل ہوگئے۔

سات روز تک مسلسل شاہی طبیب نزائلہ کا علاج کرتے رہے۔ سات روز مسلسل نیا فرعون مصر سبوعہ بھوکا پیاسا رہا۔ سات روز تک وہ مسلسل جاگتا رہا اور نزائلہ کی تیمارداری کرتا رہا۔

آٹھویں شب کو اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''اناطوق کہانی ختم ہوگئی۔''

میرے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ میں سمجھ گیا کہ کہانی ختم ہونے سے اس کی کیا مراد ہے۔

''مصر کی ملکہ کو شاہی جوڑا پہنانے میں میری مدد کرو۔'' اس نے بالکل سپاٹ لہجے میں مجھ سے کہا۔

پھر اس نے نزائلہ کو مصر کی ملکہ کا لباس پہنایا۔ اس کے سر پر تاج رکھا اور اپنی گود میں اٹھا کر محل کے اس حصے میں پہنچا، جہاں مصر کے فرعونوں کی رسم تاجپوشی ادا کی جاتی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے شاہی تخت پر نزائلہ کے مردہ جسم کو رکھا۔ تھوڑی دیر تک اس کے سامنے کھڑا رہا۔ اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا......

''ملکہ آپ نے تمام زندگی ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ آخر آپ نے یہ وعدہ خلافی کیوں کی؟''

پھر وہ آہستہ آہستہ تخت کی جانب بڑھا اور پھر وہ نزائلہ کی بغل میں بیٹھ گیا اور اپنے سر پر شاہ مصر کا ہیرے جواہرات سے مزین تاج رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ ''اب تم جاؤ اناطوق۔'' اس نے خواب آلود لہجے میں کہا...... ''گواہ رہنا کہ میں آج بھی اس تخت پر بیٹھنے اور فرعون کا تاج سر پر رکھنے کے بعد بھی دین موسیٰ پر قائم ہوں۔''

صبح کو محل کے غلاموں کو شاہی تخت پر بیٹھے ہوئے فرعون مصر اور ملکہ مصر کی لاشیں ملیں۔ لیکن میں تو پچھلی رات ہی سمجھ گیا تھا کہ اب یہ کہانی حقیقت میں ختم ہو رہی ہے۔ نزائلہ وعدہ خلاف تھی۔ اور اپنے شوہر کو تنہا چھوڑ کر جاسکتی تھی۔ مگر سبوعہ تو وعدہ خلاف نہیں تھا۔ اسے تو بہرحال اپنے وعدے کو نبھانا تھا۔ اور وہ نزائلہ کو کس طرح اکیلا جانے دیتا۔

کتاب کی تحریر مکمل ہو چکی تھی۔ ہارون دانش کے خاموش ہوتے ہی وہ سب جیسے خواب سے جاگ گئے۔ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہوگئے تھے۔ خود

ہارون دانش پر بھی ایک انوکھا تاثر طاری تھا۔ وہ کردار جو تحریر میں بیان کئے گئے تھے۔ بالکل ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے ان کے اردگرد موجود ہوں۔ مدھم مدھم بھنبھناہٹیں ایک عجیب سا سماں باندھ رہی تھیں۔ پھر میں ہی چونکی اور میں نے آگے بڑھ کر ہارون دانش کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

ماحول ہی ایسا ہوگیا تھا۔ کہ ہر شخص کھویا ہوا تھا۔ ہارون دانش بھی چونکے انہوں نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''نشاء......'' ان کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔

''جی پپا......'' میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''تم ٹھیک تو ہو......؟''

''جی پپا......'' میں نے دوبارہ اسی انداز میں جواب دیا۔ اسی وقت روشاق نے ایک جھرجھری سی لی اور بولا۔

''آہ یوں لگتا ہے۔ جیسے ہم نے اسی قدیم دنیا میں پہنچ گئے ہوں۔ یہ بات تو طے ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ عبرانیوں کا دور ایسا ہی تھا۔''

''مگر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ روشاق۔'' سرسراتی آواز میں بولا اور سب کی نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس کتاب کی یہاں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ اور جناب ہارون دانش اس زبان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔'' پاپا نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولے۔ ''یہ بات تو نشاء ہمیں بتا سکتی ہے۔'' پاپا کے یہ الفاظ شاید روشاق کو ناگوار گزرے تھے۔ اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

''ہاں...... جس چیز کو دن رات پڑھا جائے۔ اس کا یاد رہ جانا کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ ویسے آپ کی بیٹی خاصی ذہین معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کی یہاں موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ زمانہ قدیم کا مصر کسی نہ کسی طرح تیونس سے منسلک تھا۔ اور اس کا کوئی خاص پس منظر تھا۔'' ہارون دانش نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور میری طرف دیکھ کر بولے۔

''نشاء...... کیا تم زمانہ قدیم کے مصر پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہو......؟''

''کیوں نہیں پاپا۔ میں قدیم بادشاہی، سلسلے کے بارے میں تفصیل جانتی ہوں۔ یہ سلسلہ تیسرے سے چھٹے شاہی خاندان تک رہا۔ پھر ایک سو سال تک افراتفری رہی۔ نویں خاندان نے دو ہزار سال قبل مسیح فرعونی اقتدار بحال کیا۔ سترہواں خاندان مصری تھا جس نے ہیکسوس کو باہر نکالا۔ اور اٹھارویں خاندان کا بادشاہ طوطمس ساس تھا۔ جس نے فنعقیہ، فلسطین، اور شام فتح کئے۔

میں آپ کو مصری عقائد کے بارے میں بتاؤں۔ جس کا تجزیہ یوں ہے کہ حیات بعد الموت، قدیم مصری عقیدے کا ایک اہم پہلو ہے۔ اور اسی پہلو کو مدنگاہ رکھا جائے۔ تو عالی شان مقبرے حنوط شدہ اجسام، اور عظیم الشان احرام نگاہ میں آتے ہیں۔ مصریوں کے عقائد یوں تھے کہ جسم ایک مصنع ہے جسے قاء کہنا مناسب ہے۔ اور یہ دنیاوی زندگی گزار کر بھی مرجانے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ چنانچہ جسموں کا حنوط کر لینا بہتر ہے۔ کہ اب کی ہیت برقرار رہے۔ ''قا'' کی اصلیت قائم رہے۔ اور آغوسرے، یعنی سورج دیوتا۔ سب سے پہلا بادشاہ ازل کا دیوتا۔ غریب کا وزیر جو ناپاک نظر تبدیل نہیں کرتا اور جو زمین کے فیصلے کرتا ہے۔ اصل میں بابا...... ''فے'' تنکیری علامت ہے۔ اور ''ر......'' ''عین'' سورج کو کہتے ہیں۔ اس طرح بادشاہ کا لقب، فا، ر، عین، ہوتا ہے۔ یہ ہی لفظ عبرانی زبان میں فراعین اور عربی میں

www.pdfbooksfree.pk

فرعون بنا۔ میں بول رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''ہیرو دیس کا نام سامنے آتا ہے۔ کی سی، ڈوڈا، کا ایک عذمین کی کتاب جو قدیم مصریوں کا ادب کہلاتی ہے۔ موجود تھی۔ تو نیسی ٹینڈر کی کتاب بھی سجی ہوئی تھی۔ جو قدیم مصر کی رہنمائی کرتی ہے۔ کیا مجھے پپا، یہ سارے معاملات مصر سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اور میں انہی کے بارے میں جانتی ہوں۔'' میں جیسے ہوش میں آ گئی اور میں نے سامنے بیٹھے ہوئے مائیکل، اور امیر الحسنات وغیرہ کو دیکھا، جو تصویر حیرت بنے ہوئے تھے۔ جیسے اسے میری گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

مجھے ایک دم برا سا محسوس ہوا۔ لیکن مائیکل جون نے گہری ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ہارون دانش! تم نے اپنی بیٹی کو کیا، سے کیا بنا دیا ہے۔''

''اٹھتے ہیں میرا خیال ہے ہم لوگ کافی وقت ضائع کر چکے ہیں۔'' روشاق نے ایکدم اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ نجانے کیوں وہ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ اسی انداز میں کھڑا رہا اور پھر منہ پھیر کر چلا گیا۔ تب مائیکل جون اور امیر الحسنات بھی کھڑے ہو گئے۔ اور پاپا بھی.....

''یہ شخص کیا چیز ہے.....'' امیر الحسنات بولا اسی وقت اچانک کسی گوشے سے اس کی سیانی بلی بھی نکل آئی۔ اور تیزی سے دروازے سے باہر چلی گئی۔

''یہ بلی کہاں تھی.....''

''پتا نہیں.....''

''میں ایک بات کہوں۔ یہ شخص بہت پراسرار ہے۔ ہمیں اس پر نگاہ رکھنا ہوگی۔'' امیر الحسنات نے کہا اور مائیکل جون پراسرار انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''مجھے بھی اس کی حرکات عجیب و غریب لگتی ہیں۔'' بہت انوکھا انسان ہے۔ میرا دل تو چاہا کہ میں ان لوگوں سے پوچھوں کہ انہوں نے آخر روشاق کو اپنے ساتھ کیوں لگا رکھا ہے۔ جیسے میری زبان پر کسی نے تالا لگا دیا ہو۔ میں کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہیں بول سکی تھی۔ غرض یہ کہ ان پہاڑیوں کے پراسرار ماحول میں بڑے عجیب و غریب انکشافات ہو رہے تھے۔

وہ لاش ہم سب لوگوں کے لئے انتہائی حیرت ناک تھی۔ ہارون دانش صاحب اس گتھی کو سلجھانے بیٹھ گئے۔ یہ انہیں ہی کرنا تھا۔ باقی تو سب اس کے معاون کے طور پر کام کر رہے تھے۔ روشاق اب بھی ہمارے درمیان شامل نہیں تھا۔ لیکن چائے وغیرہ پینے کے بعد مائیکل جون اور امیر الحسنات وغیرہ پاپا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اور اس سلسلے میں آگے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ اس لاش پر تحقیق بھی ضروری تھی۔

اس بارے میں باتیں کی گئیں کہ اگر اس لاش کو یہاں سے باہر لے جایا جائے تو تیونس کی حکومت اس سلسلے میں کیا مداخلت کر سکتی ہے۔ امیر الحسنات نے کہا۔

''مقامی حکومت ہمارے ساتھ بہترین تعاون کر رہی ہے۔ لیکن ایک ایسی لاش کو جو بظاہر ایک زندہ سی حیثیت رکھتی ہے لے جانے کی اجازت دی جائے گی یا نہیں۔ اس بارے میں نہیں کہا جا سکتا۔''

''میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے.....!'' مائیکل جون نے کہا۔

''کیا.....؟''

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ اس لاش نے ہمیں تصویر حیرت بنا دیا ہے وہ بالکل ایک زندہ لاش معلوم ہوتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا طبی معائنہ بھی ضروری ہے تمہیں یہ اندازہ لگانا ہوگا کہ اس کے اندر کہیں زندگی تو نہیں ہے۔'' مائیکل جون نے چونک کر امیر الحسنات کو دیکھا اور ہنس کر بولا.....

''وہ ایک گہرائی میں دفن تھی۔ زندہ کیسے ہو سکتی ہے؟ خیر پھر بھی جس طرح آپ لوگ مناسب سمجھیں۔ ہماری کارروائی ایک دم رک گئی ہے۔ میرا

خیال ہے کہ ہمیں یہاں زیادہ طویل وقت نہیں لگانا چاہیے۔ ہمارے اصل کام میں رکاوٹ پیش آ گئی ہے۔ جس قدر جلد ممکن ہو۔ ہمیں کار چوک میں اپنا کام مکمل کر لینا ہوگا۔ طے یہ کیا گیا کہ دوسرے دن سے پھر باقاعدگی کے ساتھ کھدائی شروع کرا دی جائے۔ اور جو کچھ ملے اس پر نگاہ دوڑائی جائے۔ ہارون دانش صاحب نے بھی اپنے لئے تمام انتظامات مکمل کر لئے اور اس لاش کے بارے میں تحقیقات اور پہلے کی مانند اس تہذیب کے آثار کی تفصیلات معلوم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، رات کو میں اور پاپا سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پاپا ہی نے اس سوچ کو توڑا اور بولے۔

''آشوانی تہذیب کے آثار بتاتے ہیں کہ مصر قدیم سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ ہمیں یہ تعلق تلاش کرنا ہوگا۔ یہ لوگ بھی اس کے لئے تجسس ہیں۔''

''پاپا! روشاق کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کیا یہ شخص بہت عجیب محسوس نہیں ہوتا۔'' پاپا گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ بہرحال اس کے بعد نیند آ گئی۔ لیکن یہ نیند بھی عجیب سی تھی۔ بس یوں لگ رہا تھا۔ جیسے جاگ رہی ہوں۔ لیکن اور کوئی خیال ذہن میں نہیں تھا۔ دوسری صبح کافی خوشگوار تھی۔ تمام لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ روشاق ایک پہاڑی ٹیلے پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ وہ کتاب نہیں تھی۔ جو یہاں سے دستیاب ہوئی تھی۔

اسے محفوظ طریقے سے رکھ دیا گیا تھا۔ میں دور سے کھڑی روشاق کو دیکھتی رہی۔ نجانے کیسا لگ رہا تھا۔ مجھے اپنے وجود میں ایک بھاری پن کا سا احساس محسوس ہوا۔ اور پاپا نے اسے محسوس کر لیا۔ اور انہوں نے کہا۔

''نشاء..... کیا بات ہے۔ بیٹے! تم مجھے بہت ڈسٹرب نظر آ رہی ہو۔''

''نہیں پاپا۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ بس ذرا میرے ذہن پر ایک بوجھ سا طاری ہے۔''

''آؤ..... آگے آؤ.....'' پاپا نے کہا۔ اور میں ان کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اس وقت ہم ایک ڈریم پہاڑی کے ڈھلوان پر کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں آثار قدیمہ کی تلاش میں کی جانے والی کھدائی کے بے شمار اونچے نیچے گڑھے، کھنڈر کا سا سماں پیش کر رہے تھے۔ جلتے ہوئے سورج کی شعاعیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ اور بدن میں ہلکی سی چبھن کا احساس ہوتا تھا۔ پاپا نے پھر مجھ سے کہا۔

''نشاء..... میں تمہارے اندر کچھ عجیب سی تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں۔ پہلے تو تم کبھی ایسے کھنڈروں سے خوفزدہ نہیں ہوئی تھیں۔''

''نہیں پاپا۔ میرے ذہن میں، آشوانی تہذیب کی مختلف شکلیں گھوم رہی ہیں حالانکہ اس سے پہلے میں نے کبھی اس تہذیب کے بارے میں کوئی ایسی کتاب نہیں پڑھی۔ جس میں اس کے بارے میں کوئی تذکرہ ہو۔ لیکن میں آپ کو تھوڑی سی تفصیل بتاؤں۔ نجانے یہ تفصیل کس طرح میرے ذہن تک پہنچی ہے۔'' ہارون دانش نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھا، پھر بولے۔

''کیا مطلب.....؟''

''پاپا..... جب آشوان کے شہر ''زورامار'' کو تباہ برباد کیا تو کسی نے اسے بددعا دی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاپا ان کھنڈرات کی کھدائی سے ہم پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے۔ پاپا مجھے اپنے اندر کچھ ایسی تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ جیسے میرا وجود کوئی جھنجھوڑے ڈال رہا ہے۔ میرا بدن پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔ میں ایک اور شکل کو دیکھ رہی تھی۔ جو میں ہی تھی۔ جو سنہرے رنگ کے تابوت میں سو رہی تھی۔ لیکن میں اسے اپنے سامنے ویران پہاڑی پر کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ میں نے خود کبھی اپنے بارے میں غور نہیں کیا تھا۔ کہ میری شکل و صورت کیسی ہے۔ کیا میں ایک حسین لڑکی ہوں۔ لیکن اس وقت میں اپنے وجود کا دوسرا حصہ دیکھ رہی تھی۔ بے حد حسین

www.pdfbooksfree.pk

لڑکی جو پہاڑ کی اس چوٹی پر کھڑی ہوئی مصر کی قلوپطرہ کی طرح باوقار نظر آرہی تھی۔ نیلی اور جھیل کی طرح گہری آنکھیں سامنے ہونے والی کھدائی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا قد دراز تھا۔ چشم شباب کی تازگی اور رعنائی سے بھرا ہوا۔ شانے چوڑے اور سینہ جوانی کے حسین گداز سے بھرپور ایک حیران کن بات تھی یہ کہ میں اپنے سامنے ایک حسین وجود کو دیکھ رہی تھی۔ جو میں ہی تھی۔ اور ایک سرسبز و شاداب پہاڑی ڈھلوان پر کھڑی ہوئی تھی، ہم سے کچھ فاصلے پر ایک بیرک نما سفید عمارت نظر آرہی تھی۔ جو آثار قدیمہ کے ماہرین کی رہائش گاہ کے طور پر یہاں متعین کی گئی تھی۔

اور حکومت تیونس میں یہ ان ماہرین کے لئے قیام گاہ کے طور پر تعمیر کی تھی۔ اس وقت بہت سے مزدور پہاڑ کے دامن میں کھدائی کررہے تھے۔ اور یہ جگہ خلیج تیونس میں واقع تھی۔ سفید عبا پہنے ہوئے مزدور پہاڑ کی کھدائی میں مصروف تھے۔ دور تک نیلا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ اور ساحل پر دور دور تک سرسبز پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اپنا وجود ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں ایک انوکھی دیدہ ور ہوں جو صدیوں پرانے ماحول کو دیکھ رہی ہے۔ اس جگہ ایک عظیم شہر آباد تھا۔ جس کی بلند اور مضبوط پتھر کی دیواریں اس پہاڑی پر واقع شہر کے گرد پھیلی ہوئی تھیں۔ یہاں ایک انتہائی ظالم انسان حکمران تھا۔

آشوانی تہذیب پر مذہب کی حکمرانی تھی۔ اور یہیں کہیں وہ عظیم الشان مندر بھی واقع تھا۔ جس کی چار دیواریوں میں ظلم و بربریت کے قصے مدفون تھے۔ جس کے حسین نوجوان پجارنوں کی شہوانی تسکین مذہب کی آڑ میں ہوتی اور جس کی بڑی پجارن کے حکم پر ہر ایک کو سر تسلیم خم کرنا ضروری ہوتا تھا۔

آشوانی تہذیب ایک ظالمانہ اور وحشیانہ دور حکومت کی یادگار تھی۔ آخر کار بیرونی حملہ آوروں نے حملہ کر کے اس تہذیب کو تاراج اور اس شہر کو ختم کردیا۔ اسی آشوانی تہذیب کی تلاش کی جارہی تھی۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں اس تہذیب کے بہت سے ادوار گزر رہے تھے۔

اچانک ایک انجانی آواز میرے کانوں میں گونجی جو مجھ سے کہہ رہی تھی۔

''سنو! تم وہ نہیں ہو جو اپنے آپ کو سمجھتی ہو۔ اپنا وجود تحلیل کردو۔ اپنا جسم چھوڑ دو۔ تم..... تم نہیں میں ہوں۔ سمجھیں۔ تم..... تم نہیں میں ہوں۔'' میرا سارا وجود لرزنے لگا۔ مجھے اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے اس دور کی انسان ہی نہ ہوں۔ کسی قدیم دور میں چلی گئی ہوں۔ بہت دیر تک یہ احساس مجھ پر طاری رہا۔ اچانک ہی پاپا کے ہاتھ کے احساس کے لمس نے مجھے چونکا دیا۔ پاپا غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ مجھے جھنجھوڑ رہے تھے۔ لیکن میں ان سے مخاطب نہیں ہوئی تھی۔

ان کے چہرے پر اس وقت عجیب سی پریشانی کے آثار تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''نشاء..... نشاء کیا ہوگیا.....؟ تم ٹھیک تو ہو.....؟ تمہارا پورا بدن پسینے سے کیوں شرابور ہورہا ہے۔ میں نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے پاپا کو دیکھا۔ ایک لمحے کے اندر میں انہیں کیا بتاتی کہ مجھ پر یہ چند لمحات کیسے بیتے ہیں۔ میری خوفزدہ نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں جہاں میں نے اس دوسرے وجود کو دیکھا تھا جو میرے وجود کا عکس تھا۔''

''شاید تمہاری طبیعت خراب ہورہی ہے۔ آؤ۔ واپس چلیں۔'' پاپا نے کہا۔

''پاپا میں آپ سے ایک بات کہوں.....''

''ہاں..... ہاں..... بیٹے بولو..... کیا بات ہے.....؟'' پاپا نے پریشان لہجے میں کہا۔

مائیکل جون اور امیر الحسنات اس وقت نجانے کہاں تھے۔ یہاں صرف میں اور پاپا ہی تھے۔ پاپا نے امداد طلب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن آس پاس کوئی وجود نہیں تھا۔ عربی مزدور کھدائی میں مصروف تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی وہ لوگ جو یہاں ہمارے معاون تھے۔ لیکن اس وقت وہ ہمارے پاس نہیں تھے۔ چونکہ میں اپنے باپ کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔

کافی دیر تک پاپا۔ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لیتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''شاید تم پر اس ماحول کا کچھ نفسیاتی اثر ہے۔ جو کچھ ہوا ہے۔ وہ واقعی سنسنی خیز ہے۔ اور بہت عرصے کے بعد میں بھی کسی ایسی الجھن کا شکار ہوا ہوں۔ خاص طور سے اس لئے کہ تمہاری ایک ہم شکل تابوت میں موجود ہے۔ اور وہ قدیم مصریوں ممیوں کا سا انداز نہیں رکھتی۔ بہرحال ایک بات میں تم سے اور کہنا چاہتا ہوں۔ نشاء..... وہ یہ کہ میری زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ ہے کہ روحوں کی ایک دنیا عام دنیا سے الگ ہے۔ اور ان کے طریقے کار اور طرز عمل بھی مختلف ہم کسی ایک راستے پر کاربند نہیں ہوسکتے۔ ہمیں ہر طرح کے واقعات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ اور یہ بات تم جانتی ہو کہ ہم ایک ایسی تہذیب کے آثار تلاش کررہے ہیں جو ظلم اور بربریت کے واقعات سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں تشدد اور بربریت کے ذریعے ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

تم ان واقعات کا مطالعہ کرو گی تو تمہیں مکمل طور پر معلومات حاصل ہوگی۔ کیا سمجھیں.....؟''

''پاپا..... میں انہی لمحات سے گزر رہی ہوں۔''

''کیا مطلب.....؟'' پاپا نے سوالیہ انداز میں کہا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میرے ہونٹوں پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ جیسے کوئی میری آواز بند کرنا چاہتا ہو۔ جیسے کوئی نہ چاہتا ہو کہ میں وہ کہوں جو اصلیت ہے۔ اور جو مجھ پر بیت چکی ہے۔ اسی وقت مائیکل جون اور امیر الحسنات ہمیں اپنی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ دونوں ہمارے قریب پہنچ گئے تھے۔

''ہیلو..... پروفیسر ہارون دانش، جو کچھ ہورہا ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے ابھی تک اپنی رائے نہیں دی۔''

''کیا کوئی حتمی رائے دینے کا مرحلہ آگیا ہے۔'' پروفیسر دانش یعنی میرے پاپا نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔

''لیکن میں اور امیر الحسنات اس صدیوں پرانی تہذیب کے آثار تلاش کرنے میں بڑے پرجوش ہیں۔ ہارون دانش صاحب اس کی تاریخی اہمیت اس قدر زبردست ہے کہ اگر ہم کامیاب ہوگئے تو یہ ایک زبردست کارنامہ ہوگا۔''

''ہاں..... یقیناً اور خاص طور سے ہمیں اس پراسرار مندر کی تلاش ہے۔ جس کے مختلف نام تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں۔ لیکن ایک خوفناک اذیت گاہ، کے طور پر اسے جانا جاتا ہے۔ اور ہم اس کو درد کا مندر کہیں تو غلط نہیں ہوگا۔''

''درد کا مندر.....'' نام تو اچھا ہے۔ بہرحال دیکھتے ہیں کہ اس مندر کے کوئی آثار ملتے ہیں یا نہیں۔''

''ہاں..... اب تک تو کوئی نشان نہیں ملا ہے۔'' پاپا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''یہ روشاق کہاں ہے؟ وہ ہمیشہ ہم سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ اور بہت دیر سے مجھے نظر نہیں آیا۔''

''وہ ایک انوکھا انسان ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ تم نے اس شخص کو اپنے سر کہاں سے لگا لیا۔'' دونوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ اور اس کے بعد پاپا کہنے لگے۔

''ویسے وحشی حملہ آوروں نے پورے شہر کو تباہ برباد کردیا تھا۔ اور یہاں موجود ایک ایک فرد کو قتل کردیا تھا۔ عمارتوں کو نذر آتش کردیا تھا۔ اور شاید مندر وغیرہ کی عمارت کو بھی مکمل طور پر زمین بوس کرکے تاراج کردیا تھا۔ ورنہ کہیں نہ کہیں تو اس کے

www.pdfbooksfree.pk

نشانات سرور تھے۔

"ہوں..... تو پھر اب کیا کہتے ہیں.....؟"

"آؤ..... چلیں..... ایک عجیب سی تھکن کا احساس ہو رہا ہے۔" پاپا نے کہا۔ میں بھی اس وقت یہ ہی چاہتی تھی۔ چنانچہ ہم اس سفید عمارت کی طرف بڑھ گئے جو ہماری رہائش گاہ کے طور پر تیار کی گئی تھی۔ اچانک ہی پاپا نے سرگوشی کے عالم میں کہا۔

"ایک بات کہوں..... نشاء اپنی اس کیفیت کے بارے میں ابھی کسی کو کچھ مت بتانا۔ سمجھ رہی ہو ناں۔ ورنہ مختلف قسم کی فضول باتیں شروع ہو جائیں گی۔"

"جی پاپا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

میں نے پاپا کی بات پر عمل کیا تھا۔ اور پھر ویسے بھی میرا کوئی ایسا اوزار یہاں موجود نہیں تھا۔ جس سے میں اپنے دل کی بات کہوں۔ بس ایسے ہی وقت گزر رہا تھا۔ لیکن اس بات کا خود مجھے احساس ہو رہا تھا۔ کہ میرے اندر کوئی انوکھی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ یہ لوگ آشوانی تہذیب کے آثار تلاش کر رہے تھے۔ اور آہستہ آہستہ اس کے بارے میں معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ لیکن میری کیفیت کچھ اور ہی تھی۔

رات کو بستر پر لیٹ کر میں بہت دیر تک اس بارے میں سوچتی رہی۔ مجھے اپنے ڈراؤنے خواب سے ایک وحشت سی ہو رہی تھی۔ اور میں کافی فکر مند تھی۔ ایک مرتبہ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ دور قدیم میں کسی طرح جادو کے ذریعے بعض ساحر لوگوں کے جسم و دماغ پر قبضہ کر لیتے ہیں ان علاقوں میں خاص طور سے بے شمار لوگ ایسا عمل جانتے تھے۔ اور اس عمل کے ذریعے دوسرے افراد کی روح کو جسم چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ نجانے کیا بات تھی کہ مجھ پر اس وقت بھی ایک انجانہ سا خوف مسلط تھا۔ جیسے کوئی بدی کی قوت پورے ماحول پر محیط ہو۔ جیسے کوئی انہونی بات ہونے والی ہو۔

ایک عجیب قسم کے کپکپا دینے والے خوف سے بدن میں سرد لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں گرد و پیش کے ماحول کو آہستہ آہستہ بھولتی جا رہی تھی۔ اور میرے ذہن میں پرانا آشوانی شہر آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میں اس شہر کا نظارہ کر رہی ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا اس شہر سے کوئی گہرا تعلق ہو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میں نے اس شہر کو کبھی زندگی میں دیکھا تھا۔ لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے اطراف میں دیوتا آشوان کا عالی شان مندر اس میں جلتی ہوئی آگ کی قربان گاہ ننھے ننھے بچوں کو آگ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ جہاں کنواری اور حسین دوشیزائیں۔ قربان گاہ پر اپنی دوشیزگی قربان کر دیتی تھیں۔ اور مذہب کے نام پر اس طرح مندر کے پجاری اپنی ہوس کی آگ کو ٹھنڈا کیا کرتے تھے۔

جہاں قیدیوں کو اور مخالفوں کو اذیت ناک طریقوں سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔ یہ پوری آبادی ظلم و بربریت کی آماجگاہ تھی۔ بہر طور یہ آبادی مٹ گئی۔ اور اس کا نام و نشان زمین کی گہرائیوں میں گم ہو گیا۔ نجانے کیا ہوا۔ شاید میں اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل آئی تھی۔ میں نے باہر کے ماحول کو محسوس کیا تھا۔ تاروں کی روشنی میں سارا عالم سویا ہوا تھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر کھڈے ہوئے کھنڈرات کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ اور دور تک سمندر کا پانی تا حد نگاہ پھیلا ہوا چاندنی کی چادر کی طرح جھلملا رہا تھا۔ بڑا حسین منظر تھا۔

لیکن پورے ماحول پر ایک عجیب سی نحوست چھائی ہوئی تھی۔ جیسے بدی کی ساری قوتیں فضا میں منڈلا رہی ہوں۔ جیسے آشوانی شہر کے وہ تمام روحین جنہیں جلتی آگ میں پھینک دیا گیا ہو یا ذبح کر دیا گیا ہو۔ اس پہاڑ کی کسی چوٹی پر اپنے شکار کی تلاش میں چھپی بیٹھی ہوں۔ بڑا ہولناک آسیبی ماحول ہو رہا تھا۔

اچانک میں نے اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور اچھل پڑی۔ میں نے جلدی سے مڑ کر

دیکھا تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ میں حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر اچانک ہی میرے منہ سے ایک وحشت زدہ سی آواز نکلی۔

"ہاں..... ہاں..... سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ مندر، مینار، راج محل، آدمی، عورتیں، دیوتا۔ سب مٹ گئے ہیں۔ دیکھو! کیسی ویرانی ہے چاروں طرف۔ سب خاک میں مل گئے۔ کسی کا نام و نشان نہیں۔ پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی دوبارہ میرے سامنے آیا ہو اور پھر میں حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ میں ہی تھی میرا وجود، وہی لڑکی تھی جو میرے جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ البتہ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا۔

"اوہ..... تم..... تم نہیں..... میں ہوں۔ سمجھیں.....؟ تم..... تم نہیں میں ہوں۔ اور میں..... میں نہیں..... تم ہو۔ میری بات غور سے سنو۔ تمہیں آنا ہے۔ تمہیں وہاں آنا ہے۔ جہاں میں ہوں۔ میں تم سے ملوں گی۔" وہ خاموشی سے چند قدم آگے بڑھی۔ خوف سے میرے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ میں جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔ میں نے پھر اس طرف دیکھا۔ لیکن اب اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

"کیا ہے یہ سب کچھ..... کیا ہے.....؟"

غرض یہ کہ میں بہت دیر تک ادھر ادھر گھومتی رہی پھر اس کے بعد اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ لیکن مجھ پر ایک عجیب سا خوف طاری تھا۔ دوسری صبح معمول کے مطابق تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن میرے وجود میں کوئی انوکھی بات سرائیت کر گئی تھی۔ وہ لوگ آشوان مندر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ مائیکل جون کہہ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے۔ اب ہم کھدائی کی جگہ تبدیل کر دیں۔ ادھر ایک بلند پہاڑی ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ مائیکل جون نے کہا۔

"ممکن ہے۔ وہ جگہ ہماری توجہ کا مرکز بن جائے۔"

"نہیں..... یہ نہیں..... آشوانی مندر ادھر ادھر مغربی حصے میں واقع ہے۔ اس بلند ٹیلے کی کھدائی کریں۔ مندر وہیں ملے گا۔" یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے تھے۔ لیکن میرے نہیں تھے۔ وہ سب حیرت زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر مائیکل جون نے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو بے بی!؟"

"میں.....؟" میں چونک کر بولی۔

وہ سب مجھے دیکھتے رہے۔ لیکن پاپا نے سرد لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کوئی حرج نہیں ہے۔ میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا کہ اب اس طرف کا رخ کر کے وہاں کی کھدائی کی جائے۔"

"لیکن اس کی کوئی وجہ؟"

"پھر کیا کرنا چاہتے ہو۔ بتاؤ.....؟"

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں۔ ٹھیک ہے۔ یہ کام کرتے ہیں۔"

بہر حال اس جگہ کھدائی کا مشورہ دے دیا گیا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ کوئی انجانی قوت میری زبان میں بول رہی ہے۔ حالانکہ میں خود حیران تھی۔ بہر حال وہاں کھدائی شروع ہو گئی تھی۔ پھر غالباً اس کھدائی کا دوسرا دن تھا کہ اچانک ہی ایک عرب مزدور بھاگتا ہوا ہماری سمت آیا۔ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔

"آشوانی مندر..... آشوانی مندر۔" سب اچھل کر کھڑے ہو گئے انہوں نے دیکھا کہ مزدوروں نے کھدائی روک دی ہے۔ اور سب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ پاپا کو اس طرح میں نے کبھی دوڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ بھی اس جگہ کی طرف دوڑے۔ اور ہم سب بھی..... اس کے بعد ہم اس ٹیلے کے پاس پہنچ گئے جس کی کھدائی ہو رہی تھی۔ پاپا حیرانی سے ادھر دیکھ رہے تھے۔ اور پھر سب ہی کے چہرے سرخ ہو گئے۔

www.pdfbooksfree.pk

روشاق بھی جھک جھک کر اس گڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں پتھر کا ایک بلاک نظر آ رہا تھا۔ جو اب بالکل سیاہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس پر کندہ نقش اور عجیب وغریب تصویریں اس بات کا ثبوت تھیں کہ یہ مندر کی دیوار کا ایک حصہ ہے۔ پاپا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اور میری بیٹی نے بالکل صحیح نشاندہی کی تھی۔''

''اچھا.....!'' سب چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

☆.....☆.....☆

مندر کی جو دیوار نمودار ہوئی تھی۔ اس پر جو تحریر اور نقوش کندہ تھے۔ وہ آشوانی تہذیب کی بہترین نمائندگی کرتے تھے۔ چنانچہ پاپا اس میں بری طرح مصروف ہو گئے۔ مزید کھدائی سے اور بہت ہی ایسی چیزیں نمودار ہوئی تھیں۔ جو بڑی عجیب وغریب نوعیت کی حامل تھیں۔ میں مسلسل یہ بات محسوس کر رہی تھی کہ میرے دل ودماغ پر کوئی بوجھ ہے۔

ایسا لگتا تھا۔ جیسے کوئی میرے وجود پر قابض ہو چکا ہو۔ وہ کون ہے؟ اس کی کوئی تصدیق میں نہیں کر سکتی تھی۔ اور نہ ہی میں پاپا کو اس بارے میں تمام حقیقتیں بتا سکتی تھی کیونکہ جب بھی میں نے ایسی کوئی کوشش کی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا منہ بند کر دیا ہو۔ میں اس کیفیت کو اچھی طرح محسوس کرتی تھی۔ لیکن لفظوں میں بیان نہیں کر پا رہی تھی۔ اور اس رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

اس رات آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد بوندا باندی شروع ہو گئی۔ مزدوروں نے جگہ جگہ پناہ لی تمام لوگ اپنے اپنے کونوں کھدروں میں جا گھسے سردی کچھ بڑھ گئی تھی۔ نجانے رات کا کون سا پہر تھا۔ کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے آواز دے رہا ہو۔ یہ مدھم مدھم آوازیں۔ میرے کانوں میں گونج کر میرے ذہن پر سحر طاری کر رہی تھیں۔ اور پھر میں اپنی جگہ سے اٹھی۔ میری شخصیت اس وقت دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک حصہ نشاء کا تھا۔ جو اس وقت کی حقیقت تھی۔ لیکن دوسرا حصہ اسی پراسرار عورت کا تھا۔ جو میرا وجود رکھتی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس وقت میں چار پیروں سے چل رہی ہوں۔ اور پھر میں جہاں پہنچی وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ وہ کمرہ کس جگہ واقع تھا۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم.....

لیکن..... میں نے وہاں ایک زرنگار کرسی پر روشاق کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ روشاق عجیب شاہانہ انداز سے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میری اور اس کی قدیم شناسائی ہو۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر روشاق کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں برقی روئیں دوڑ رہی تھیں۔ کوئی ایسی مقناطیسی قوت تھی اس کی آنکھوں میں جس سے نگاہیں چمک جاتی تھیں۔ میرے سارے جسم میں سنسنی ہونے لگی۔

مجھے یوں لگا جیسے میں ڈوب رہی ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی شدید خطرہ میرے اردگرد منڈلا رہا ہے۔ عجیب سی قوت تھی۔ روشاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''حسین لڑکی تو نزائلہ ہے ناں..... مجھے نہیں پہچانتی۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میں کون ہوں۔ میں..... روشاق کا بڑا پجاری قابوس ہوں۔ سمجھی..... میں قابوس ہوں۔ تیرا ذہن خلاؤں میں بھٹک گیا ہے۔ تو نہیں جانتی کہ مجھے آشوانی مندر کے بڑے پجاری کا مرتبہ حاصل ہے۔ مجھے مندر کی ناقابل شکست قوت حاصل ہے۔ مجھ سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ ہاں..... اب تیرے جسم پر میرا قبضہ ہے۔ سمجھ رہی ہے ناں تو..... بہت عرصے سے تو یہاں ان کھنڈرات میں مدفون تھی۔ صدیاں گزر گئیں۔ اور آخر کار میں نے تجھے حاصل کر لیا.....

(جاری ہے)

معاوضہ

رضوان قیوم۔ راولپنڈی

ایک کھلے میدان میں نوجوان زمین پر بے سدھ پڑا تھا اور ایک دوسرا اس کے گرد دائرہ کھینچ کر بوتل میں موجود خون چھڑک دیا۔ خون کا زمین پر گرنا تھا کہ نوجوان کی فلک شگاف چیخ بلند ہوئی اور پھر.....

راتوں رات دولت مند بننے کے خواب دیکھنے والوں کے لئے پر ہیبت رونگٹے کھڑے کرتی کہانی

اس کہانی کے راوی ایک ریٹائرڈ صوبیدار ارشاد حسین ہیں۔ موصوف کی عمر اس وقت 85-80 سال کے لگ بھگ ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بیتے ایک مافوق الفطرت واقعہ یوں سنایا۔

میرا آبائی گاؤں جالندھر کے پاس دھنورا ہے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو گوروں کو فوجی بھرتی کے لئے ہندوستانی نوجوانوں کی ضرورت پڑی۔ 1941ء میں جالندھر شہر میں فوجی بھرتی کے لئے کیمپ لگایا تھا۔ اس زمانہ میں تانگے پر پھر کر فوجی بھرتی کے لئے اعلان کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں مسلمان لوگ تعلیم کی جانب زیادہ توجہ نہ دیتے تھے۔ جبکہ ہندو، سکھ تعلیم کے میدان میں مسلمانوں سے

www.pdfbooksfree.pk

بہت آگے تھے۔ اس لئے انہیں روزگار بھی آسانی سے مل جاتا تھا۔

فوجی بھرتی کی خبر جب ہمارے گاؤں میں موجود لوگوں کو ملی تو اس پکے اور باعزت روزگار کے لئے جوق در جوق لوگ فوجی بھرتی کے کیمپ جالندھر چھاؤنی میں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔

میرے والد صاحب نے بھی مجھے فوج میں بھرتی کے لئے کہا تو میں بھی جالندھر پہنچ گیا۔ انٹرویو دینے والے تمام نوجوانوں کو بھرتی کرلیا گیا۔

میرے ساتھ بھرتی ہونے والوں میں میرے گاؤں کا ایک نوجوان سلمان بھی تھا۔ وہ انتہائی شریف، نمازی اور شرمیلا سا تھا۔

سلمان اپنے نانا کے پاس رہتا تھا۔ اس کے والد ایک حادثہ میں وفات پاچکے تھے۔ سلمان کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی اس لئے کہ ایک تو وہ مسلمان تھا اور دوسرا اس کا تعلق میرے گاؤں کے ساتھ والے گاؤں سے تھا۔

بھرتی ہونے کے بعد سلیکشن بورڈ کے احکام کے مطابق ہماری فوجی ٹریننگ قصور کے سامنے والے علاقہ میں ہوگی۔ لہٰذا ہم نئے بھرتی شدہ نوجوانوں کو احکام کے مطابق پہنچادیا گیا۔ ایک دن سلمان کے نانا رحمت علی نے مجھے اپنے پاس گاؤں خصوصی طور پر بلایا۔ اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ۔ ''بیٹا سلمان کا بہت خیال رکھنا۔ یہ تم سے چھوٹا ہے۔'' انہوں نے خود بھی سلمان سے کہا کہ۔ ''تم بھی ارشاد حسین کی باتوں کو ماننا۔''

بہرحال ہم جب ٹریننگ سینٹر پہنچے تو اس جگہ سلمان بھی موجود تھا۔ وہ عجیب احساس کمتری کا شکار تھا۔ اس کو میں نے دیکھا تو اسے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''تم ٹریننگ کے دوران تمام لڑکوں کے درمیان گھل مل کر اطمینان سے رہا کرو۔'' اس نے کسی حد تک میری مان لی تھی۔

وہ بیرک میں موجود تمام ریکروٹوں سے گھل مل گیا تھا۔ بعض اوقات وہ اپنی سادگی طبع اور ناسمجھی کے تحت ایسی بھونڈی بات کردیتا تھا کہ بیرک میں موجود تمام نوجوان اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ خاص طور پر لالہ موسی سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان گوپال اسے بہت تنگ کرتا تھا۔ اور میں اکثر گوپال سے اس کی خاطر لڑ پڑتا تھا۔

بیرک میں موجود ایک ریکروٹ نارائن نامی تھا۔ اس سے میری بڑی اچھی دوستی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا تعلق میرے ضلع سے تھا۔ نارائن اخلاق، عادات واطوار کا بہت اچھا تھا۔

رات کو ہم جب بیرک میں دن کی ٹریننگ کے بعد اکٹھے ہوتے تو آپس میں خوب ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ وہاں سلمان بھی اپنی اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتا تھا۔ اب اصل مسئلہ یہ تھا کہ سلمان خواہ مخواہ کچھ بے پر کی مارتا تھا کہ وہ خود ہی مرکز مذاق بن جاتا تھا۔ میں اسے تنہائی میں سمجھاتا تھا کہ وہ محفل میں اوٹ پٹانگ باتیں نہ کیا کرے۔

ایک دن سلمان مجھ سے ناراض ہوکر مجھ سے کہنے لگا۔ ''ارشاد آپ خواہ مخواہ محفل میں بات کرنے سے ٹوکتے ہیں۔''

اس کی سمجھ میں میری باتیں نہیں آتی تھیں۔ وہ مجھ سے اب کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔ بیرک میں ایک ہندو نوجوان تھا۔ جگدیش ریکروٹ آیا۔ وہ ایک خاموش طبع کتابوں کا کیڑا قسم کا نوجوان جگدیش کا نام بیرک کے ریکروٹوں نے خٹکا رکھا تھا۔ اس کی اور سلمان کی دوستی بہت جم گئی تھی۔ وہ بیرک میں اکٹھے نظر آتے تھے۔

بیرک میں یہ بات محسوس کی جارہی تھی کہ دونوں آپس میں بیٹھے ایک کونے میں نہ جانے کیا کھسر پھسر کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اب کوئی اپنے پاس بلاتا بھی نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ دونوں ہمارے درمیان آکر ہماری محفل جوائن کرتے تھے۔

ایک دن گوپال نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے تو دال

میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیسا کالا!'' اس پر گوپال نے کہا کہ ''میں نے جگدیش کے ہاتھ میں ایک خون کی بڑی شیشی دیکھی ہے۔''

''کیسی شیشی.....؟'' میں نے اس سے تجسس سے پوچھا تو گوپال نے کہا کہ۔

''جگدیش کے ہاتھ میں ایک خون کی ایسی شیشی تھی جس میں اکثر حکیم یا ڈاکٹر دوائی ڈال کر دیتے ہیں۔'' یہ سن کر میں نے کہا۔

''یہ تمہارا وہم ہوسکتا ہے۔''

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ گوپال ایک شرارتی اور اس سے دشمنی رکھنے والا ہے، لہٰذا ہوسکتا ہے یہ مجھے اس کے خلاف بھڑکا رہا ہو۔ اس لئے میں نے اس کی اس بات پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔

چند روز بعد گوپال نے یہ بھی بتایا کہ ''جگدیش کی حرکات وسکنات بڑی مشکوک ہیں۔ وہ آئے دن خون کی ایک نئی شیشی لاتا ہے۔''

مجھے پہلی بار تشویش ہوئی۔ میں نے سلمان کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ کہ تم جگدیش کے ساتھ رہ کر کیا حرکات وسکنات کررہے ہو۔ یہ خون کی شیشی کا کیا معاملہ ہے؟''

یہ سن کر اس نے جواب دیا کہ۔ ''جگدیش نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے پورے جسم پر دائمی کالی چنبل ہے۔ اس کے لئے ایک حکیم نے اسے کوے کا خون اپنے جسم پر مالش کرنے کو کہا ہے۔''

میں نے یہ بات جب بیرک میں موجود دیگر ریکروٹ ساتھیوں کو بتائی کہ۔ ''سلمان تو ان خون کی شیشیوں کے بارے میں یوں بتاتا ہے۔''

یہ سن کر گوپال نے کہا۔ ''سلمان بکواس کرتا ہے۔ میرے والد کو برسوں کالے چنبل کا مرض لاحق رہا اسے تو کبھی حکیم یا ڈاکٹر نے اس قسم کا کراہیت انگیز علاج نہیں بتایا تھا۔ ارشاد حسین ہمیں اس پراسرار شیشیوں کے بارے میں بذات خود جگدیش سے تصدیق کرنی چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری باتوں میں وزن تو ہے۔''

گوپال نے سینہ پھیلا کر کہا کہ۔ ''میں جگدیش کو بلا کر ان پراسرار خونی شیشیوں کے بارے میں پتا کرتا ہوں۔ تم سارے چپ رہنا۔'' نارائن نے جگدیش کو بڑے اکھڑے لہجے میں آواز دے کر بلایا اور اس سے سختی سے پوچھا کہ۔ ''یہ تو کیا آئے دن خون کی شیشی لاتا ہے۔''

جگدیش نے افسردہ سا منہ بنا کر کہا۔ ''مجھے بچپن سے کالی چنبل کی پراسرار بیماری لاحق ہے۔ مجھے ایک حکیم نے اس بیماری کے علاج کے لئے کالے کوؤں کا تازہ خون ملنے کو کہا ہے۔''

''تو پاگل ہے یا تیرا حکیم جس نے تجھے ایسا بے کار کراہیت انگیز علاج بتایا ہے۔ بند کر اس بکواس کو۔'' گوپال بولا۔

وہ کچھ نہ بولا چپ کر کے اپنے بستر پر واپس چلا گیا۔ جبکہ سلمان اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

''مجھے تو اب بھی جگدیش کی باتوں پر یقین نہیں ہے۔'' گوپال نے کہا۔ ''جگدیش بڑا چالاک، گھناؤنا قسم کا انسان ہے۔ ارشاد حسین تم سلمان کو سمجھاؤ کہ وہ اس کے قریب زیادہ نہ رہے۔''

سلمان کو میں نے اپنے پاس بلا کر سمجھایا کہ۔ ''جگدیش کی حرکات وسکنات بڑی عجیب وغریب ہیں تم اس سے بچ کر رہنا۔'' سلمان نے میری بات سن کر برا مانتے ہوئے مجھ پر چڑھائی کردی کہ۔ ''آپ میرے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔''

میں نے بڑے پیار سے سمجھایا۔ ''جگدیش بہت پراسرار حرکات کررہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی ذات سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔''

سلمان غصہ سے اٹھا اور سیدھا جگدیش کے

www.pdfbooksfree.pk

پاس چلا گیا۔ وہاں دونوں آپس میں معمول کے مطابق گٹ پٹ، کان پھوسیاں کرتے رہے۔

گوپال نے ہم سب کو مشورہ دیا کہ صبح کنوٹ کیپٹن سورم (بیرک کا انچارج) کو جگدیش کی شکایت کریں گے۔ اس پر سب متفق ہوگئے تھے۔ رات کو ہم سارے ریکروٹ معمول کے مطابق سوئے تھے۔ اس زمانہ میں ٹھیک 8 بجے شب بیرک کی بتیاں بجھادی جاتی تھیں۔

صبح جب ہم سارے ریکروٹ جاگے تو سلمان اور جگدیش کے بستر خالی تھے۔ وہ دونوں موجود نہ تھے۔ فوری طور پر ان کی غیر موجودگی کا نوٹس لے لیا گیا۔ کیپٹن سورم نے فوری حاضری کا حکم دیا۔ حاضری بیرک کے گراؤنڈ میں ہوتی تھی۔ حاضری کے موقع پر سارے ریکروٹ موجود تھے۔ لیکن سلمان اور جگدیش غائب تھے۔ کیپٹن سورم نے پہلے انہیں بیرک کے اردگرد ڈھونڈوایا۔ باتھ روم، ڈائننگ ہال وغیرہ میں۔

''دونوں کہاں دفع ہوگئے؟'' کیپٹن سوام نے غصے سے اپنے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''مجھے وہ اگر مل گئے تو میں یقیناً ان کا کورٹ مارشل کردوں گا۔ یہ کیسے بلا اجازت بیرک چھوڑ گئے؟''

اور ویسے بھی بیرک کے آگے تقریباً 7 میل تک چاروں جانب پھیلا ہوا خطرناک گھنا جنگل تھا۔ وہاں جانا فوجی قانون کے مطابق سخت منع تھا۔ کنوٹ کیپٹن سورم نے فوری طور پر سب ریکروٹوں سے کہا۔ ''مجھے مشورہ دیں اور بتائیں کہ ان کے مطابق یہ دونوں کہاں جاسکتے ہیں؟ مجھے تو ان پر جاسوسی کرنے کا شبہ ہوتا ہے۔''

وہاں موجود سب نے اپنے اپنے انداز سے متضاد باتیں کیں۔ کوئی بھی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ بالآخر بیرک کے ایک ریکروٹ جو کہ سلمان کا پڑوسی تھا اس نے کہا کہ۔ ''میں نے رات کے تیسرے پہر یہ دیکھا تھا کہ جگدیش اپنے بستر کے نیچے پڑے ٹرنک میں سے کچھ چیزیں نکال رہا تھا۔''

کیپٹن سورم نے فوری طور پر اس کے ٹرنک کا تالا توڑنے کا حکم دیا۔ اس کے حکم کی فوری طور پر تعمیل ہوئی۔ ٹرنک کا تالا توڑنے پر اس کے اندر سے جگدیش کے زیر استعمال چند چیزوں کے ساتھ۔ دو تین ہندی زبان میں، جن کو قابو کرنے والی جادوئی کتب نکلیں۔ اور ایک موٹی سی کتاب ایسی نکلی جس پر کچھ خاص صفحات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ٹرنک کو اچھی طرح کھنگالا گیا تو اس کی ایک جانب خون کی ایک شیشی موجود تھی۔ جس میں سے خون رس رہا تھا۔ اس کے اردگرد خاکی لفافہ لپٹا ہوا تھا۔

کیپٹن سورم نے نارائن سے کہا۔ ''ان نشان زدہ صفحوں کو غور سے پڑھو۔'' تو نارائن نے پڑھنا شروع کیا۔ ''بیتل جن کو قابو کرنے کے لئے اس کی خوراک 9 پرندوں اور ایک انسان کے خون کی ضرورت ہوتی ہے۔'' دائرے کے اندر خون چھڑکنے کا ذکر بھی تھا۔ اس کے ساتھ ان صفحات میں لکھا تھا کہ۔ ''یہ عمل کسی ویرانے میں انتہائی خاموشی سے کیا جائے۔''

''او۔ مائی گاڈ یہ کوئی جاسوسی سے جڑا معاملہ نہیں ہے میں غلط تھا۔'' سورم نے کہا۔

پھر نارائن بولا۔ ''جگدیش لازماً سلمان کو بیوقوف بنا کر اسے اپنے عمل کی انجام دہی کے لئے لے گیا ہوگا۔''

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کیپٹن سورم کچھ لمحہ پریشانی کے عالم میں اس طرح ٹہلتا رہا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ ''یہ بہت خطرناک جنگل ہے۔ پورے 7 میل چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔ ان دونوں کو کہاں اور کیسے تلاش کیا جائے؟ یہ بہت برا ہوا۔'' کیپٹن سورم بڑبڑایا۔

''سر! وہ نہ صرف میرے گاؤں کے ساتھ کے علاقہ کا ہے بلکہ اس کے نانا نے مجھے اس کے بارے میں خصوصی تاکید کی تھی کہ اس کا خیال رکھنا۔''

''تو تم کیا چاہتے ہو؟'' کیپٹن سورم نے میری جانب مخاطب ہوکر کہا۔

''سر! آپ کے پاس اس جنگل کا نقشہ تو ہوگا۔'' نارائن نے کیپٹن سے کہا۔

''سب کچھ موجود ہے۔ لیکن میرے پاس جو نقشہ موجود ہے وہ سات میل کے علاقہ کو کور کرتا ہے۔ ہم انہیں کہاں تلاش کریں گے۔ اس نقشہ کے مطابق اس میں نہ جانے دریا سے نکلتے کتنے سوتے اور پگڈنڈیاں، کھائیاں، خودرو جھاڑیاں موجود ہیں۔ اب تم مجھے بتاؤ اس بیرک کے ریکروٹوں کو میں کہاں بھیجوں؟''

ایک ریکروٹ نے کہا۔ ''ہمیں تو دور جنگل سے خونخوار جانوروں کی آوازیں آتی ہیں۔ لہٰذا ہم انہیں تلاش کرنے نہیں جائیں گے۔''

کیپٹن سورم نے کہا۔ ''میں اگر تمہیں آرڈر دوں تو تمہیں ان دونوں کو تلاش کرنا پڑے گا۔''

''نہیں ہم نہیں جائیں گے۔ ہم کیوں خونخوار جانوروں کی خوراک بننے خطرناک جنگل میں جائیں۔'' بیرک کے ریکروٹوں نے یک زبان ہوکر بغاوتی رویہ اختیار کرلیا تھا۔

کیپٹن سورم نے کہا۔ ''میں ابھی وائرلیس پر ہیڈکوارٹر کرنل کمانڈ سے اس مسئلہ پر بات کرتا ہوں۔''

وہ ڈرامائی انداز میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ کافی دیر کے بعد وہ بڑی مایوسی کے عالم میں اپنے کمرے سے نکلا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک نقشہ پکڑا ہوا تھا۔ سب اس کی جانب بغور تجسس بھرے انداز میں دیکھنے لگے۔ اس نے بیرک کے تمام ریکروٹوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہوئے کہا۔

''ساتھیو! تمہارا یہ کہنا اپنی جگہ صحیح ہے کہ ٹریننگ سینٹر کے سامنے والا وسیع جنگل بہت خطرناک ہے اور وہاں جانا کوئی اماں جی کا کھیل نہیں۔ لیکن ان مسائل کے باوجود ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ سلمان اور جگدیش ہمارے ساتھی ہیں۔ ان کو تلاش کرنا ہمارا اخلاقی اور قانونی فرض ہے۔ لہٰذا میں تم سے اپیل ہی کرسکتا ہوں ان دونوں کو تلاش کرنے کے لئے وہاں کم از کم دو ٹیمیں جانی چاہیں۔ اور ہر ٹیم میں کم از کم 5 نوجوان ہوں۔

اس خطرناک جنگل میں جانے سے تقریباً سب نے انکار کردیا۔ کیپٹن سورم نے بمشکل دو ٹیمیں بنائیں، اس میں 4,4 جوان تھے۔ اس نے ان دو ٹیموں کو A&B قرار دیا۔ اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور ہم سب اراکین ٹیم سے اس پر دستخط کروائے۔

میں B ٹیم میں تھا۔ اس ٹیم میں میرے علاوہ نارائن گوپال اور ایک جوان اور تھا۔ نقشہ کی کاپی کیونکہ ایک تھی۔ اس لئے کیپٹن سورم نے ہمیں اچھی طرح سمجھایا (مثال کے طور پر) یہاں ندی ہے۔ کہاں گھنا جنگل ہے۔ نکلنے کا راستہ وغیرہ وغیرہ۔ اس نے یہ ساری باتیں ٹیم لیڈر کو ایک کاغذ پر لکھوادیں۔ مجھے B ٹیم کا لیڈر بنایا گیا تھا۔

کیپٹن نے دونوں ٹیموں کو کہا۔ ''تم لوگوں کو میں اس جنگل کے صرف چار میل اندر جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ اور ہاں جب تم محسوس کرو کہ تم لوگ زیادہ ہی خطرے میں ہو تو بیشک تم واپس آجانا۔''

ہم نے اپنا سفر جنگل کی جانب شروع کیا۔ ہماری حالت تھی کہ ہم میں سے کوئی نہ جانتا تھا کہ آگے کیا ہے۔ کھائی ہے یا کھڈا۔ ہم سارے بڑے پھونک پھونک کر اپنے قدم آگے کی جانب بڑھا رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہم گانے بھی گاتے آرہے تھے دراصل ایسا کرنے کے مندرجہ ذیل مقاصد تھے۔

پہلا یہ کہ جنگل میں موجود جانوروں کو باور کرانا تھا کہ جنگل میں وارد ہونے والا کوئی انفرادی شخص نہیں ہے بلکہ یہ ایک جماعت کی صورت میں ہیں۔ اس میں دل جوئی کے علاوہ آپس میں ایک ربط

www.pdfbooksfree.pk

کا عندیہ بھی تھا۔

ہم جوں جوں اپنی مخصوص رفتار سے آگے جنگل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ راستے مزید خطرناک ہوتے گئے تھے۔ ''لگتا ہے ہم پہلے افراد ہیں جو اس جنگل میں آئے ہیں۔'' نارائن نے مجھ سے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہی وجہ ہے کہ اس جنگل میں کہیں بھی انسانوں کی راہ چلتی کوئی پگڈنڈی وغیرہ کے نشان نہیں۔'' میں نے کہا۔

بہرحال ہم شام ڈھلنے تک جنگل کے اندر 4 میل کے اندر ہی گھس پائے تھے کہ ہمارے چوتھے ساتھی سنیل کو ایک خونخوار چیتا نما جانور نے دبوچ لیا۔ گوپال اور اس کے پیچھے چلتے نارائن نے بڑی سرعت انگیزی سے اس پر فائر کیا۔ چیتا نے اپنی گرفت سنیل پر سے چھوڑ تو دی۔ لیکن سنیل شدید زخمی ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ سے اس کا ادھڑا جسم دیکھ کر مجھے خوف آنے لگا تھا۔ وہ اتنی تکلیف میں تھا کہ اس نے ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''مجھے بھگوان کے واسطے گولی مار دو۔''

نارائن نے مجھ سے کہا۔ ''ارشاد حسین ان دونوں کا کھوج چھوڑ دو، سنیل مر رہا ہے۔ اسے ہمیں فوری طور پر بیرک لے کر جانا چاہیے۔ اور یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ بچ جائے گا کہ نہیں۔''

''میں نے حالات، واقعات کا جائزہ لے کر بیرک واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ۔ ''ہم سنیل کو ڈنڈا ڈولی ڈال کر اٹھاتے ہیں۔'' ابھی ہم چند منٹ ہوئے سنیل کو اٹھائے راستہ بدل کر واپس آرہے تھے کہ اچانک نارائن نے ہمیں آواز دی۔ ''وہ دیکھو سامنے۔'' میں نے اور گوپال نے چونک کر سامنے دیکھا وہاں واقعی تقریباً 200 گز کے فاصلے پر دونوں سلمان اور جگدیش نظر آئے۔

ہم نے وقتی طور پر زخمی سنیل کو زمین پر رکھا۔ نارائن نے کہا۔ ''اپنا سر نیچے کر کے لیٹ جاؤ تاکہ انہیں ہماری آمد کا علم نہ ہو جائے۔''

ہماری نگاہوں کے سامنے منظر یہ تھا کہ سلمان پیٹ کے بل اوندھا پڑا ہوا تھا۔ جبکہ جگدیش سلمان کے سامنے جھکے ہوئے سے انداز میں تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ میدان کے سامنے والی جگہ پر بہت چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جگدیش اپنے ہاتھ میں پکڑی کسی چیز کو زور زور سے زمین پر جھٹک رہا تھا۔

نارائن نے کہا۔ ''یہ یقیناً بوتل میں موجود خون کو زمین پر پھینک رہا ہے۔''

میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ یہ دونوں ہم سب سے کافی فاصلہ پر تھے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ہماری موجودگی کو بھانپ کر بھاگ جائیں۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح انہیں دبوچ کر پکڑنا چاہیے۔ اس کے لئے کم از کم 4 افراد ہونے چاہیے۔ فوجی نقطہ نگاہ سے ایک بندے کو قابو کرنے کے لئے دو افراد ضروری ہوتے ہیں۔ ہم تین تھے جبکہ ہمارا چوتھا ساتھی شدید زخمی تھا۔ اب نئی مشکل یہ تھی کہ ان دونوں کو قابو کرنے کے لئے فوری طور پر کوئی تدبیر کرنی تھی۔ اور یہ کہ اپنے زخمی ساتھی کو کسی محفوظ جگہ پر کیسے چھوڑا جائے۔

نارائن نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ۔ ''اگرچہ ہمارے پاس پستول موجود ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے جگدیش کے پاس بھی کوئی ہتھیار ہو۔''

گوپال نے اس موقع پر بہت اچھا مشورہ دیا کہ ادھر جا کر قریب سے ان کو پکڑا جائے اس کے لئے ہمیں اپنی پوزیشن سے کم از کم دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ زخمی سنیل کو اکیلا چھوڑنا بھی ہماری مجبوری بن گئی تھی۔ ہم تینوں نے اس سے ہٹ کر اس کے بارے میں باہمی مشورہ کیا۔ ہم تینوں نے یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ سنیل کو عارضی طور پر چھوڑنا پڑے گا۔

زخمی سنیل کے سانس اکھڑ رہے تھے، مجھے اس کی موت یقینی نظر آرہی تھی۔ میں نے اس وقت سوچا کہ جس مشن کے لئے ہم آئے تھے وہ ہمیں ہر قیمت پر پورا کرنا چاہیے میں نے دونوں سے کہا۔ ''ہمیں سنیل کو قدرت کے حوالے کر دینا چاہیے اور میں نے زخمی سنیل کو تسلی دی اور کہا۔ ''جگدیش، اور سلمان کو پکڑنا لازمی ہے۔ تم ہمارا انتظار کرنا چاہے جتنی دیر لگ جائے۔'' وہ مر رہا تھا لیکن اس نے انتہائی کرب میں مسکرا کر کہا۔ ''بھگوان تمہارے مشن میں مدد فرمائے۔'' ہم تینوں ساتھی اس سے گلے ملے۔ لہٰذا ہم تینوں نے فوجی حکمت عملی کے تحت اپنی پوزیشن سے پیچھے ہٹ کر اپنے آپ کو ان کے قریب کیا۔ اور اتنا قریب کیا کہ ہم انہیں چھپ کر بہ آسانی دیکھ سکتے تھے۔

اب ہماری نظروں کے سامنے یہ منظر تھا کہ ہم گھنی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ جھاڑیوں سے آگے کھلے میدان میں سلمان بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ جبکہ جگدیش اس کے اوپر جھکا ہوا تھا اور خاموشی سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔ میں نے گوپال اور نارائن کو اشارہ کیا کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کی ہوئیں ہیں۔ لہٰذا فوری طور پر اس پر جھپٹا جائے۔ میں نے ایکشن کی سیٹی ماری ہم تینوں برق رفتاری سے اس کی جانب لپکے۔ میں تو سلمان کے پاس گیا۔ جبکہ نارائن اور گوپال نے جگدیش کو دبوچا۔ مجھے ایسا لگا جیسے سلمان مر گیا ہے وہ بے سدھ پڑا تھا۔

وہاں دلچسپ اور عجیب بات یہ تھی کہ جب نارائن اور گوپال نے اسے دبوچا ہوا تھا تو وہ اس کے جسم کو صحیح طریقہ سے قابو نہ کر پا رہے تھے۔ جگدیش کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''اسے نیچے گراؤ۔'' نارائن نے کہا۔ ''اس کا جسم لکڑی کی مانند ٹھوس ہو چکا ہے۔ اس کے پاؤں انتہائی مضبوطی سے نہ جانے کیسے جمے ہوئے ہیں۔ کیا کیا جائے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے پاؤں میں گولی مارو۔''

نارائن نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی پستول کا فائر اس کی ٹانگ پر کر دیا۔

جگدیش نے اپنی آنکھوں کو بڑے اطمینان سے کھولا اور ایک زوردار مکہ نارائن کے منہ پر مارا۔ نارائن کسی فٹ بال کی مانند گھومتا ہوا دور جا گرا۔ میں نے پھر گوپال کو کہا۔ ''تم کچھ کرو۔''

گوپال نے جھنجلا کر کہا۔ ''پستول جب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تو میں کیسے اسے پچھاڑ سکتا ہوں۔''

جگدیش کی آنکھوں کے ڈیلے اب پوری طرح دہشتناک ہو گئے تھے، ان کو بغور دیکھنے کا ہم میں حوصلہ نہ تھا۔

سچی بات ہے میں بھی اپنے دیگر دونوں ساتھیوں کی طرح اپنا حوصلہ چھوڑ بیٹھا تھا۔

جگدیش نے ایک زوردار لات میری کمر پر ماری اور بڑے اطمینان سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''ارشاد میں جو چاہتا تھا میں نے سلمان کو بیوقوف بنا کر اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ لیکن میں اس کے دل کی خواہش ضرور پوری کروں گا جس کا اس نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔''

''کیسی خواہش؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے بڑی ڈھٹائی اور اطمینان سے بھاری آواز میں بولا۔ ''اب تو خود ہی دم توڑتے سلمان سے پوچھ لے۔'' اور یہ بول کر وہ گھنی جھاڑیوں میں برق رفتاری سے غائب ہو گیا۔ لیکن جاتے جاتے ایک زوردار مکا نارائن کے سر پر مار گیا۔ نارائن کی آنکھوں کے ڈیلے اس کی موت کی وجہ سے باہر آگئے تھے۔ میں نارائن کی جانب لپکا لیکن نارائن مر چکا تھا۔

بدحواسی کے عالم میں گوپال نے چلا چلا کر کہا۔ ''بھگوان کے واسطے ارشاد یہاں سے بھاگو۔''

www.pdfbooksfree.pk

میں بھی اس حالت میں پریشان ضرور ہوا تھا۔ لیکن میں نے اپنے اعصاب کو بکھرنے نہیں دیا تھا۔ میں اپنی ہمت کو یکجا کر کے سلمان کی جانب پلٹا۔ تو میں نے دیکھا سلمان اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے اپنی ذرا سی آنکھیں کھولیں۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہیں واپس بیرک لے کر جاؤں گا۔''

سلمان نے آہستہ آہستہ لبوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''ارشاد بھائی مجھے معاف کر دینا۔ آپ صحیح کہتے تھے جگدیش ایک چالاک، مکار، دغاباز شخص ہے۔ اس نے مجھے میرے مستقبل کے بارے میں سبز باغ دکھا کر کہا تھا کہ تیرے گھر کے مالی حالات بہت اچھے ہو جائیں گے۔ تو بس میرے ساتھ اس ویران جگہ آ کر وہ کر جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں۔'' اس نے اپنے مطلوبہ جن کو قابو کرنے کے لئے میرے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا ہے، کاش! میں تمہاری اور اپنے ساتھیوں کی بات مان جاتا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دم توڑ دیا۔

میں اس سے لپٹ کر پاگلوں کی طرح رونے لگا۔ ادھر گوپال کی دماغی کیفیت بھی غیر ہو گئی تھی۔ ہماری نظروں کے سامنے سلمان اور اس سے کچھ فاصلے پر نارائن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

ہم دونوں رونے کے بعد کافی دیر تک وہاں سکتہ اور پریشانی کے عالم میں بیٹھے رہے۔ جب روتے روتے کچھ صبر آیا تو، میں نے گوپال سے کہا۔

''جو ہونا تھا ہو گیا۔ جگدیش نے جو کام بیوقوف بنا کر سلمان سے لینا تھا اس نے لے لیا۔ گوپال کے ہوش بھی ٹھکانے آ گئے تھے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ۔

''اب اس وحشت زدہ ماحول، گھنے جنگل میں ہم دو زندہ بچے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد شام کے سائے مزید گہرے ہوں گے لہٰذا ہمیں فوری طور پر سنیل کے پاس جانا چاہیے اور پھر ہم واپس بیرک کی جانب جائیں گے۔ شاید وہ زندہ ہو۔''

''مشکل ہے۔'' میرے منہ سے نکلا۔ ہم دونوں نے دونوں لاشوں کو اسی میدان میں جوں کی توں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سلمان مردہ حالت میں بڑا معصوم سادہ لگ رہا تھا۔ میں اور گوپال جب سنیل کے پاس آئے تو وہ مکمل طور پر نقاہت اور زخموں کی وجہ سے بے ہوش تھا۔ جبکہ میں نے سمجھا کہ سنیل مر چکا ہے۔ مگر گوپال نے اس کے بے ہوش جسم کو اچھی طرح ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''ارشاد بھائی مجھے شک ہے اس کے جسم میں زندگی کی گرمی موجود ہے۔'' ہم نے اسے ڈنڈا ڈولی انداز میں اٹھایا اور بیرک کی جانب چل پڑے۔

راستے میں شدید اندھیرے کے ساتھ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔ میں اور گوپال خدا کے فضل و کرم سے سنیل کا بے ہوش جسم لے آنے میں کامیاب رہے۔ بیرک میں سنیل کو واجبی ٹریٹمنٹ دی گئی اور اسے پھر بڑے C.M.H ہسپتال بھیج دیا گیا۔ یہ بڑا معجزہ ہوا کہ وہ وہاں بچ گیا۔

جب دوسرے دن صبح صبح ہم کیپٹن سورم کی قیادت میں سلمان اور نارائن کی لاشیں لینے گئے تو اس جگہ جنگل کے مردہ خور جانوروں نے دونوں کی لاشوں کے گوشت کو نوچ نوچ کر کھا لیا تھا۔ ان کی لاشوں کی جگہ اب ہڈیوں کے پنجر پڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا اس جگہ ایک بڑا سا گڑھا کھود کر دونوں پنجر گڑھے میں دبا دیئے گئے اور ہم سب واپس بیرک میں آ گئے۔

چند سالوں کے بعد واقعی سلمان کے ننھیال میں نہ جانے کیسے دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی۔

بقول راوی کے اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے سلمان کی دی گئی قربانی کا معاوضہ ہو۔

شیطانی کھیل

ثاقب بشیر-لاہور

بچے کی آواز سنائی دی۔ "ماما! میرا کیا قصور تھا، میں کہاں غلط تھا میرا قصور بتادیں، میں مرجائوں گا، مجھے غم اس کا نہیں کہ آپ نے اولاد پر انسانیت کو ترجیح دی بلکہ خوشی اس بات کی ہے کہ میں شہید کا بیٹا اور عظیم ماں کی اولاد ہوں۔"

اندھا اعتماد کبھی کبھی انسان کو اندھے کنوئیں میں دھکیل دیتا ہے، ثبوت کہانی میں موجود ہے

وطن پر جان قربان کرنے والے کیپٹن طارق کا سوگوار گھر مالک کی میت کو تک رہا تھا، اور اصل قیامت تو نیلم کی زندگی پر ٹوٹی تھی کہ جس محبت اور رشتے میں بندھ کر وہ اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی وہی رشتہ اس کے سامنے لاش کی صورت میں پڑا تھا۔ آج حقیقی معنوں میں آسمان ٹوٹ کر اس پر آ گرا تھا، دو سال کا جنید ابھی باپ کے پیار سے نا آشنا تھا اور اب وہ کندھے ہی نہ رہے تھے کہ جن پر سوار ہو کر وہ خود کو ساری دنیا سے بلند محسوس کر سکتا تھا۔ کیپٹن طارق کی نڈھال ماں اسی سوچ میں تھی کہ بیٹے کے جواں لاشے کا ماتم کرے یا شہید کی ماں کہلانے کا فخر حاصل کرے۔

نیلم کی سہیلی سلونی اس کے بے جان ہوتے وجود کو سنبھال رہی تھی مگر اس گھر کا شاید اب کوئی پرسان حال

www.pdfbooksfree.pk

نہ تھا ہر آنکھ اشک بار تھی اور گھر کے در و دیوار اپنی ویرانی پر ماتم کناں تھے۔

نیلم اور اس کی بوڑھی ساس کے لئے اب صرف ایک ہی امید کا دیا تھا جنید..... وہ اس کا حتیٰ الامکان خیال رکھتیں اور اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔ نجانے کتنے دن بیت گئے مگر گھر میں موت کا سناٹا برقرار رہا آج کیپٹن طارق کی برسی تھی۔

سلونی نیلم کی پڑوسن تھی اور عزیز از جان سہیلی تھی۔ دونوں ساتھ کھیلیں، پڑھیں اور وائے قسمت بیاہی بھی پڑوس میں گئیں۔ خدا نے نیلم کو شادی کے دو سال بعد اولاد کی نعمت سے نوازا تو سلونی کی ساس کو بھی گھر میں ننھی قلقاریوں کی کمی محسوس ہونے لگی اس نے دن رات سلونی کو طعنے مارنے شروع کر دیئے اور اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ سلونی کا شوہر سانول کب تک گھر میں ہونے والی چخ چخ کو برداشت کرتا، آخر ایک دن اس کے اندر بھرا لاوا بھی پھٹ پڑا.....

ایک شام وہ گھر واپس آیا تو سلونی کو گھورتے ہوئے بولا "ماں نے تین سال تک انتظار کیا ہے مگر شاید وہ ٹھیک ہی کہتی ہے کہ بنجر زمین پر فصل نہیں اگا کرتی۔"

"مگر سانول خدا کی اس دیر میں میرا کیا قصور؟ کیا میں جان بوجھ کر ماں نہیں بننا چاہتی؟" سلونی نے روتے ہوئے کہا۔ سانول سر تھام کر بیٹھ گیا اور بولا "ماں نے کہا کہ اگر ایک سال کے اندر اندر بچہ نہ ہوا تو وہ میری دوسری شادی کر دے گی۔ اور میں بھی ماں کو نہیں روک پاؤں گا۔"

روتے روتے سلونی کی ہچکی بندھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سونے کے لئے لیٹ گئے۔ سانول تو سو گیا مگر سلونی ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مگر صبح ہونے سے پہلے وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی، ماسی اصغری سے ملنے کا.....

جب وہ اصغری کے گھر میں داخل ہوئی تو عجیب سی وحشت نے استقبال کیا۔ گھر کے در و دیوار سے نحوست ٹپک رہی تھی۔ اصغری پاس پڑوس میں کالے جادو والی مائی کہلاتی تھی۔ سلونی ویسے تو بہت ڈرپوک تھی مگر اولاد کی خواہش اتنی شدید تھی کہ اسے اس گھر میں کھینچ لائی۔ دو کمروں کا یہ گھر تاریک اور اجاڑ سا تھا۔ ایک کمرا اصغری کے ملاقاتیوں کے لئے مختص تھا۔ جب کہ دوسرے میں اس کی ایک بیٹی تھی۔ سلونی کمرے میں داخل ہوئی تو اصغری کی بیٹی کی جگہ ایک ایسی لڑکی کیٹی تھی جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے۔ وہ زندہ تو تھی مگر مُردوں سے بھی بدتر..... سلونی بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں اصغری آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے ایک پتلہ پڑا تھا جس میں سوئیاں ہی سوئیاں چبھی ہوئی تھیں۔ اگر بتی اور لوبان کا دھواں عجیب سا منظر پیش کر رہا تھا۔ سلونی اٹکتے ہوئے بولی "وہ تمہاری بیٹی..... اس کی آنکھوں سے خون..... وہ مر رہی ہے شاید۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں مرے گی، نہیں مرتی ایسی اولاد اتنی آسانی سے، اس کی سزا میرے گناہوں کی طرح ختم نہیں ہوگی کبھی" اصغری کی بھدی آواز گونجی۔

"مگر اسے ہوا کیا ہے؟" سلونی کی آنکھوں میں ابھی تک کچھ دیر پہلے والا منظر گھوم رہا تھا۔

"کالا جادو سیکھنے کی خواہش میں، میں چلے کیا کرتی تھی، قبرستانوں میں، ویران مکانات میں گئی اور بہت کچھ حاصل بھی کر لیا مگر اپنا خاندان کھو بیٹھی کیونکہ جنات صرف میرے تابع تھے قربانی چاہتے تھے اور میرے گھر والوں کے مخالف تھے۔ اس صورت میں مجھے ان کو رکھنا تھا یا گھر والوں کو اور میں نے جنات کو ترجیح دی، کرم جلی بھاگ ہی ایسے تھے میرے، پھر ایک ہفتے میں شوہر کی لاش ایسے ملی کہ وہ پنکھے پر لٹک رہا تھا۔ اگلی صبح اٹھی تو بیٹے کی لاش بستر پر خون میں لت پت پڑی تھی، اور بیٹی کا حال تمہاری نظروں کے سامنے ہے، جنات کے ذریعے دولت حاصل کرنے کا ایک جنون تھا جو مجھے لے ڈوبا۔" یہ کہتے ہوئے اصغری کی آنکھوں میں چھپی نمی سلونی سے چھپی نہ رہی۔

"کہیں جذباتی ہو کر میں غلط فیصلہ تو نہیں کر رہی" سلونی نے سوچا مگر پھر اپنے شوہر اور ساس کی کہی ہوئی

باتیں اسے پھر سے یاد آنے لگیں۔ "نہیں میں اولاد کے حصول کا عمل پوچھ کر ہی جاؤں گی۔" وہ دل ہی دل میں پختہ عہد کر کے بولی۔

"میری طاقتیں بتا رہی ہیں کہ تو اولاد کے لئے آئی ہے اور عمل جانے بغیر نہیں ٹلے گی۔ چل اس ڈبے میں تین ہزار ڈال دے۔" مائی اصغری بھی حال میں واپس آ چکی تھی۔

"مگر دیکھ! یہ راستہ بہت کٹھن ہے، گزر پائے گی تو اس آگ بھرے راستے سے" سوچ لے۔ "عمل کی خرابی تجھے لے ڈوبے گی۔" اصغری اسے سمجھانا تو چاہ رہی تھی مگر جب سمجھنے والا تیار نہ ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔

"میں اپنی سوچوں کو دفنا کر تمہارے پاس آئی ہوں۔" اٹل فیصلہ سلونی کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔

اصغری وظیفہ اور عمل سلونی کو سمجھانے لگی اس عمل میں جو غور طلب بات تھی وہ کسی دو سے تین سال کے بچے کا حصول تھا جو سلونی یا اس کے شوہر کے لئے مشکل تھا۔

گھر آ کر اس نے سانول سے بھی اصغری کے بتائے ہوئے چلے کی بات کی اور سانول جو کہ پہلے ہی ماں کی دھمکیوں اور طعنوں سے پریشان تھا۔ عمل کرنے کے لئے مان گیا۔ کیونکہ پیار تو وہ بھی سلونی سے بہت کرتا تھا اور اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

محلے کے چیدہ چیدہ لوگ ان کے گھر میں جمع تھے۔ سلونی بھی وہاں موجود تھی۔ نیلم کی آنکھوں میں آج پھر آنسو چمک رہے تھے۔ سلونی نیلم کو تسلیاں دے رہی تھی۔ نیلم اپنی غمگسار سہیلی کے سامنے بیٹھی تھی۔

سلونی اپنی سوچوں میں ہی مگن تھی کہ بچے کا انتظام کیسے کیا جائے۔ اچانک اس کی نظر جنید پر پڑی۔

"ہاں یہی ہے وہ بچہ جس کی مجھے تلاش تھی۔" اس لمحے وہ بھول چکی تھی کہ جس کالے علم کے لئے وہ اس معصوم کو استعمال کرنے جا رہی ہے وہ یتیم اس کی سب سے عزیز سہیلی کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ذاتی مفاد شاید ہر رشتے سے بڑا ہوتا ہے۔

وہ نیلم کے پاس گئی۔ "جنید اتنے مہمانوں میں گھرا ہوا گھبرا رہا ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں آج اسے اپنے گھر سلا لیتی ہوں۔" سلونی جنید کو اپنی گود میں اٹھاتے ہوئے بولی۔

"ہاں سلونی، یہ بھی تمہارا ہی بچہ ہے لے جانا۔" نیلم سلونی کی ممتا کے جذبے سے آگاہ تھی اس لئے اسے جنید کو لے جانے دیا۔

رات دو بجے کا وقت تھا ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ دو سائے تیزی سے پرانے قبرستان کی طرف بڑھ رہے تھے ان کی گود میں چادر میں لپٹا ہوا ایک بچہ تھا۔ پرانا قبرستان صدیوں پہلے متروک ہو چکا تھا۔ اندھیرا گہرا تھا۔ ایک کونے میں کھڑا بوہڑ کا گھنا درخت عجیب منظر پیش کر رہا تھا اس کی لمبی شاخیں زمین چھو رہی تھیں۔ درخت پر بیٹھے الو کی آنکھیں اندھیرے میں بھی چمک رہی تھیں جیسے وہ آنے والوں کے سواگت میں بیٹھا ہو۔ جیسے ہی وہ سائے قبرستان میں بوہڑ کے درخت کے پاس آئے تو اُلو خوفناک آوازیں نکالتا ہوا ایک طرف کو پرواز کر گیا۔ فضا میں پیدا ہونے والا سکوت عجیب گھٹن پیدا کرنے لگا تھا، اس بوہڑ کے درخت کے عین نیچے پرانے قبرستان میں ایک عیسائی کی تازہ قبر تھی جس پر رکھے گلاب کے گلدستے ابھی خشک نہ ہوئے تھے۔

وہ سائے سانول اور سلونی کے تھے جن کی گود میں بے ہوش کیا ہوا جنید تھا، جب کہ سانول کے پاس کچھ سامان بھی تھا۔ اس نے تھیلے سے پھاوڑا نکالا اور قبر کھودنے لگا۔ کچھ دیر بعد قبر کھل چکی تھی۔

"جنید کو ایک سائیڈ پر لٹا دو اور مردے کو قبر میں سے نکالنے میں میری مدد کرو۔" اس سائے میں مردے کی موجودگی کے خیال سے ہی سلونی کی روح فنا ہو رہی تھی اوپر سے سانول نے اسے مردہ نکالنے کا کہہ کر نیم مردہ کر دیا۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق سانول نے قبر میں اتر کر مردے کو اوپر اٹھایا اور سلونی نے اسے پکڑ کر کھینچ کر ایک سائیڈ پر رکھ دیا کفن میں لپٹی لاش کو چھوتے ہوئے سلونی کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

"حوصلہ رکھو سلونی، جہاں اتنا کچھ کر چکی ہو تو اب

www.pdfbooksfree.pk

اپنے حوصلے کو پست نہ کرو،" سانول نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں..... ہاں..... اچھا، میں ٹھیک ہوں سانول۔" خوف سلونی کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا۔

اب مرحلہ لاش کو درخت کے اوپر لے جا کر رسی کے ساتھ لٹکانا تھا، سلونی کی مدد کے ساتھ بالآخر سانول نے یہ مرحلہ بھی طے کرلیا۔ بوہڑ کے درخت پر لٹکتی لاش اور رات کا دوسرا پہر، بہت خوفناک منظر تھا۔ اگر عام حالت ہوتے تو سلونی کا دل ہی بند ہو جاتا مگر مسائل کے انبار سے وہ اس قدر گھبرا چکی تھی کہ بچے کے حصول کے لئے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ پھر سانول کے کہنے پر وہ بے ہوشی کی دوا کے زیر اثر جنید کو اپنی گود میں اٹھا کر لاش کے عین نیچے بالکل اس طرح بیٹھ گئی جیسے اکڑ گئی ہو۔ "اب میں لاش پر پانی گراؤں گا جو اس پر سے ہوتا ہوا تم پر اور جنید پر گرے گا۔ گھبرانا مت۔ اور وظیفہ جاری رکھنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سانول نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور درخت پر چڑھ گیا اور مردے کے پاؤں پر آہستہ آہستہ پانی گرانے لگا جو اس کے سر پر سے ہوتا ہوا سلونی اور جنید پر گر رہا تھا۔ سلونی آنکھیں بند کیے مسلسل وظیفہ کر رہی تھی مگر سخت پریشان تھی کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ بھول رہی ہے وظیفے میں۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور مسلسل پڑھتی رہی، وظیفہ ایک گھنٹے کا تھا۔

مردے کا سر سلونی کے سر کے عین اوپر تھا، ابھی وظیفہ پڑھتے پڑھتے بمشکل آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اچانک مردے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے جھٹکے لینے شروع کر دیئے۔ سلونی کا خوف سے برا حال ہو گیا۔ مگر سانول تھوڑا تھوڑا پانی مردے پر گرائے جا رہا تھا اچانک پانی کی جگہ خون سلونی پر گرنے لگا۔ ایک زوردار جھٹکے سے مردے نے اپنی آنکھیں دیں اور وہ جو الٹا لٹک رہا تھا اٹھ کر ہوا میں معلق ہو گیا۔

سلونی بت بن گئی اور اس کا سانس وہیں کا وہیں اٹک گیا۔ سانول نے وحشت زدہ سی چیخ ماری اور درخت سے نیچے آ گرا۔ اس نے سلونی کو دھکا دیا۔ "بھاگو سلونی، الٹا اثر ہو گیا ہے۔ یہ زندہ نہیں چھوڑے گا، ہمیں، اگر ہم یہاں رہے تو؟"

جیسے ہی سلونی اٹھی جنید اس کی گود سے زمین پر گر گیا، مگر وہاں ہوش کسے تھا، دونوں وہاں سے گاؤں کی طرف بھاگ گئے اور گھر آ کر سانس لیا مگر ان کے کانوں میں اب تک لاش کے بھیانک قہقہے گونج رہے تھے، جنید تو وہیں رہ گیا تھا۔

"یہ سب کیا تھا سانول، کیا ہو گیا، یہ سب....." سلونی نے کہا اور رونے لگی۔ "اب ہم کیا جواب دیں گے نیلم کو کہ جنید کہاں گیا؟" سلونی تڑپ کر بولی۔ "ہم نے تو سوچا تھا کہ بچے کو گود میں رکھ کر نہالوں گی تو وظیفہ اور عمل بھی پورا ہو جائے گا اور جنید کو واپس کر دیں گے مگر یہ تو عمل ہی الٹا ہو گیا۔ اب ہم کیا کریں گے۔"

سانول بھی پریشان تھا۔ "صبح گاؤں کے لوگوں کو ساری بات بتا کر وہاں لے جائیں گے، شاید جنید زندہ ہو۔" سانول نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا جس میں پریشانی واضح تھی۔

صبح اٹھ کر وہ کتنی ہی دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، حوصلہ نہیں تھا نیلم کا سامنا کرنے کا، آخر سلونی اٹھی اور سانول کا ہاتھ تھام کر بولی، ہم کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ دونوں بوکھلائے ہوئے سے نیلم کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو صحن میں نیلم ساس سے باتیں کر رہی تھی،

وہ، کچھ بتانا ہے تم کو نیلم، میری غلطی کی جو مرضی سزا مجھے دینا، میں نے جنید کو....." یہ کہتے کہتے سلونی رو پڑی۔

"ارے رو کیوں رہی ہو، کیا ہوا۔" تم خود جنید کو چھوڑنے نہیں آسکی تو، جنید آدھا گھنٹہ پہلے خود ہی گھر واپس آ گیا تھا، بہت خوش لگ رہا ہے، مگر پاگل تم کیوں رو رہی ہو؟"

"کک..... کک..... کیا؟ جنید گھر آ گیا، خود ہی" سانول بوکھلا گیا۔ سلونی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، اتنی دیر میں جنید بھی صحن میں آ گیا اور عجیب شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ سلونی اور سانول کو دیکھنے لگا۔

اب شیطانی کھیل کا آغاز ہو چکا تھا۔

"میں آنٹی سلونی کے گھر جاؤں گا۔" جنید نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"چلے جانا مگر پہلے کھانا تو کھا لو" نیلم کچھ دنوں سے جنید کی بے جا بڑھتی ہوئی ضد سے بہت پریشان تھی، مگر وہ پیار بھی تو اتنا کرتا تھا نیلم سے۔ سارا دن ماما، ماما کہتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔

رات کے ڈھائی بجے نیلم کی آنکھ کھلی تو جنید بستر سے غائب تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور ساس کو جا کر جگایا۔

"ماں جی! جنید گھر میں نہیں ہے، میں نے سارا گھر دیکھ لیا ہے۔" نیلم روتے روتے بولی۔

"کیا کہہ رہی ہو بہو، تمہارے کمرے میں ہی تو سویا تھا۔" ساس بے چاری شوگر کی مریضہ تھی دل پکڑ کر رہ گئیں۔ اچانک نیلم کو کچھ یاد آیا تو وہ چھت کی طرف دوڑی۔ اماوس کی رات میں ایک چھوٹا سا سایہ چھت کے آخری کونے میں کھڑا بھیانک سی ہنسی ہنس رہا تھا۔ وہ جنید تھا۔

"جنید وہ گھبرا کر آگے بڑھی۔ "یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اچانک جنید کی ہنسی رک گئی۔ اور جنید اجنبی سی نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا، تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا اور ماما کہتا ہوا نیلم کی طرف دوڑا اور اس کے ساتھ آ کر لپٹ گیا۔ نیلم نے اسے بانہوں میں بھرا اور نیچے لے آئی۔ نیچے آ کر وہ آرام سے سو گیا ہلکی روشنی میں اس کے چہرے سے چھلکتی معصومیت بہت بھلی لگ رہی تھی۔

جنید کے گھر سے دو گلیاں دور ایک گھر کے باہر پولیس کی وین کھڑی تھی۔ گھر میں پولیس اور محلہ داروں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا، اہل خانہ اور محلے دار سخت پریشان تھے کہ رات کو بھلا چنگا سونے والا شخص صبح مردہ کیسے ہو گیا تھا۔ منہ سے خون کی پتلی سی لکیر واضح تھی۔ "او جی..... یہ تو قتل کا سیدھا سادا کیس ہے، لگتا ہے مقتول کو زہر دے کر مارا گیا ہے، زہر کھانے میں ملا کر دیا گیا ہے یا کسی اور طریقے سے اس کا پتہ تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ہی لگے گا۔" تھانے دار نے ابتدائی کاروائی کے بعد کہا۔

"گھر کے افراد اکلوتے تفیل کو زہر کیوں دیں گے اور اس سیدھے سادے سے شخص کی کسی کے ساتھ باہر بھلا کیا دشمنی ہو گی، کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔ وہاں موجود ایک آدمی بولا۔ شام کو آنے والی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، نے سب کو بوکھلا کر رکھ دیا، ہر دل خوف سے لرز اٹھا۔ موت کی وجہ سینے سے دل کا غائب ہونا تھی۔ ہر کوئی پتھرا گیا۔

اب تو ہر دوسرے تیسرے دن کا معمول بن گیا کہ کوئی نہ کوئی لاش اس حالت میں ملتی کہ اس کا دل سینے سے غائب ہوتا، پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل چکا تھا۔ لوگوں نے گھروں کو تالے لگا کر سونا شروع کر دیا تھا۔ باتیں تو نیلم کے گھر تک بھی بہت پہنچی تھیں مگر نیلم کی پریشانی کی وجہ کچھ اور تھی، اب یہ اتفاق تھا یا کسی سانحے کی نشانی کہ جب قتل کی اس طرح کی کوئی واردات ہوتی تو جنید اس رات بستر سے غائب ملتا اور ڈھونڈنے پر ہمیشہ چھت کے اسی تاریک کونے پر کھڑا ہنستا ہوا نظر آتا۔

نیلم سخت پریشان تھی۔ ایک رات نیلم نے چھپ کر ساری رات جاگنے کا فیصلہ کیا تا کہ اس راز سے پردہ ہٹا سکے کہ "تین سالہ معصوم جنید کے اس بدلے ہوئے رویئے کے پیچھے وجہ کیا ہے؟"

رات کے دو بج رہے تھے، ہیٹر چل رہا تھا کمرے میں مکمل سکوت تھا بس کبھی کبھی ہیٹر کی سلگتی پلیٹوں کی چٹخنے کی آواز ماحول کو ہلکا سا بیدار کر دیتی۔

نیلم جاگ رہی تھی اور گہری نیند میں ڈوبے ہوئے جنید کو دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی "میرا اکلوتا سہارا کتنا معصوم لگ رہا ہے وہ بھلا کس طرح سے ان حادثات میں ملوث ہو سکتا ہے۔ شاید میں ہی غلط سوچ رہی ہوں۔" خود سے یہ کہہ کر وہ سونے لگی۔

اچانک اس نے تیزی کے ساتھ جنید کی آنکھیں کھلتی دیکھیں ایک خوف ناک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ نیلم نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں اور سوتی بن گئی لیکن پلکوں کی درز سے اس کی حرکات دیکھتی رہی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور چلتا ہوا کمرے سے سیڑھیوں

www.pdfbooksfree.pk

کی طرف بڑھا اور چھت پر اسی تاریک گوشے کی طرف چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ نیلم اسے دیکھ پاتی وہ اچانک غائب ہوگیا۔ نیلم ساری چھت پر چکراتی رہی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ کچھ تبدیلی آچکی ہے۔ جو طوفان لئے کھڑی ہے۔ اور وہ جنید کی اس تبدیلی کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔

وہ نڈھال سی ہوکر سیڑھیوں پر گر سی گئی۔ ایک تین سال کا معصوم بچہ کیسے سیکنڈوں میں غائب ہوسکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نیلم کی آنکھوں پر کسی نے ہاتھ رکھ دیئے "ماما" آپ مجھے ڈھونڈ رہی تھیں نا! جنید یہ کہتے ہوئے اس سے لپٹ گیا۔ نجانے وہ کس ٹائم واپس آگیا تھا۔ نیلم نے ایک تھکی ہوئی سی نگاہ جنید پر ڈالی اور اسے اٹھا کر نیچے آگئی۔

بہت دیر تک وہ سوچتی رہی مگر واقعے کی تہہ تک نہ پہنچ سکی۔

اگلی صبح سلونی کے گھر سے ماتم کا شور اٹھا۔ نیلم بھاگ کر وہاں پہنچی تو اس نے سلونی کو زاروقطار روتے ہوئے پایا۔ سانول مر چکا تھا۔ بالکل ویسی ہی پراسرار موت جس طرح پہلے محلے میں اموات ہوئی تھیں۔ اس کا بھی دل غائب تھا۔ آن کی آن میں سارا محلہ اکٹھا ہوگیا۔ قیامت صغریٰ برپا تھی۔ سلونی بار بار بے ہوش ہوجاتی۔ ہوش میں آتی تو بس ایک ہی بات بولے جاتی "جائز خواہش کا ناجائز طریقہ میرے شوہر کو بھی کھا گیا۔"

جنید روز باقاعدگی سے ماں کی انگلی تھامے وہاں آتا اور سلونی کو دیکھ کر اسی بھیانک انداز میں ہلکے سے مسکراتا رہتا مگر سلونی جنید کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کرتی تھی۔

سانول کے چہلم پر صبح سلونی اچانک ہی نیلم کے گھر چلی آئی۔ نیلم کے گلے لگی اور کہنے لگی۔ "میرا سانول آج بھی میرے خوابوں میں آتا ہے۔ نیلم میں نے اسے اکسایا تھا اس بات پر۔"

"کیا ہوا سلونی اتنے دنوں سے تم ایک ہی بات کیے جارہی ہو۔ ایسا غلط کیا ہوا تھا تم سے جس کا کانٹا آج بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے۔" نیلم نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"اولاد کی خواہش نے مجھے دیوانہ کردیا تھا اور میں صحیح اور غلط کا فرق بھی بھول گئی اور ماسی صغریٰ کے گھر کی حالت دیکھتے ہوئے بھی میں اس سے وظیفہ مانگ بیٹھی۔ کاش کہ میں ایسا نہ کرتی۔" سلونی پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ روتے روتے اس نے مذکورہ عمل اور اس کے نتیجے سے نیلم کو آگاہ کردیا۔ نیلم سکتے کے عالم میں کھڑی اس کی باتیں سنتی رہی۔

غصے کی ایک لہر اس میں اٹھی اور اس نے دھکے دیتے ہوئے سلونی کو گھر سے نکال دیا۔

آج وہ ادھورا سچ بھی پورا ہوکر اس کے سامنے آگیا تھا۔ جو کئی دن سے سانپ کی طرح کنڈلی مارے اس کے دماغ میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ سارا دن ویران نظروں سے جنید کو تکتی رہی کہ وحشت اور بربریت کی یہ داستان خدا جانے کب ختم ہوگی۔

نجانے کتنے لوگ ہوں جو اپنی کم عقلی کے باعث جعلی کالے علم والوں سے لٹتے ہیں اور جنہیں کوئی کالے علم والا میسر آبھی جاتا ہے تو اس کے ذریعے پوری کی جانے والی خواہش کیا رنگ لاتی ہیں وہ نتیجہ بھی اس کے سامنے تھا مگر نہ ان کم عقل لوگوں کو روکنا اس کے بس میں تھا اور نہ جنید کو روکنا جو معصوم شیطان کا روپ دھار چکا تھا مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو مجرم محسوس کررہی تھی، قتل ہونے والے تمام افراد کے قتل میں جنید سے زیادہ سانول اور سلونی کی غلطی تھی جنید تو معصوم تھا مگر تھا تو اس کا بیٹا، اور وہ اتنے سارے انسانوں کی زندگی داؤ پر نہیں لگانا چاہتی تھی اس نے اگلے ہی دن اپنے والد سے ملنے کا پروگرام بنا لیا جو تہجد گزار اللہ والے تھے اور نوری وظائف پر دسترس رکھتے تھے۔ شاید نیلم کے مسئلے کا حل وہی نکال سکتے تھے۔

"ایک انسان کا قتل ساری انسانیت کا قتل ہوتا ہے اور میرے جنید کے ہاتھ تو کتنے ہی انسانوں کے خون سے رنگ چکے ہیں کیا ان کا کوئی ازالہ ہوسکتا ہے؟" والد کے گلے لگتے ہوئے وہ سسک پڑی۔

"نہیں میری بچی! میں سمجھ سکتا ہوں کہ طارق کی شہادت کے بعد تم جنید کی آس پر زندگی گزار رہی تھیں مگر اب وہ سہارا خونی شیطان کے روپ میں ڈھل چکا ہے۔" انہوں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"ابا جان! لوگ کیوں قبروں میں آرام کی طلب میں سوئے مُردوں کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتے اور انہیں اتنا مجبور کردیتے ہیں کہ وہ بدلہ لینے پر آمادہ ہوجائیں۔"

بیٹا قبر تو قبر ہوتی ہے اور اس میں موجود روح بھی وجود رکھتی ہے، خواہ مسلمان کی قبر ہو یا عیسائی کی، مگر دنیا میں موجود لوگ روح کے تقدس کو بھی پامال کرنے سے نہیں کتراتے، تو اس طرح کے واقعات جنم لیتے ہیں اور معاشرے کے یہ زخم بالآخر ناسور بن جاتے ہیں۔

خیر میں تین دن کا وظیفہ تمہیں بتاتا ہوں جو اپنے گھر کے کسی بھی پرسکون گوشے میں مکمل یکسوئی کے ساتھ کرنا پھر اس روح کا خاتمہ ہوجائے گا مگر تمہیں اپنے دل پر پتھر رکھنا ہوگا یعنی تمہیں اولاد یا انسانیت میں سے ایک کو چننا ہوگا۔ پھر تم اس سے اس کی واپسی کا طریقہ معلوم کرنا، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ انہوں نے اسے ضروری ہدایات دیں اور پھر نیلم اٹھ کر گھر چلی آئی۔

"ماما آگئی! ماما جی آگئی۔" جنید نے نیلم کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا کہ لپک کر آیا اور اس کے گلے لگ گیا تبدیل تو وہ صرف دنیا کے لئے ہوا تھا ماں سے اس کا پیار اور بھی بڑھ گیا تھا۔ سارا دن نیلم کے پاس بیٹھا رہتا اور میٹھی میٹھی زبان میں باتیں کیے جاتا، اس کی دنیا بس ماں سے شروع ہوکر ماں پر ہی ختم ہوتی تھی۔ نیلم کو اس نے کبھی تنگ نہ کیا تھا حالانکہ جب اسے دورہ بھی پڑتا تو اسے نقصان پہنچائے بغیر ہی باہر نکل جاتا مدہوشی اور لاابالی پن میں بھی وہ ماں کی محبت کو نہ بھلا سکا تھا یا شاید اس پر موجود بدروح کو ایک ماں کے تقدس کا خیال تھا۔

گھر آکر نیلم نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ سارے محلے کے گھروں میں پیغام بھیجا کہ "آفت سے بچنے کے لئے اپنے گھر کے دروازوں پر آیت الکرسی لٹکا دیں تاکہ وہ چیز جو لوگوں کو قتل کرتی ہے بابرکت کلام کے باعث گھروں میں داخل نہ ہوسکے۔

رات بارہ بجے نیلم کی ساس اور جنید سوگئے تو نیلم کمرے سے باہر صحن میں آکر ایک حصار بنا کر بیٹھ گئی اور وظیفے میں مشغول ہوگئی۔ آنکھیں بند کیے وہ ورد کیے جارہی تھی کہ اچانک اسے لگا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے، اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے جنید کو بیٹھے پایا جو معصوم سی ہنسی لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ اذانوں تک وہ وظیفہ پڑھتی رہی اور جنید بس نثار ہوجانے والی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس لمحے وہ بہت معصوم لگ رہا تھا۔

اگلا سارا دن وہ اس کے ساتھ رہا اور اسے منع کرتا رہا، ماما آپ رات کو نہ جاگا کرو، آپ سو جایا کرو، ماما وہ مجھے مارے گا۔ نیلم آگے بڑھی اور اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

آج دوسری رات تھی بارہ بجے نیلم کی ساس تو سو چکی تھی، مگر جنید نہیں سو رہا تھا بہت مضطرب لگ رہا تھا۔ نیلم اسے کمرے میں چھوڑ کر اٹھی اور باہر حصار بنا کر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد جنید آکر حصار کے سامنے کھڑا ہوگیا آج اس کی آنکھوں سے غصہ چھلک رہا تھا اور اپنی بدلی ہوئی آواز میں بولا "تم ماں ہو اس بچے کی، جس کے جسم پر میں قابض ہوں اور ماں کی میں قدر کرتا ہوں مگر تمہارے لئے بہتر ہے کہ وظیفہ چھوڑ دو، ورنہ تمہارے بیٹے کو بہت اذیت برداشت کرنا پڑے گی۔" نیلم آنکھیں پھاڑے اس کے بدلے ہوئے لہجے کو سن رہی تھی مگر وظیفے میں مصروف رہی اچانک جنید کی ہیئت بدلنے لگی، چھوٹی چھوٹی ٹانگیں اور اس کے دھڑ، نارمل انسان کی طرح نقوش تو انسانی تھے مگر ان میں وحشت بھری ہوئی تھی کہ نیلم لرز اٹھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ واپس جنید بن گیا اور اڑتا ہوا سامنے دیوار میں جالگا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور زور زور سے وہ رو رہا تھا پھر یکا یک اس کے بازوؤں کی جلد ادھڑنا شروع ہوگئی اور گوشت لٹک گیا صرف بازوؤں کی ہڈیاں رہ گئیں۔ جنید اذیت سے چلا جارہا تھا۔

اچانک نیلم کی ساس شور سن کر کمرے سے باہر نکلی تو وہ اڑا اور اپنا نوکیلا ہاتھ، ساس کے منہ میں ڈال کر دل نکال لیا، وہ بے چاری ہکا بکا ہی موت کی آغوش میں چلی گئی۔ نیلم اسے بچانے کے لئے حصار سے نکلنے لگی تو اسے یاد آیا اگر وہ وظیفہ ادھورا چھوڑ دے گی تو اس کا مقصد ہی ختم ہوجائے گا اور پتہ نہیں یہ خونخوار اور کتنے لوگوں کا خون اپنے

www.pdfbooksfree.pk

ہاتھوں سے کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ پھر سے وظیفہ پڑھنے میں مصروف ہوگئی مگر اس بار آنکھوں سے بہتا پانی روکنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اگلے دن ان کے گھر سے ایک اور جنازہ اٹھا مگر فرق صرف اتنا تھا کہ اب نیلم گناہ گار کو جانتی تھی اور اسے کیفر کردار تک پہنچانے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔

آج تیسری رات تھی۔ رات بارہ بجے کے بعد حسب معمول جب نیلم نے وظیفہ شروع کیا تو جنید پھر اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”ماما آپ یہ سب نہ کرو، دیکھو مجھے بہت تکلیف ہوئی ہے، ماما، میرے بازو دیکھو! مجھے بہت درد ہوتا ہے، جب آپ پڑھتی ہو۔“ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بازو پھیلائے تو ان پر لگے زخم نیلم کو تڑپانے لگے مگر وہ بدستور وظیفے میں مشغول رہی۔

”میرا کیا قصور ہے ماما کیوں حد درجہ اذیت میرا مقدر کر دی گئی ہے۔“ پھر جنید کی آواز بدلتی گئی اور ایک اجنبی سی آواز گونجی ”مجھے اس وقت بھی بہت درد ہوا تھا جب میری لاش کو بھی قبر سے نکال کر اس کی بے حرمتی کی گئی تھی، اسے درخت کے ساتھ الٹا لٹکایا گیا تھا، کیا بگاڑا تھا میں نے ان لوگوں کا جو انہوں نے میری روح کو اذیت سے دوچار کیا، میں بدلہ نہ لیتا تو اور کیا کرتا۔“ اس اجنبی کی آواز میں وہی سوز تھا جو جنید کی آواز میں تھا، پھر وہ چپ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وظیفے کا دورانیہ ختم ہوا تو ہر طرف سکوت چھا گیا۔ اجنبی بدروح اب غلام بن چکی تھی۔

”مبارک ہو! ایک ایسی روح پر قبضہ کرنے کے لئے جو بیک وقت ظالم بھی تھی اور مظلوم بھی۔“ جنید کے منہ سے آواز نکلی۔

”دیکھو! میں صرف تمہاری پر امن واپسی چاہتی ہوں، مجھے بس اس کا طریقہ سمجھاؤ۔“ نیلم نے اسے مطمئن پا کر پہلا سوال یہی پوچھا۔

”میری واپسی اس جسم کے خاتمے پر مشروط ہے کہ جس میں میری روح مقید ہے، میں اپنی مرضی سے اس جسم کو اب نہیں چھوڑ سکتا اور نہ ہی اس معصوم کا خاتمہ چاہتا ہوں۔“

”یہ..... یہ کیا..... کہہ رہے ہو تم؟ کیا اس معصوم کی اذیت یہاں تک کافی نہیں جو تمہارے ہاتھوں وہ پہلے ہی اٹھا چکا ہے۔“ نیلم پھنکارتے ہوئے بولی۔

”قدرت کے اصولوں کو جب توڑنے کی کوشش کی جائے تو اس کا بھگتان بھی بھگتنا پڑتا ہے۔“

نیلم کے وجود میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اسے اب اس موڑ پر انسانیت یا اولاد میں سے کوئی ایک چیز چننی تھی۔ جنید اس کا آخری سہارا اور جینے کی آخری امید تھا مگر دنیا کے لئے اس کی موجودگی ایک قہر تھا۔ بالآخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ نیلم کی آنکھیں اب پتھرا چکی تھیں۔

وہ اٹھی اور چلتی ہوئی کچن میں گئی اور دودھ کے ایک گلاس میں فنائل کی گولیاں ملا کر خون برساتی بھیگی اداس آنکھوں کے ساتھ لے آئی اور وہ گلاس جنید کے سامنے رکھ دیا۔

جنید نے ایک زخمی سی نگاہ ماں پر ڈالی اور سارا دودھ پی گیا۔ جنید اور اجنبی بدروح کا خاتمہ نیلم کے سامنے تھا۔ ”ماما! میرا کیا قصور تھا، سلونی آنٹی کی خواہش، لاش کی بے حرمتی اور پھر اس کا بدلہ..... میں کہاں غلط تھا، مجھے میرا قصور بتا دیں نا ماما، میں ہنستے ہنستے مر جاؤں گا۔“ بولتے بولتے جنید کے دائیں ہونٹ کے کنارے سے خون کی ہلکی سی لکیر نکلی، حالات نے اسے وقت سے بہت پہلے بڑا کر دیا تھا یا وہ روح جنید کے لئے اپنی بے بسی اور جنید کی لاچاری کا اظہار کر رہی تھی۔ ”ماما مجھے غم اس کا نہیں کہ آپ نے اولاد پر انسانیت کو ترجیح دی بلکہ خوشی اس بات کی ہے کہ میں شہید کا بیٹا اور عظیم ماں کی اولاد ہوں۔ اچھا ماما! پاپا مجھے لینے کے لئے آ گئے ہیں۔ الوداع ماما۔“

آج بھی شام نگر کی گلیوں میں ایک شہید کی بیوہ اور ایک عظیم ماں پھرتی نظر آئے گی جو ہوش و حواس سے بیگانہ ہے۔ مگر اس کی قربانی سے اس کے ماں، باپ اور سلونی کے علاوہ کوئی واقف نہیں۔

آسیبی حویلی

قاسم رضا۔ چنیوٹ

ایک کمرے میں بیٹھ کر عامل نے جونہی جنتر منتر پڑھنا شروع کیا کہ اچانک کان پھاڑ دینے والی چنگھاڑ کی مانند ایک آواز گونجی اور پھر وہ عامل ہوا میں معلق ہوا اور بڑی تیزی سے اڑتا ہوا کمرے سے باہر آن گرا.....

خوف کی پگڈنڈی پر رواں دواں جسم و جاں پر لرزا طاری کرتی لہولہان خونی کہانی

سکندر کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا کہ سر میں لگنے والی چوٹ سے شاید اس کی بینائی چلی گئی ہے۔ اور پھر اسے اپنی بہن سوہنی کا خیال آیا۔ جانے کون لوگ تھے وہ نقاب پوش۔

سوہنی اور سکندر چوہدری امجد بیگ کے گاؤں میں رہتے تھے۔ چوہدری امجد بہت رحم دل اور غریب پرور چوہدری تھا۔ اس کے گاؤں میں کافی امن و امان تھا۔ چوہدری امجد کا بیٹا جمال بھی بالکل اسی پر گیا تھا۔ گاؤں میں جوان لڑکیاں دن گئے تک کھیلتی رہتیں مگر مجال ہے جو کسی کو آنکھ اٹھانے کا حوصلہ ہو۔ ایک دفعہ ایک جوان نے جوانی کے جوش میں ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا تو جمال نے اسے وہ پیٹا کہ اب ہر شخص کسی بھی لڑکی کی طرف دیکھنے سے پہلے سو بار سوچتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

سکندر کی بہن سوہنی گاؤں کی جان تھی۔ تمام لڑکیوں میں وہ خوبصورت تھی۔ اور اس کی تمام سہیلیاں اس پر اور اس کے خداداد حسن پر رشک کرتی تھیں۔ گاؤں میں امن ہونے کی وجہ سے ہی سوہنی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کافی دور دور تک چلی جاتی اور شام گئے گھر لوٹتی۔

مگر اس دن شام سے پہلے ہی سوہنی کی سہیلیاں بھاگتی ہوئی سوہنی کے گھر آئی تھیں۔ اور انہوں نے سوہنی کے باپ بلاول کو بتایا کہ چند نقاب پوش سوہنی کو اٹھا کر اسٹیشن کی طرف لے گئے ہیں۔ سکندر یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہوگیا اور بغیر کچھ کہے سنے گھر سے نکل گیا۔ اسٹیشن سے تھوڑی دور ہی تھا کہ اسے سوہنی کی آواز سنائی دی۔ اس نے دیکھا وہ چار نقاب پوش تھے جو اسے گھسیٹتے ہوئے دور کھڑی جیپ کے پاس لے جانے کی کوشش کررہے تھے۔ ایک نے سوہنی کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور سوہنی ان سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کررہی تھی۔ سکندر کا یہ دیکھ کر خون کھولنے لگا۔ وہ گاؤں کا دلیر نوجوانوں میں گنا جاتا تھا۔ کئی کشتی کے مقابلے جیتے تھے اس نے۔ دس بارہ جوان تو اس کے لئے کچھ بھی نہ تھے۔ اور یہ تو صرف چار تھے۔ اس حالت میں وہ سینکڑوں بھی ہوتے تو سکندر اس کی پرواہ نہ کرتا۔ اپنی بہن اس کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا خون رگوں میں پارے کی طرح دوڑنے لگا۔ اس نے ان چاروں کو للکارا اور بجلی کی طرح دوڑتے ہوئے ان چاروں کے سر پر پہنچ گیا۔ سوہنی کی آنکھوں میں خوشی کے چراغ جل اٹھے۔ اور وہ نقاب پوش کی ڈھیلی ہوتی گرفت سے خود کو چھڑا کر اپنے بھائی کے سینے میں جا چھپی۔ اس وقت سکندر کی بانہوں کے علاوہ اس کے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ وہ بھائی کی بانہوں میں خود کو بہت محفوظ محسوس کررہی تھی۔ سکندر نے اسے تھپکی دی اور اسے اپنے سے علیحدہ کیا۔

ایک زوردار جمپ کے ساتھ وہ ایک نقاب پوش پر جا پڑا۔ اس کی پھیلی ہوئی ٹانگیں اس نقاب پوش کی گردن پر پڑیں اور قینچی کی طرح بند ہوتی ہوئی گھوم گئیں۔ کڑک کی آواز کے ساتھ دونوں زمین پر گرے اور گرتے ہی سکندر اسپرنگ کی طرح اچھلا اور سیدھا کھڑا ہوگیا جبکہ نقاب پوش مڑی ہوئی گردن کے ساتھ زمین پر ہی پڑا تھا۔ یقیناً اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ اور پھر اچانک ہی تینوں نقاب پوشوں کو جیسے ہوش سا آ گیا۔ ایک نقاب پوش لمبی زقند بھر کر سکندر پر جھپٹا۔ سکندر اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلا۔ جیسے ہی نقاب پوش اڑتا ہوا سکندر کے قریب آیا سکندر نے اسے اپنے دونوں بازوؤں پر جھپٹ لیا۔ اور پھر سر سے بلند کر کے اسے اپنے مڑے ہوئے گھٹنے پر دے مارا۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی اور دوسرا نقاب پوش بھی ریڑھ کی ہڈی تڑوا کر بے کار ہوگیا۔ مگر اس اثناء میں پیچھے کھڑے نقاب پوش نے جانے کہاں سے ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھایا اور وار کردیا۔

"بھیا بچو! سوہنی کے چیخنے اور سکندر کے بچنے سے پہلے ہی زوردار چوٹ سکندر کی کنپٹی پر پڑ چکی تھی۔ اور پھر نقاب پوش نے دوسرا وار اس کے سر کے اوپر کیا۔ سکندر اپنے ہوش وحواس سے بے گانہ ہوگیا۔

اور اب اسے ہوش آیا تھا تو وہ ہر طرف اندھیرا محسوس کررہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ادھر ادھر ٹٹولنا شروع کیا۔ تو ایک اور جسم اس کے ساتھ ہی پڑا تھا۔ سکندر نے اسے ٹٹولا تو بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ لگتے ہی اسے معلوم ہوا کہ یہ کسی آدمی کا جسم تھا۔ اسے اچانک یاد آیا کہ اس کی ہینڈواچ میں بھی لائٹ تھی۔ یہ گھڑی سوہنی نے اسے ایک کشتی کا مقابلہ جیتنے پر تحفے میں دی تھی۔ اس کی لائٹ ایک ننھے سے بلب سے نکلتی تھی۔ جس کا بٹن گھڑی کے ایک کونے پر تھا۔ یہ بھی باریک سا بٹن تھا۔ سکندر نے بٹن دبایا روشنی ہوتے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا وجہ معقول تھی۔ وہ ایک قبر تھی جس میں وہ زندہ دفن کردیا گیا تھا۔

سکندر نے روشنی کا رخ سات پڑے آدمی کی طرف کیا تو وہ بھی کسمسا رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی ہوش میں آ گیا اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سکندر بولا۔ "تمام باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہاں سے نکلنے کا سوچو۔ اگر ہم اسی طرح اس قبر میں

بند رہے تو کچھ دیر میں آکسیجن ختم ہوجائے گی اور ہم زندہ دفن ہوجائیں گے۔" پھر سکندر قبر کا معائنہ کرنے لگا۔

قبر کے اوپر سیمنٹ کی سلیں رکھی ہوئی تھیں۔ سکندر نے سل پر دونوں ہاتھ جمائے اور پاؤں کی ٹیک سے پورے زور کے ساتھ سل کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ سل بمشکل تین انچ اوپر ہوسکی تھی۔ اوپر پڑی مٹی سل کے ہٹنے سے نیچے گرنے لگی۔ سکندر نے آنکھیں بند کرلیں اور سائیڈ پر گر کر ہانپنے لگا۔ گھٹن آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

"اگر یہاں سے زندہ نکلنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ مل کر زور لگاؤ۔" سکندر نے چیخ کر کہا اور دوبارہ نئے عزم سے سل پر ہاتھ جمادیئے۔ مٹی اب بھی نیچے گر رہی تھی جس کی وجہ سے سکندر نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اور پھر اجنبی بوڑھا بھی اس کی مدد کرنے لگا۔

دونوں نے زور لگایا تو سل آدھی اوپر اٹھ گئی مٹی دھڑا دھڑ قبر میں گر رہی تھی۔ ان کے کپڑے منہ اور جسم مٹی سے بھر چکے تھے۔ دونوں نے آنکھیں اور سانس بند کر رکھی تھیں۔ اور پھر جینے کی جدوجہد میں دونوں نے اپنی پوری طاقت لگا دی، سل ایک جھٹکے سے اوپر ہوئی تو مٹی کا آبشار نیچے بہہ نکلا۔ دونوں نے سر نیچے کرلئے۔

سکندر جانتا تھا کہ وہ اگر اس مٹی میں دفن ہوگیا تو پھر کبھی نکل نہ پائے گا اس لئے جیسے جیسے مٹی گر رہی تھی وہ اپنے ہاتھوں سے اسے ہٹا کر پاؤں کے زور پر اوپر اٹھ رہا تھا اور پھر جیسے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔ ستاروں کی مدھم روشنی قبرستان میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سکندر کو بوڑھے کا خیال آیا۔ سکندر خود بھی اس وقت گھٹنوں سے اوپر اوپر مٹی میں دبا ہوا تھا۔ اس نے زور لگا کر خود کو باہر نکالا۔ قبر کے ساتھ ہی قبر کھودنے کے اوزار پڑے تھے۔ اس نے جلدی جلدی باقی قبر پر پڑی مٹی ہٹائی۔ قبر میں گرنے کی وجہ سے مٹی تھوڑی سی رہ گئی تھی جو چند سیکنڈ میں ہٹ گئی اس نے دوسری سل بھی ہٹا دی اور قبر میں اتر گیا۔ ہاتھوں سے جلدی جلدی مٹی ہٹائی اس کام میں اسے ایک منٹ سے زیادہ نہ لگا۔ بوڑھے کے جسم سے مٹی ہٹا کر اس نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالا۔

تازہ ہوا میں سانس لینے سے سکندر کی توانائی عروج پر تھیں اس نے ایک جھٹکے سے بوڑھے کو اٹھا لیا اور قبر سے باہر لٹا دیا۔ اس کے بعد وہ خود بھی قبر سے نکل آیا۔ بوڑھے کی نبض اور دل کی دھڑکن بند ہوچکی تھی۔ سکندر نے آخری کوشش کے طور پر اس کا منہ کھول کر اپنے منہ سے سانس دی اور پھر اس کے سینے پر مخصوص انداز میں دونوں ہاتھوں سے دباؤ ڈالا۔ یکے بعد دیگرے یہ عمل کرنے سے اس کی جدوجہد رنگ لائی اور بوڑھا زور سے کھانستا ہوا ہوش میں آ گیا۔ سکندر نے سہارا دے کر اسے سیدھا بٹھا دیا۔ بوڑھا کافی دیر لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد بولا۔ "کیا ہم زندہ ہیں؟"

"ہاں وہ دو نہیں چار تھے۔ دو کو میں نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔" اور پھر سکندر نے اسے ساری تفصیل بتا دی۔ "میں نہیں جانتا کہ وہ چاروں کون تھے۔ میں تو اپنی بہن کو بچانے کے لئے آیا تھا مگر اسے بچا نہیں سکا۔ نہ جانے سوہنی کہاں ہے.....؟" سکندر نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"بیٹا میں تمہارا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔ خدا تمہاری بہن کی حفاظت کرے۔" بوڑھے نے اسے تسلی دی۔ سکندر نے اپنے آنسو صاف کئے اور بولا۔

"بڑے صاحب! آپ کو کس لئے ان لوگوں نے اس قبر میں دفن کیا۔ آپ کی کیا دشمنی تھی ان سے؟"

"جس طرح تمہاری ان سے کوئی دشمنی نہیں تھی اسی طرح میری بھی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اور جو شیطان کے پجاری ہوتے ہیں ان کو دشمنی کے لئے وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان کی نیکی ہی ان لوگوں کے لئے دشمنی کا سبب بن جاتی ہے۔" بوڑھے نے مبہم سے انداز میں کہا۔

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟" سکندر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ جو تمہیں یہاں دفن کرنے آئے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

ان پر میری نظر پڑ گئی۔ میں اس قبرستان کا گورکن ہوں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ایک زندہ انسان کو دفن کرنے والے ہیں تو میں نے انہیں روکا۔ وہ مجھے پیسوں کا لالچ دینے لگے مگر ایک انسان کی جان بہت انمول ہوتی ہے۔ اس کی قیمت کوئی نہیں لگا سکتا۔ میں نے انہیں پولیس کی دھمکی دی تو ایک نقاب پوش نے بیلچے سے میرے سر پر وار کیا پھر مجھے ہوش نہیں رہا اور آگے کی تمام روداد تمہیں پتا ہے۔"

"سکندر حیرت سے بوڑھے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اسے نفسانفسی کے دور میں بھی کوئی اپنی جان پر کھیل کر دوسرے کی جان بچا سکتا ہے۔

"بڑے میاں! آپ نے ان لوگوں کے ساتھ میری بہن کو نہیں دیکھا؟" سوہنی کا خیال آتے ہی سکندر نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں وہ دونوں تمہیں اٹھا کر قبرستان میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی جیپ باہر کھڑی تھی۔ شاید تمہاری بہن کو انہوں نے جیپ میں ہی رکھا ہوا ہو۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"اچھا مجھے اجازت دیں میں نے گھر والوں کو بھی اس حادثہ کا بتانا ہے اور پولیس میں رپورٹ بھی کروانی ہے۔" سکندر نے عجلت میں اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ نہ جانے سوہنی کس حال میں ہوگی۔ اسے اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اس کے سامنے وہ لوگ اس کی بہن کو اٹھا کر لے گئے مگر وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس نے اپنی حالت پر غور کیا۔ وہ مٹی سے لتھڑا ہوا اس وقت کسی بھوت کی طرح لگ رہا تھا مٹی نے اس کے چہرے کے نقوش بھی چھپا لئے تھے۔ سکندر نے اپنا رخ گاؤں کے ایک حوض کی طرف کر لیا۔ فصلوں کو پانی اسی ٹیوب ویل سے دیا جاتا تھا۔ اس وقت ٹیوب ویل بند تھا مگر سکندر کے اندازے کے مطابق حوض میں اتنا پانی تو موجود ہونا چاہیے تھا کہ اس کے جسم کی مٹی اتر جائے۔ وہ حوض سے ہو کر گھر جانے کا ارادہ کر چکا تھا اور پھر تیز تیز قدموں سے وہ حوض کی طرف بڑھنے لگا۔

☆.....☆.....☆

شہر سے ذرا ہٹ کر وہ حویلی گاؤں کے چوہدری امجد نے بنوائی تھی مگر کچھ عرصے سے وہ حویلی ویران پڑی تھی۔ کسی وقت اس حویلی میں چوہدری امجد کے ملازم رہتے تھے۔ اور خود چوہدری امجد اور اس کے گھر والے شہر میں آتے تو یہاں ٹھہر جاتے تھے۔ مگر کچھ عرصہ پہلے کے ایک خوفناک واقعے کی وجہ سے وہ حویلی بالکل ویران ہو چکی تھی۔ چوہدری امجد کے دو ملازم خوفناک موت کا شکار ہو چکے تھے۔ ان کی گردنیں پیچھے کی طرف مڑی ہوئی تھیں اور ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹی ہوئی تھی جیسے کسی شکنجے میں جکڑ کر توڑا گیا ہو۔ اس حویلی میں کل چار ملازم تھے۔ دو مر چکے تھے اور دو دہشت زدہ ہو کر بھاگ چکے تھے۔

چوہدری امجد نے ان کا بہت سراغ ڈھونڈا مگر کوئی سراغ نہ ملا اس نے آخر کسی عامل کو بلایا اور حویلی میں رہنے والے آسیب کو بھگانے کی کوشش کی۔ عامل اکیلا حویلی کے اندر گیا مگر آدھے گھنٹے کے بعد عامل کی لاش مڑی ہوئی گردن کے ساتھ اڑتی ہوئی چوہدری امجد کے پاؤں میں آ گری۔ چوہدری امجد بھی ایسا دہشت زدہ ہوا کہ گاؤں پہنچ کر ہی دم لیا۔ اور پھر اس کے بعد اس نے اپنے اہل وعیال کو بھی وہاں جانے سے روک دیا۔ ساتھ ہی شہر کے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کو اس حویلی کو بیچنے کا کہا۔

جاوید کا تبادلہ نیا نیا اس شہر میں ہوا تھا۔ وہ ایک الیکٹرونک کمپنی کا سیلز منیجر تھا۔ اچھی تنخواہ تھی۔ حال ہی میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس شہر میں آیا تھا۔ اس شان دار حویلی کو دیکھتے ہی اس کا دل کہنے لگا کہ یہی ان کی رہائش گاہ ہونی چاہیے۔ اس کے آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں اس لئے اس نے دوسرے شہر میں موجود اپنا گھر بیچ دیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ سے اس کی بات ہو چکی تھی۔ حویلی کی قیمت تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ جاوید نے اسٹیٹ ایجنٹ سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا "یہ حویلی آسیب زدہ ہے اگر آپ نے لینی ہے تو ٹھیک نہیں تو کوئی اور بندوبست کر دیتا ہوں۔"

جاوید ان توہمات پر یقین نہیں کرتا تھا سو اس نے ہنس کر اسٹیٹ ایجنٹ کی بات کا مذاق اڑایا اور قیمت دے کر وہ حویلی خریدی۔ اس کی بیوی شازیہ بھی پڑھی لکھی تھی اس نے بھی ان باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اور اس وقت وہ دونوں اس حویلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تیسرا آدمی وہ قلی تھا جو اسٹیشن سے ان کا سامان اٹھائے ان کے ساتھ تھا۔ سامان کیا تھا؟ دو بیگ جس میں اس کے اور اس کی بیوی کے کپڑے تھے۔ اور چند ضروری کاغذات۔ حویلی کے گیٹ پر پہنچتے ہی قلی نے دونوں بیگ نیچے زمین پر رکھے اور بولا۔ "صاحب! میرے پیسے مجھے دیں، میں اندر آپ کے ساتھ نہیں آؤں گا۔" وہ کافی ڈرا ہوا تھا۔

جاوید نے اس کے کانپتے وجود پر ایک طائرانہ نگاہ پھیری اور ہنستے ہوئے کہا۔ "بہت توہم پرست ہو تم لوگ! جب تک خدا کی طرف سے کسی کی موت لکھی نہیں جاتی وہ نہیں مرتا یہ لو اپنی مزدوری اور تم جا سکتے ہو۔" جاوید نے بٹوے سے چند روپے نکالے اور اسے دے دیئے۔

"صاحب ایک بات کہوں؟" قلی نے پیسے پکڑ کر جاوید سے پوچھا۔

"بولو!" جاوید نے جیب سے تالے کی چابیاں نکالتے ہوئے کہا جو اسٹیٹ ایجنٹ نے اسے دی تھیں۔

"صاحب! آپ اس حویلی میں نہ جاؤ، آپ کی بات ٹھیک ہے کہ تقدیر جیسے لکھی ہوتی ہے ویسے ہی ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ خودکشی کرتے ہیں وہ تو تقدیر کا لکھا نہیں ہوتا۔

"تو تمہارا کیا مطلب ہے کہ ہم خودکشی کر رہے ہیں؟"

"صاحب! میں نے آپ کو کہنا تھا کہہ دیا آگے آپ کی مرضی۔ یہ حویلی موت کا گڑھ ہے۔" اور یہاں آپ....."

"بکواس بند کرو۔ اپنی طرح دوسروں کو بھی جاہل سمجھتے ہو۔ تم نے اپنی مزدوری لے لی اب جاؤ یہاں سے۔" جاوید سے اب اور برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

ڈانٹ سن کر قلی نے وہاں سے جانے میں دیر نہیں لگائی۔ جاوید نے حویلی کا گیٹ کھولا۔ اندر نظر پڑتے ہی اسے کافی مایوسی ہوئی۔ اس کے اندازے کے برعکس حویلی میں جا بجا جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ اور جنگلی جڑی بوٹیوں نے حویلی کے صحن کو چھپا رکھا تھا۔ حویلی میں شہتوت اور بیری کے پیڑ بھی تھے جو مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے سڑ چکے تھے۔ صحن کے سامنے ہی وہ پرشکوہ عمارت تھی جو ایک اونچے سے چبوترے پر بنائی گئی تھی۔ جاوید اور شازیہ جڑی بوٹیوں سے بچتے بچاتے سیڑھیوں تک پہنچے اور پھر سیڑھیاں چڑھتے چبوترے پر آئے سامنے برآمدہ تھا اور اس کے آگے حویلی کا صدر دروازہ تھا۔ جس پر کوئی تالا نہیں تھا۔

جاوید اور شازیہ اندر چلے گئے۔ ایک لمبی راہداری کے اطراف میں دونوں سائیڈوں پر کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن پر کوئی تالا وغیرہ نہ تھا۔ انہی میں سے ایک کمرے کا دروازہ جاوید نے کھولا تو مکڑی کے جالوں نے اس کا استقبال کیا۔ "لگتا ہے حویلی کی ساری صفائی کروانا پڑے گی۔" جاوید نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور ہاتھوں سے جالے ہٹانے لگا۔

سفر کی تھکان بہت تھی اور اندر کے ماحول نے اس کو چڑچڑا سا کر دیا تھا۔ اس کمرے میں ایک ڈبل بیڈ تھا۔ جس کے سرہانے ایک لیمپ پڑا ہوا تھا۔ جبکہ سائیڈ میں کپڑوں کی الماری پڑی تھی۔ دیوار پر دو عدد پینٹنگ آویزاں تھیں۔ مگر یہ سب مکڑی کے جالوں میں اٹا ہوا تھا۔

جاوید کو ہاتھوں سے جالے اتارتے دیکھ کر شازیہ ہنس پڑی۔ "ٹھہرو تم بیٹھو میں ابھی صفائی کر دیتی ہوں۔" شازیہ نے ہنستے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک لمبی سی چھڑی تھی۔ جس پر اس نے اپنا دوپٹہ باندھا ہوا تھا۔ اس نے جالے اتارنے شروع کر دیئے۔ جاوید ایک سائیڈ پر کھڑا اسے پیار بھری نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ میں کمرہ بیٹھنے کے قابل

www.pdfbooksfree.pk

ہوگیا تھا۔ شازیہ نے دوپٹہ چھتری کے سرے سے اتارا اور اٹیچ باتھ میں چلی گئی۔ جبکہ جاوید تھکن اتارنے کے لئے بیڈ پر دراز ہوگیا۔ شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا اور اب رات اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ حویلی اس وقت سناٹے میں ڈوب چکی تھی۔ حویلی کے اردگرد آبادی ذرا دور تھی۔ دو ایک گھر حویلی کے ساتھ تھے مگر دن کے وقت بھی اس حویلی کے پاس کوئی نہیں پھٹکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حویلی میں بسنے والے حشرات الارض کے علاوہ باہر کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اور اندر شاور سے گرنے والے پانی کی وجہ سے خاموشی میں خلل پڑ رہا تھا۔ جاوید کو بھی غسل کی طلب ہورہی تھی مگر وہ سوچ رہا تھا کہ شازیہ فارغ ہولے تو وہ اندر جائے۔ کسلمندی مٹانے کے لئے اس نے سگریٹ سلگائی کہ اچانک شازیہ کی چیخ سنائی دی۔

فوراً سے پہلے وہ بیڈ سے اترا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ شازیہ کی چیخیں بڑھتی جارہی تھیں۔ جاوید پر جیسے جنون سا طاری ہوگیا۔ شازیہ کی چیخیں سن کر اس نے ہاتھ سے دروازے پر دیوانہ وار ضربیں لگانی شروع کردیں۔ تھوڑی ہی دیر میں باتھ روم کا دروازہ ٹوٹ کر اندر جاگرا۔ جاوید جلدی سے اندر داخل ہوا۔ اندر کا دہشتناک منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کی بیوی ایک کونے میں سکڑی بیٹھی تھی۔ اس کے جسم کا گوشت جگہ جگہ سے گل چکا تھا اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ جبکہ شاور سے پانی کی جگہ تیزاب نکل رہا تھا۔ اور حیرت انگیز طریقے سے وہ تیزاب نیچے گرنے کے بجائے دور کونے میں سکڑی شازیہ کے جسم پر پڑ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ چیخے جارہی تھی۔

جاوید نے آگے بڑھ کر شاور بند کرنا چاہا تو ایک خوفناک چہرہ اس کے سامنے ظاہر ہوا۔ اسے دیکھ کر تو جیسے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی شلوار گیلی ہورہی ہے۔ اس نے بھاگنا چاہا مگر زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ کافی جدوجہد کے بعد بھی وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہل نہ سکا۔ اور پھر شازیہ کی چیخوں میں جاوید کی چیخیں بھی شامل ہوگئیں۔

☆......☆......☆

''چھپی گھٹ کے جے پانویں اک وار گجرا''

بانو چھت پر کپڑے پھیلانے آئی تو یہ واہیات گانے کے بول اس کے کانوں میں پڑے۔ بے اختیار اس کی نظریں شیدے کے گھر کی طرف اٹھ گئیں۔ رشید عرف شیدا اس کے گھر کے سامنے والے گھر میں رہتا تھا۔ وہ کافی دنوں سے بانو کو تنگ کررہا تھا۔ بانو گھر سے نکلتی تو وہ اس کا راستہ روک لیتا۔ بانو ایک سائیڈ سے ہوکر نکل جاتی اور سبزی، سودا سلف لے کر واپس آتی تو شیدا اپنے پان والے دانت نکالے اس کے راستے میں کھڑا ہوتا۔ وہ فقرے چست کرتا رہ جاتا اور بانو جلدی جلدی گھر میں داخل ہوجاتی۔ بانو تھی بھی بہت خوبصورت۔ نکلتا ہوا قد، غضب ڈھاتی اٹھان، ستواں ناک، گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ، گورا رنگ اور چہرے پر قیامت ڈھاتی اس کی بڑی بڑی آنکھیں۔ کئی لڑکے اسے دیکھ کر آہیں بھرتے تھے۔ بانو کی ماں نہیں تھی وہ گھر میں اپنے باپ اور ایک سال کے بھانجے کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی بہن شادی کے بعد ہی کینسر کے مرض میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اور پھر ایک بیٹے کو جنم دے کر وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ تب سے بانو کا بھانجا ان کے گھر میں رہتا تھا۔

بانو کا باپ ایک اسکول ماسٹر تھا اس کی تنخواہ سے مکان کا کرایہ بھی ادا ہورہا تھا اور گھر کا خرچ بھی بہتر طریقے سے چل رہا تھا۔ بھانجے کو سلانے کے بعد اس نے کپڑے دھوئے اور اب گیلے کپڑے چھت پر پھیلانے کے لئے وہ اوپر آئی تھی۔ شیدا اس کو ندیدے پن سے دیکھ رہا تھا بانو نے اپنا دھیان اس کی طرف سے ہٹایا۔ دوپٹہ درست کیا اور اپنے کام میں لگ گئی۔ اس کے گھر کے عقب میں چند گز کے فاصلے پر چوہدری امجد کی حویلی تھی۔ جس کے کمرے کی کھڑکیاں اسی طرف کھلتی تھیں۔ مگر بانو نے اب تک یہ کھڑکیاں کھلی ہوئی نہیں دیکھی تھیں۔ چوہدری امجد کی حویلی کے متعلق جتنا دوسرے جانتے تھے اتنا ہی بانو بھی جانتی تھی۔ مگر اسے اس

حویلی سے اتنا ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ایک نظر شیدے کے گھر کی طرف ڈالی وہ اب چھت پر نہیں تھا۔ بانو نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جب تک شیدا چھت پر ہوتا اس کی نظریں بانو کے جسم میں چبھتی رہتیں۔ اچانک کھڑکی کے پٹ زوردار طریقے سے کھلے تو بانو نے مڑ کر حویلی کی طرف دیکھا۔ شیدا جانے کب حویلی میں گھسا تھا اور بالائی منزل پر بنے کمرے کی کھڑکی سے اسے ہوس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''سوہنیو! کیا حال چال ہیں......؟'' شیدے نے انتہائی بے شرمی سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ بانو نے خالی ٹوکری اٹھائی اور جانے کے لئے مڑنے ہی والی تھی کہ شیدے کے پیچھے ایک بھیانک چہرہ نمودار ہوا۔ لمبے لمبے بالوں سے بھرا ہوا بازو شیدے کی گردن کے گرد حائل ہوا اور شیدا کھڑکی کے پیچھے گھور اندھیرے میں ڈوب گیا۔ کھڑکی کے پٹ زوردار طریقے سے بند ہوئے اور شیدے کی پہلی اور آخری چیخ حویلی کے اندھیروں میں ڈوب گئی۔ دن دہاڑے اتنا بھیانک منظر دیکھ کر بانو کے جسم میں لرزش پیدا ہوگئی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نیچے بھاگی۔ چھت سے نیچے آکر اسے کافی سکون محسوس ہوا۔

عزیز احمد اس کا باپ جب بچوں کو پڑھا کر گھر آیا تو بانو اس سے لپٹ گئی۔

''کیا ہوا بانو! کیوں اتنا خوفزدہ ہورہی ہے؟'' عزیز احمد نے بیٹی کو پیار سے تھپکتے ہوئے پوچھا۔

''بابا! اب میں چھت پر نہیں جاؤں گی۔ کوئی کام ہوا بھی تو آپ میرے ساتھ چلنا۔'' بانو نے کانپتی آواز میں کہا۔

''مگر ہوا کیا ہے اور تجھے تو تیز بخار بھی ہے۔'' عزیز احمد نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ تو بانو نے ساری بات بتادی۔

''اچھا اب تو چھت پر نہیں جانا۔ میں ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں۔ عزیز احمد نے بیٹی کو تسلی دی اور گھر سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ بند نہ ہونے کی وجہ سے چوپٹ کھل گیا۔ چارپائی پر لیٹی بانو نے دروازے کی طرف دیکھا تو سامنے ایک آدمی کھڑا تھا جو بانو کے سراپے پر بھرپور نگاہ ڈال رہا تھا۔ بانو نے دوپٹہ درست کیا اور اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ تھوڑا سا دروازہ کھول کر وہ بولی۔ ''آپ کون ہیں اور کس سے ملنا ہے......؟''

''میں چوہدری امجد بیگ کا ملازم ہوں اور گاؤں سے ان کا پیغام لے کر آیا ہوں۔''

اجنبی نے اونچی آواز میں کہا۔ اتنے میں عزیز احمد ڈاکٹر کو لے کر آگیا تھا۔

''کیا پیغام لائے ہو نواز؟'' عزیز احمد نے نواز کی بات دور سے ہی سن لی تھی۔

''ماسٹر صاحب! چھوٹے چوہدری صاحب نے پیغام دیا ہے کہ اس مہینے کے اختتام پر گھر خالی کردیں۔'' نواز نے انکشاف کیا۔

''مگر کیوں! ہم تو ہر ماہ کا کرایہ وقت پر دے رہے ہیں۔'' عزیز احمد نے پریشانی سے کہا۔ ''کرایہ کی بات نہیں آپ کو تو معلوم ہے کہ چوہدری صاحب کی حویلی آسیب زدہ ہوچکی ہے۔ چوہدری صاحب کا بیٹا جمال شہر پڑھنے آرہا ہے اسے یہاں رہنے کے لئے گھر چاہیے۔ اور یہ ان کا اپنا گھر ہے وہ جب چاہیں خالی کروالیں۔''

''مگر ہم ایک مہینے میں کہاں بندوبست کریں گے؟ یہاں تو گھر کرایہ پر ملنا بہت مشکل ہے؟''

''یہ سب میں نہیں جانتا مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا رب راکھا!'' نواز نے کہا اور چلتا بنا۔ عزیز احمد ڈاکٹر کو لئے پریشان پریشان سا گھر میں داخل ہوا۔

☆......☆......☆

''تو کیا کہا ان لوگوں نے؟'' چوہدری جمال نے نواز سے پوچھا نواز ابھی ابھی گاؤں پہنچا تھا۔

''ماسٹر صاحب! پریشان ہوگئے تھے مگر میں نے بھی کہہ دیا کہ یہ چوہدری صاحب کا اپنا گھر ہے وہ جب چاہیں خالی کرالیں۔'' نواز نے چمچہ گیری کے انداز میں کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

"اور ہاں! چھوٹے سرکار اس ماسٹر کے گھر میں، میں نے ایک ایسی چیز دیکھی ہے کہ اگر آپ دیکھ لیں تو سال پہلے والی سوہنی کو بھول جائیں۔"

"آہستہ بول نواز! اگر بڑے چوہدری صاحب نے سن لیا تو ساری بنی بنائی عزت مٹی میں مل جائے گی۔ گاؤں والے جانتے ہیں کہ میں بہت شریف ہوں اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے والا بیٹا ہوں۔ مگر انہیں پتا چل گیا کہ سوہنی کو اٹھوانے اور سکندر کو دفن کرنے میں ہمارا ہاتھ تھا تو چوہدری صاحب بھی ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" جمال نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"سرکار! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ سکندر کے ذکر سے یاد آیا کہ وہ تو اس دن گاؤں سے ایسا گیا کہ کبھی شکل ہی نظر نہیں آئی۔" "کہاں ہوسکتا ہے وہ؟" نواز نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"چھوڑو! دفع کرو اسے ہمیں کیا اپنی گمشدہ بہن کو تلاش کررہا ہوگا۔ تم یہ بتاؤ کہ ماسٹر کے گھر میں جو ہے کیسی نظر آتی ہے وہ؟"

"سرکار! ایک دم چٹاخ ہے ایسی لڑکی آپ نے زندگی میں نہیں دیکھی ہوگی۔ بہت نرالی ہے۔" نواز نے انتہائی بے ہودہ اشاروں کے ساتھ بتایا۔

"اچھا تو ہم کل رات کو ہی وہاں جائیں گے۔ دیکھیں تو سہی کیا بلا ہے وہ.....؟"

چوہدری امجد کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا بیٹا ہی سوہنی کو اٹھا کرلے گیا تھا۔ اگر اسے اس بات کا پتہ ہوتا تو وہ اپنے بیٹے کو سزا دلوانے میں آگے ہوتا۔ سکندر جب چوہدری امجد کے پاس آیا تو چوہدری امجد نے خود سوہنی کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں لکھوائی تھی۔ اور جب پولیس سے کچھ نہ بن پڑا تو سکندر خود اپنی بہن کو تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اور اب سال سے اوپر ہو چکا تھا لیکن سکندر کا کوئی پتا نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

"کون.....؟"

دروازے پر دستک ہوئی تو عزیز احمد نے پوچھا۔

مگر جواب کے بجائے دوبارہ دستک ہوئی۔ "جانے رات کے اس پہر کون آ ٹپکا۔" ماسٹر عزیز احمد نے چارپائی کے نیچے پڑے سلیپر پہنے اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دستک مسلسل ہو رہی تھی۔ کوئی بہت عجلت میں تھا۔ ماسٹر عزیز سلیپر گھسیٹتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچا۔

"ارے صبر تو کرو آرہا ہوں۔" عزیز احمد نے کہا اور بنا کچھ سوچے سمجھے دروازہ کھول دیا۔ دو نقاب پوش ہاتھ میں ریوالور پکڑے اندر گھس آئے۔

"کون ہو تم لوگ؟ کیوں اندر گھسے چلے آرہے ہو۔ ماسٹر عزیز کی نیند اڑ چکی تھی۔ اور وہ گھبرا کر انہیں روکنے کی کوشش کررہا تھا۔

"ہٹ جاؤ پیچھے ورنہ گولی بھیجے کو چیرتی نکل جائے گی۔" ایک نقاب پوش نے ریوالور لہراتے ہوئے غرا کر کہا۔ اور ماسٹر عزیز کو زوردار دھکا دیا۔ بانو بھی اس ہنگامے کے شور سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی جو اس کی طرف ہی آرہے تھے۔ ننھا اسد بھی نیند سے جاگ گیا تھا اور رونے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ دونوں نقاب پوش اس کے پاس پہنچتے بانو اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "کیا چاہتے ہو تم لوگ اس گھر میں چوری کرنے والی کوئی چیز نہیں۔"

"ہم تمہیں چوری کرنے آئے ہیں جان من! اگر ذرا سی آواز نکالی تو اس بچے کو مارنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔" ایک نقاب پوش نے ریوالور کا رخ اسد کی طرف کردیا۔ جواب تک روررہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ بانو کو اٹھاتے پیچھے کھڑے ماسٹر عزیز نے ان پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے دونوں کو گردن سے پکڑا اور ساتھ لیتا ہوا زمین پر جا گرا۔ دونوں کے ہاتھوں سے ریوالور چھوٹ کر دور جا گرے۔ عزیز احمد نے دونوں کی گردنوں کے گرد بازو حائل کردیئے اور زور زور سے بھینچنے لگا۔ "بھاگ جا بیٹی! اسد کو لے کر یہاں سے بھاگ جا۔" عزیز احمد نے ان پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

ایک نقاب پوش ریوالور اٹھانے کی کوشش کررہا

تھا۔ جو اس کے ہاتھ سے تھوڑی دور پڑا تھا۔ بانو نے بچے کو اٹھایا اور پیچھے دیکھتی رہی۔ وہ فیصلہ نہیں کرپارہی تھی کہ جائے یا نہ جائے۔

"بیٹی بھاگ جا! تجھے میری قسم۔" عزیز احمد نے چلا کر کہا اور وہ روتے روتے وہاں سے بھاگ نکلی ننھے اسد کو بھی اس نے اٹھایا ہوا تھا۔ جس کے رونے کی آواز اونچی ہوتی جارہی تھی۔ تھوڑی دور پہنچتے ہی اسے فائر کی آواز سنائی دی وہ ٹھٹک کر رک گئی اور مڑ کر گھر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ دیا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اسی وقت دونوں نقاب پوش اس کی طرف بڑھے۔ اب اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی اور جدھر منہ اٹھا بھاگ پڑی۔ بھاگتے بھاگتے چوہدری کی آسیب زدہ حویلی کے سامنے پہنچ گئی۔ نقاب پوش ابھی بھی اس کے پیچھے تھے۔ فاصلہ تھوڑا تھا۔ بانو کو معلوم تھا کہ حویلی کے اندر بھیانک موت ہے۔ مگر اس وقت اس نے اس موت کو اپنی عزت پر ترجیح دی اور اسد کو اٹھائے حویلی میں داخل ہوگئی۔ یہ ساری کاروائی دیکھ کر دور سے آتے ایک موٹر سائیکل سوار نوجوان نے اپنی موٹر سائیکل کا رخ اسی طرف کردیا۔ دونوں نقاب پوش دروازے پر آ کھڑے ہو چکے تھے۔

"کیا کریں سرکار! میں تو کہتا ہوں واپس چلیں۔" ایک نقاب پوش بولا۔

"نہیں نواز! اس لڑکی کے شباب نے مجھے دیوانہ کردیا ہے۔ اس کے بغیر میں نہیں جاؤں گا۔" دوسرے نقاب پوش نے جو چوہدری جمال تھا کہا۔

اسی وقت موٹر سائیکل کی لائٹ ان کی آنکھوں پر پڑی۔ "بھاگو! چھوٹے سرکار اس لڑکی سے صبح نمٹ لیں گے اگر زندہ ہوئی تو۔" نواز نے کہا اور بھاگنے میں پہل کی چوہدری جمال کو اس کی بزدلی پر غصہ تو آیا مگر اس کے پاس بھی بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

موٹر سائیکل سوار موٹر سائیکل سے اترا اور انہیں دور جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ حویلی میں داخل ہوگیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے بچتا وہ حویلی کی سیڑھیاں چڑھتا راہداری میں آ گیا۔ بانو ایک دروازے سے جھانک رہی تھی۔ اس نوجوان کو دیکھتے ہی اس نے دروازہ بند کرلیا۔ ننھے اسد کی آواز وقفے وقفے سے آرہی تھی۔

"دروازہ کھولو لڑکی! میں تمہارا دشمن نہیں۔" نوجوان نے دروازے پر ہلکی سی دستک دیتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔" اگر تمہیں مجھ سے کوئی ڈر لگ رہا ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ میں نے تمہیں بھاگتے دیکھا تو تمہاری مدد کے لئے آ گیا۔ مگر لگتا ہے تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے میں جارہا ہوں۔" اتنا کہہ کر نوجوان واپس مڑنے لگا تو دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ وہیں رک گیا۔

بانو نے دروازہ کھولا اور ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟ شاید اب بھی آپ کو مجھ سے ڈر لگ رہا ہے۔ میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔" بانو نے کوئی جواب نہ دیا اور ننھے اسد کو اٹھا کر کمرے سے باہر آئی۔

"آپ کہاں جارہی ہیں؟ اس وقت باہر جانا خطرے سے خالی نہیں صبح ہوتے ہی چلے جانا۔" نوجوان نے اسے صدر دروازے کی طرف جاتے دیکھا تو بولا۔

"مجھے اپنے بابا کا پتا کرنا ہے۔ نہ جانے ان لوگوں نے میرے بابا کے ساتھ کیا کیا ہے؟" بانو اتنا کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسی وقت ایک زوردار دھماکے سے حویلی کا صدر دروازہ بند ہوگیا۔ بانو نے رونا بند کردیا اور ڈری سہمی اپنے اردگرد دیکھنے لگی۔ جبکہ نوجوان حیران ہو رہا تھا۔ اسی وقت دیوار سے ایک خوفناک چہرہ نمودار ہوا اور بانو کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ جو حویلی کے سناٹے میں گونجنے لگی۔

☆.....☆.....☆

صبح ہوتے ہی چوہدری امجد کو تھانے سے اطلاع آئی تھی کہ اس کے کرایہ دار کو کسی نے قتل کردیا۔ اور رسمی کاروائی کے لئے چوہدری امجد کو تھانے بلوایا گیا تھا۔ چوہدری امجد تھانے میں داخل ہوا۔ تو انسپکٹر دلاور نے

www.pdfbooksfree.pk

ایک سنتری کو چائے پانی لانے بھیج دیا۔

"بیٹھئے چوہدری صاحب! معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کو تکلیف دی۔" انسپکٹر دلاور نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت افسوس ہوا ماسٹر عزیز کا سن کر، بہت اچھے آدمی تھے۔" چوہدری امجد نے دلی افسوس کا اظہار کیا۔

"اس چین کو پہچانتے ہیں آپ؟ انسپکٹر دلاور نے سونے کی چین چوہدری دلاور کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

"ہاں! یہ تو میرے بیٹے جمال کی چین ہے اور یہ چین میں پڑا لاکٹ پر "جے" کا نشان اس کا نام ہی ظاہر کرتا ہے۔" چوہدری امجد نے لاکٹ کو غور سے دیکھ کر تصدیق کردی۔ وہ جمال کی اس چین کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

"یہ ہمیں جائے واردات سے ملا ہے۔ اب آپ بتائیں کل رات آپ کا بیٹا جمال کہاں تھا؟" انسپکٹر دلاور نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"انسپکٹر! تمہارا مطلب ہے کہ ماسٹر عزیز کو میرے بیٹے نے قتل کیا ہے۔ تم ہوش میں تو ہو۔ بھلا جمال اس کو کیوں مارے گا۔ اس کی کیا دشمنی اس ماسٹر سے۔ اور ویسے بھی میرا بیٹا ایسا کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" چوہدری امجد بپھر کر بولا۔

"ریلیکس چوہدری صاحب! آپ کا بیٹا جیسا بھی ہو مگر ثبوت اس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں اور آپ کو جان کر حیرت ہوگی کہ ماسٹر عزیز کی جواں سالہ بیٹی اور ایک نوا سہ گھر سے غائب ہے۔ آپ کے گاؤں میں سے لڑکیاں غائب ہونے کی پہلے بھی تین وارداتیں ہوچکی ہیں۔ جن کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وارداتیں بھی انہی وارداتوں کی ایک کڑی ہے۔" انسپکٹر نے ٹیبل پر تھوڑا آگے جھکتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"سارا گاؤں جانتا ہے کہ میرا بیٹا کیسا ہے۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جس طرح میں اپنی قسم دے سکتا ہوں ویسے اس کی قسم دینے میں مجھے کوئی عار نہیں۔"

سنتری کولڈ رنکس اور بسکٹ لے کر آچکا تھا جو انسپکٹر دلاور کے اشارے پر چوہدری امجد کے آگے رکھ دیئے۔ مگر چوہدری امجد نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چوہدری صاحب! مجھے آپ سے کوئی دشمنی نہیں۔ اگر آپ کا بیٹا بے گناہ ہے تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ یہ کیس شہر سے ٹرانسفر ہوکر میرے ہاتھ آیا ہے۔ اور میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردوں گا۔ مگر آپ بنا کچھ سوچے سمجھے غصہ نہ کریں۔ آپ ایک انصاف پسند انسان ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ سچ کا ساتھ دیں گے۔" انسپکٹر نے اسے غصے میں اٹھتے دیکھا تو سمجھایا۔

چوہدری امجد چند سیکنڈ وہاں کھڑا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور پھر تھانے سے باہر آگیا۔ وہ واقعی انصاف کا حامی اور غریب پرور چوہدری تھا۔ وقتی طور پر اسے بیٹے کے بارے میں ایسا سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے اسے اپنے بیٹے کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہو۔ اگر پولیس کو جائے واردات پر اس کی موجودگی کے ثبوت ملے ہیں تو کوئی وجہ تو ہوگی۔ چوہدری امجد کو لاکٹ والی چین پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ اگر میرا بیٹا بے گناہ ہے تو اس کا لاکٹ وہاں کیا کر رہا تھا۔ انہی خیالوں میں گاڑی چوہدری امجد کی گاؤں والی حویلی پہنچ گئی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔

چوہدری امجد سب سے پہلے اپنے بیٹے جمال سے مل کر اس رپورٹ کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے بیٹے کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ ابھی دروازے پر دستک دینے ہی والا تھا کہ اسے اندر سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔ جمال کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"نہیں میرا باپ کبھی نہیں مانے گا کہ یہ کام میں

نے کیا ہے۔ پتہ نہیں وہ چین کیسے میرے گلے سے گر گئی۔"

دوسری آواز ابھری۔ "سرکار! وہ انسپکٹر بہت ایماندار ہے۔ ورنہ لے دے کر یہ معاملہ نمٹ سکتا تھا۔ اب تو ایک ہی راستہ ہے کہ آپ گاؤں والوں کو اپنی حمائیت میں کرلیں برے وقتوں میں آپ نے ان پر جو احسان کئے ہیں وہ ضرور آپ کا ساتھ دیں گے۔" یہ نواز کی آواز تھی۔

اب کچھ سننے کی ضرورت نہیں رہی تھی چوہدری امجد نے دروازے پر زور ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ چوہدری امجد کو دیکھ کر دونوں ٹھٹھک گئے اور حیرانگی سے اسے دیکھنے لگے۔

"میں نے تمہاری سب باتیں سن لی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ایک سانپ پال رہا ہوں۔ جو وقت آنے پر مجھے ہی ڈنک مارے گا۔ میں ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گا۔ شیر سنگھ!" چوہدری امجد بیگ نے بات پوری ہوتے ہی اپنے ایک وفادار ملازم کو آواز دی۔

اس سے پہلے کہ شیر سنگھ وہاں آتا جمال اور نواز وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

☆.....☆.....☆.....

بانو نے اپنی زندگی میں دوسری بار وہ چہرہ دیکھا تھا۔ اتنا بھیانک چہرہ دیکھ کر بانو ہذیانی انداز میں چیخے جارہی تھی۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں جن میں کالی پتلیوں کا نشان بھی نہیں تھا۔ ناک اندر کو دھنسی ہوئی۔ چہرہ کی ایک سائیڈ سے کھال بالکل ہٹی ہوئی تھی۔ اور جبڑے کی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ سب سے زیادہ دہشتناک اس کے بال جو لمبے لمبے تھے اور اس کے چہرے کے آگے جھول رہے تھے۔ سارے جسم پر ریچھ کی طرح بال اگے ہوئے تھے۔ جو اس کی دہشت میں اضافہ کررہے تھے۔

وہ بلا بانو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ننھا اسد خوف سے بے ہوش کر اس کی بانہوں میں جھول گیا تھا۔ بلا کا ہاتھ لمبا ہوتا ہوا بانو کی طرف بڑھا اس سے پہلے کہ وہ بانو تک پہنچتا۔ دور کھڑا اجنبی نوجوان جست لگا کر بانو کے آگے جا کھڑا ہوا۔ بلا کا بڑھتا ہوا ہاتھ وہیں رک گیا۔ اور وہ غور سے اجنبی کو دیکھنے لگی۔

"سکندر تم۔" بلا کے منہ سے سوہنی کی آواز سن کر اجنبی ششدر رہ گیا۔ وہ سکندر تھا۔ جو اپنی گمشدہ بہن کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔

"سوہنی! میری بہن مجھے یقین نہیں آرہا! کیا، میں خواب دیکھ رہا ہوں۔" سکندر کی آواز کہیں دور سے آرہی تھی۔

"ہاں! سکندر یہ حقیقت ہے، میں ہی تمہاری بدنصیب بہن سوہنی ہوں۔" سوہنی کی آواز میں درد کا عنصر نمایاں تھا۔

سکندر آگے بڑھا اور اس عفریت سے لپٹ گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ "تمہاری یہ حالت کس نے کی سوہنی۔ بہت ڈھونڈا میں نے تمہیں! اور آج تم ملی بھی تو ایک زندہ لاش کی طرح کیسے ہوگیا یہ سب۔" سکندر کی آنکھوں سے آبشار پھوٹ پڑے تھے۔ بانو حیرت زدہ سی اس عفریت اور اجنبی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ سب چوہدری امجد کے بیٹے جمال کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ نقاب پوش جو مجھے اٹھا لائے تھے ان میں سے ایک چوہدری کا بیٹا جمال اور دوسرا اس کا نوکر نواز تھا۔ اس نے چار آدمی اس حویلی میں بھی رکھے ہوئے تھے جو پورا ایک ماہ تک میری عزت کو تار تار کرتے رہے۔" سوہنی کے لہجے میں درد نمایاں تھا۔

"نہیں چھوڑوں گا میں اس جمال کو، تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔" سکندر نے آنسو صاف کرتے ہوئے فرط جوش سے کہا۔

"نہیں سکندر! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے جس سے تمہارے ہاتھ اس کے گندے خون سے ناپاک ہوں۔ ویسے بھی وہ میرے دشمن ہیں۔" سوہنی نے سکندر کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے میری بہن کہ تم ان سے انتقام لینا چاہتی ہو مگر بے گناہ انسان جو تمہارے ہاتھوں ہلاک ہوئے ان کا کیا قصور تھا۔ اگر آج میں نہ ہوتا تو یہ لڑکی اور

www.pdfbooksfree.pk

معصوم بچہ بھی تمہارے انتقام کا نشانہ بن جاتا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری بھولی بھالی بہن ایسی درندگی پر اتر آئے گی۔" سکندر کی نظر سہمی ہوئی دور کھڑی بانو پر پڑی تو وہ جذباتی ہوتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے میرے بھائی کو اس لڑکی سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہوگیا ہے۔ تم بے شک ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میری جگہ تم ہوتے اور جو ظلم مجھ پر ہوئے ہیں تم پر ہوتے، تو میرے بھائی میں دیکھتی کہ تمہارا بھولا پن کیسے دیوانگی میں بدلتا ہے۔" سونی اپنے اندر کا زہر اگل رہی تھی۔ "دیکھو ادھر!" سونی نے اپنی انگلی کا اشارہ سامنے کمرے کی طرف کیا تو دروازہ کھل گیا۔

سکندر نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا خون کھولنے لگا۔ اس کی بہن سونی بیڈ پر بندھی پڑی تھی۔ اور منہ پر کپڑا بندھا ہونے کی وجہ سے گھٹی گھٹی آواز میں چیخ رہی تھی۔ کمرے میں تین آدمی تھے ایک نواز دوسرا جمال اور تیسرے کو سکندر نہیں جانتا تھا۔ پھر ان لوگوں نے جو وحشت ناک کھیل کھیلا اسے دیکھ کر سکندر نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ایک بھائی اپنی بہن کو لٹتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ سکندر نے غصے کی زیادتی میں زوردار مکہ دیوار پر رسید کیا اور سسکنے لگا۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں سکندر اس کے بعد جو ظلم انہوں نے میرے ساتھ کیے تم دیکھو گے تو کانوں کو ہاتھ لگاؤ گے۔ مسلسل ایک ماہ تک یہ لوگ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے رہے۔ ایک بار میں نے جمال کے منہ پر تھوک دیا تو اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ میری روح میرا جسم چھوڑ گئی۔" "دیکھو ادھر!"۔ سونی نے آخری جملہ تحکمانہ لہجے میں کہا۔ تو سکندر نے پھر رخ پھیر کر کمرے میں دیکھنا شروع کردیا۔ جمال نے ایک لمبی سی بوتل اٹھائی ہوئی تھی اور غصے سے کہہ رہا تھا۔ "حرام زادی تو نے مجھ پر تھوکا۔ تیری تو میں وہ حالت کروں گا کہ بھکاریوں سے بھی بدتر لگے گی۔" اور پھر جمال نے جو کیا وہ سکندر کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ جمال نے بوتل کا منہ کھولا تو اس میں سے دھواں نکل رہا تھا اور پھر تیزاب کی وہ بوتل اس نے رسیوں سے بندھی ہوئی سونی کے معصوم چہرے پر انڈیل دی۔ سکندر سے یہ سب دیکھا نہ گیا تو وہ بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ جمال کو پکڑتا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سکندر ہونقوں کی طرح کبھی بیڈ کو اور کبھی کمرے کی دیواروں کو دیکھتا رہ گیا۔

"کیوں میرے بھائی! کیا اب بھی تم مجھے ہی موردِ الزام ٹھہراؤ گے.....؟" سونی کی آواز پر سکندر پلٹا۔ اسے جیسے ہوش سا آ گیا تھا۔ "تمہارا بھائی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تمہارے ساتھ جو ہوا وہ واقعی بڑا ظلم ہے مگر اس کی سزا تم بے گناہوں کو کیوں دے رہی ہو۔" خاموش کھڑی بانو یہ سب تماشا دیکھ چکی تھی۔

"شاید تم دونوں کی بات ٹھیک ہے۔ میں ہی غلط ہوں۔ لیکن میں خود ایسی نہیں بنی تقدیر نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ جب میں اپنے دشمن سے انتقام نہیں لے سکی تو میرے انتقام نے مجھے دیوانہ کردیا۔ بدلے کی آگ نے مجھ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی۔ اور پھر میں روح سے بدروح بن گئی۔" سونی اپنے جرموں کا اعتراف کررہی تھی۔

"مگر تم تو ایک روح ہو۔ جب بھی چاہو حویلی سے نکل کر جمال سے بدلہ لے سکتی تھی۔ تم پر ایسی کون سی بندش تھی جو تم اپنا انتقام دوسروں پر مسلط کرنے لگی۔" سکندر بھی بہن سے جیسے بحث پر اتر آیا تھا۔

"کیا بندش تھی مجھے؟" سونی نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ "دیکھو ادھر!" سونی نے اب کی بار انگلی کا رخ حویلی کے صدر دروازے کی طرف کیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

باہر کا ماحول کافی بدلا ہوا تھا۔ تمام درخت ہرے بھرے تھے اور صحن بھی صاف ستھرا تھا۔ ایک شخص جو اپنی حالت سے کوئی عامل لگتا تھا۔ حویلی کے دیواروں میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ چاروں طرف میخیں ٹھونکنے کے بعد اس نے ایک دائرہ سا بنایا اور اس دائرے میں ابھی ایک قدم رکھا ہی تھا کہ اڑتا ہوا حویلی کی دیوار سے باہر جا پڑا۔ پھر سکندر کو سونی نظر آئی جو گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مگر ایک خاص فاصلے پر جا کر اسے ایک جھٹکا سا لگتا

اور آگ کی ایک لپٹ اس کے وجود میں سرائیت کر جاتا اور وہ چیختی ہوئی پیچھے ہٹ جاتی۔ اس نے یہ عمل کافی دفعہ کیا مگر ہر بار ناکامی ہوتی۔ آہستہ آہستہ وہ منظر بھی ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

اب سکندر کو وہی اجڑی حویلی نظر آرہی تھی جو یہاں آ کر اسے نظر آئی تھی۔ "اب بتاؤ سکندر! انتقام کے ہاتھوں مجبور ایک روح کو قید کردیا جائے تو وہ بدروح نہ بنے تو اور کیا کرے۔ پہلے چند مہینے اس قید میں، میں نے بہت اذیت میں کاٹے ہیں۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں جمال کی گردن توڑ دیتی۔ پھر میں نے قسم کھائی کہ جو بھی اس حویلی میں داخل ہوگا، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اور جب میں کسی کو مارتی ہوں تو میری روح میں بھڑکتے انتقام کے شعلے کچھ دیر کے لئے سرد ہوجاتے ہیں۔ مجھے کسی کو مار کر سکون ملتا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب جمال خود آئے گا اور میری روح میں بھڑکتی آگ، ہمیشہ کے لئے ٹھنڈی ہوجائے گی۔" سونی نے بات مکمل کرکے سکندر کی طرف دیکھا۔

"بہت غلط کیا تم نے سونی! بہت غلط کیا۔ خدا تمہیں معاف فرمائے اور وعدہ کرو کہ آج کے بعد کسی بے گناہ کو نہیں مارو گی۔"

"مجھے لگتا ہے میری منزل مجھے آج مل جائے گی۔" سونی نے مبہم سے انداز میں کہا اور حویلی کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ "بانو کیا تم میری مدد کرو گی۔ تم چاہو گی کہ میری روح کو سکون ملے۔" سونی نے بانو کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

"جج.....جی.....کیوں نہیں؟" بانو نے گھبرا کر کہا۔

"تمہارے باپ کے قتل کا پولیس کو پتہ چل گیا ہے اور اب پولیس، جمال اور نواز کے پیچھے ہے۔ وہ حویلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مگر حویلی کی دہشت انہیں شاید اندر آنے سے روک دے۔ کیا تم انہیں یہاں لاسکتی ہو؟" سونی نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"میں اپنے باپ کے قاتلوں کو سزا دلوانے کے لئے کچھ بھی کرسکتی ہوں۔" بانو فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"تو جاؤ! کسی بھی طرح انہیں یہاں لاؤ۔" سونی نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"بانو دروازے کی طرف بڑھی تو سکندر بھی ساتھ ہولیا۔ "تم یہیں ٹھہرو سکندر! اگر ان لوگوں نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو وہ ادھر نہیں آئیں گے۔" بانو نے ایک خیال کے آتے ہی کہا۔

"میں اپنی موٹر سائیکل اندر لانے کے لئے جارہا ہوں۔ موٹر سائیکل دیکھ کر بھی وہ واپس جاسکتے ہیں۔" بانو نے اثباتی انداز میں سر ہلایا اور دونوں حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

جمال کی جیپ شہر کی طرف رواں دواں تھی۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ اسی لئے اس نے بنا سوچے سمجھے سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔ جیپ اب کچی سڑک سے اتر کر پکی سڑک پر چڑھ گئی تھی۔ پیچھے سے آتی پولیس گاڑی کے سائرن لمحہ بہ لمحہ قریب آتے جارہے تھے۔ نواز نے ریوالور نکالا اور نشانہ باندھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ پولیس والے اس کی گولی کی رینج میں ہیں تو تب اس نے فائر کردیا۔

گولی انسپکٹر دلاور کے ساتھ بیٹھے اے۔ ایس۔ آئی کی کھوپڑی میں سوراخ کرگئی۔ اب پولیس کی طرف سے جوابی فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ پولیس کی ایک گولی جمال کی گاڑی کا ٹائر برسٹ کرگئی تھی۔ گاڑی سڑک پر لہرائی اور کچے میں اترتی چلی گئی۔ جمال نے گاڑی کے بریک لگائے اور نیچے اتر کر دوڑ لگادی۔ نواز بھی اس کے پیچھے تھا۔ پولیس والوں نے بھی گاڑی روکی اور انسپکٹر اپنی نفری کے ساتھ اس کا پیچھا کرنے لگا۔

دوڑتے دوڑتے جمال کو سامنے اپنی حویلی نظر آئی۔ حویلی میں روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ جمال دوڑ بھی رہا تھا اور حویلی کی طرف حیرانی سے دیکھ بھی رہا تھا، اسے اسے حیرانگی اس بات کی تھی کہ اتنے عرصے میں حویلی کی تمام لائٹیں پھر سے روشن ہیں۔ اور پھر یہ روشنیاں مقناطیس کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ انسپکٹر

www.pdfbooksfree.pk

دلاور اور اس کے سپاہی جمال کے پیچھے ہی تھے کہ اچانک ان کے آگے سے دھول مٹی کا طوفان اٹھا، ہوا اتنے زور کی تھی کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اتنی زور کا طوفان انسپکٹر دلاور نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ادھر جمال دوڑتا ہوا حویلی کے گیٹ پر پہنچا تو بانو وہاں کھڑی تھی۔ اسد ہوش میں آ گیا تھا اور سکندر اسے لے کر اندر چلا گیا تھا۔

"تم ابھی تک زندہ ہو۔" جمال نے اسے دیکھتے ہی ہانپتے ہوئے پوچھا۔ نواز بھی حیرت کا بت بنا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"کیوں! مجھے کیا ہوا ہے؟" بانو نے الٹا سوال کیا۔

"یہ حویلی آسیب زدہ ہے جو یہاں آتا ہے زندہ نہیں لوٹتا مگر تم.....؟" اب کی بار نواز نے سوال کیا۔

"وہ آسیب اس حویلی کو چھوڑ گیا ہے اور تم دونوں بھی اندر آ جاؤ پولیس تمہارے پیچھے ہے۔" بانو نے بڑے لاڈ سے کہا۔ وہ ان دونوں کو حویلی کے اندر لانا چاہتی تھی۔ "اگر پولیس حویلی کی طرف آ گئی تو؟" جمال پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا مگر تاریکی کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"وہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ پولیس کو میں کچھ ایسا بہانہ کروں گی کہ وہ یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔ اب اندر آ جاؤ، میں بیڈ روم میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" بانو نے کہا اور گیٹ سے اندر چلی گئی۔

"کیا کہتے ہو نواز؟ کیا اب بھی تم ڈر رہے ہو؟" جمال نے نواز سے پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

"نہیں سرکار! حویلی کی روشنیاں دیکھ کر ہی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اب یہ حویلی آسیب زدہ نہیں رہی۔ اور اب تو ماسٹر کی لونڈیا بھی آپ پر مہربان ہے ایسے وقت میں ہمیں موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور میرا حصہ یاد سے رکھ لینا۔" نواز نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا اور جمال شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے حویلی میں داخل ہو گیا۔

بیڈ روم تک پہنچتے پہنچتے اس کا تمام خوف رفو چکر ہو گیا تھا اور خوف کی جگہ شیطانی سوچوں نے لے لی تھی۔ راہداری کا پہلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور بانو اندر بیڈ پر لیٹی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ آخری بار جمال یہاں سوہنی کے ساتھ آیا تھا۔ اور پھر اس نے تمام خیالات جھٹک کر کمرے میں قدم رکھ دیا۔

نواز کو اس نے باہر رکنے کا کہہ کر دروازہ اندر سے بند کیا اور بانو کی طرف بڑھا۔ بانو نے والہانہ انداز میں پیش قدمی کی۔

جمال کے ہونٹ بانو کے ہونٹوں میں پیوست تھے کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی پیٹھ میں گرم گرم لوہا اتر گیا ہو۔ فرط جذبات سے بند ہونے والی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھلیں تو بانو کی جگہ ایک بھیانک چہرہ تھا۔

جمال نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی زبان کسی آہنی شکنجے میں جکڑی جا چکی ہے۔ اور پھر حلق سے نکلتی اس کی زبان سوہنی کے خوفناک دانتوں میں دبی نظر آئی۔ جبکہ سوہنی کے بھیانک پنجے اس کی کمر کا گوشت نوچ چکے تھے۔

جمال چاہنے کے باوجود بھی حلق سے آواز نہ نکال سکا۔ درد کی شدت سے اس کے حواس جواب دے گئے اور وہ ہوش سے بے گانہ ہو گیا۔ جلن کا احساس ہوتے ہی اسے ہوش آنا شروع ہو گیا۔ پوری طرح آنکھیں کھولنے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ خوفناک بلا ہاتھ میں تیزاب کی بوتل پکڑے قطرہ قطرہ اس کے پاؤں پر گرا رہی ہے۔ پاؤں کا گوشت گل رہا تھا جبکہ پنجے کی ہڈیاں آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی تھیں۔ جمال کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلی۔ سوہنی قطرہ قطرہ کر کے تیزاب گرا رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ اس کے اوپری جسم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جمال نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ نادیدہ رسیوں سے باندھ دیا گیا ہو۔ سوہنی اس کا نچلا دھڑ جلا چکی تھی اب اس نے سر کی طرف سے شروع کیا۔

دنیا جہان کا خوف اور اذیت اس کی آنکھوں سے

ٹپک رہی تھی اور پھر جمال کو ہمیشہ کے لئے اذیت سے چھٹکارا مل گیا۔ اس کی روح اس کا جسم چھوڑ چکی تھی۔ مگر سوہنی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اس نے تیزاب سے اس کا سارا گوشت جلا دیا۔ اب جمال کا ڈھانچہ وہاں پڑا تھا اور کمرے میں دھواں اور گوشت کی سڑاند پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔

نواز باہر کھڑا جمال کا انتظار کر رہا تھا۔ کمرے سے نکلتا دھواں دیکھ کر اسے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس نے ریوالور نکال لیا۔ اور ناک منہ پر ہاتھ رکھ کر کمرے میں داخل ہوا۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کانوں تک جا پہنچیں۔ خوف سے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سوہنی اس کے سامنے کھڑی تھی، اس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل تھی اور پاؤں میں جمال کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ جس کا گوشت گل کر زمین پر پڑا تھا۔ نواز کو کراہیت کی وجہ سے قے آ گئی۔ اس نے دروازے کی طرف رخ کیا اور چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل جائے مگر دروازہ زبردست دھماکے سے بند ہوا تو نواز کا حلق خشک ہو گیا۔ اس نے ہمت کر کے ریوالور پر گرفت مضبوط کی اور پلٹ کر ریوالور کی ساری گولیاں سوہنی کے جسم میں جھونک دیں۔

مگر سوہنی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سوہنی پر کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر نواز کی گھگھی بندھ گئی۔ اس نے ریوالور پھینکا اور دروازے کو دھڑ دھڑانے لگا۔ سوہنی نے انگلی کا اشارہ کیا اور چھت پر لگا۔ سیلنگ فین اپنی فل رفتار سے چل پڑا۔ اب سوہنی نے نواز کی طرف دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ نواز نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر موت کے شکنجے نے اسے پوری طرح اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ اور پھر اوپر اٹھتا ہوا نواز پنکھے سے جا کر لگا، اس کی گردن دھڑ سے الگ ہو گئی اور کٹا ہوا دھڑ کسی شہتیر کی طرح زمین پر آ گرا۔ چند لمحے تڑپنے کے بعد وہ ساکت ہو گیا۔

سوہنی کے حلق سے ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا جو حویلی کے در و دیوار کو ہلاتا چلا گیا۔

رات ختم ہو گئی اور دن کا سورج طلوع ہوا تو سکندر حویلی کے صحن میں لگے بیری کے درخت کے نیچے زمین کھودنے لگا۔ بانو اپنے بھانجے کے ساتھ وہیں موجود تھی۔ صبح ہو گئی تھی اور انسپکٹر دلاور اور اس کے سپاہی بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ جمال کے ڈھانچے اور نواز کی سڑی لاش دیکھ کر انسپکٹر دلاور نے سکندر سے چند سوالات کئے۔ سکندر نے اب تک تمام حالات انسپکٹر دلاور کے گوش گزار کر دیئے تھے۔ انسپکٹر کو ماننا پڑا کہ یہ سب ایک روح کا انتقام ہے کیونکہ جس طوفان نے انہیں اٹھا کر حویلی سے دور پھینک دیا تھا وہ کوئی قدرتی طوفان نہیں تھا۔

انسپکٹر دلاور نے سارے واقعات چوہدری امجد کے گوش گزار کر دیئے تھے۔ جسے سن کر چوہدری امجد نے اپنا سر پیٹ لیا اور بولا! "انسپکٹر برے کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔"

اور اب دلاور سوہنی کی نشاندہی پر وہ جگہ کھود رہا تھا۔ سوہنی نے کہا تھا کہ جب تک اس کی لاش کو مذہبی طریقے کے مطابق دفن نہیں کیا جائے گا اس کی روح بھٹکتی رہے گی اور عالم برزخ میں نہیں جائے گی۔ اور پھر تھوڑی سی کھدائی کے بعد سوہنی کا ڈھانچہ برآمد ہو گیا۔

سکندر کی آنکھوں سے پھر سے آنسو گرنے لگے۔ انسپکٹر دلاور اور بانو اسے تسلی دے رہے تھے۔ پھر انہوں نے اس ڈھانچے کی تمام رسومات کر کے تدفین کی۔ اور دوسرے دن ہی وہ پھر حویلی چلے آئے۔

اب سوہنی کی روح ان کے سامنے تھی۔ مگر پہلے کی طرح خوفناک نہیں بلکہ وہی سوہنی جو ایک ڈیڑھ سال پہلے سکندر سے جدا ہو گئی تھی۔

"سکندر میرے بھائی! میرا عالم ارواح میں جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے اجازت دو۔ تمہاری اور بانو کی جوڑی بہت اچھی رہے گی۔ کیوں بانو؟ میرے بھائی سے شادی کرو گی؟" سوہنی نے آخری جملہ بانو کو مخاطب کر کے کہا۔ تو بانو کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اور سوہنی کی روح آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔

www.pdfbooksfree.pk

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

مرجھا کے کالی جھیل میں گرتے ہوئے بھی دیکھ
سورج ہوں میرا رنگ مگر دن ڈھلے بھی دیکھ
کاغذ کی کترنوں کو بھی کہتے ہیں لوگ پھول
رنگوں کا اعتبار بھی کیا، سونگھ کے بھی دیکھ
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

تیرے حسن کو روشنی چہرے کو پھول لکھا ہے
محبت کو ہم نے جوانی کی بھول لکھا ہے
لوگ لکھتے رہے تیرے حسن کو مثلِ قمر
ہم نے قمر کو تیرے پیروں کی دھول لکھا ہے
(محمد بشیر احمد پرواز.....جنڈانوالہ)

بچھڑ کر ہم سے پھر کسی کے بھی ہو نہ سکو تم "S"
ملو گے سب سے پر ہماری تلاش میں
(رانا ظفر اقبال.....جنڈانوالہ)

ہر ملاقات پر محسوس یہی ہوتا ہے
مجھ سے کچھ تیری نظر پوچھ رہی ہو جیسے
اس طرح پہروں تجھے سوچتا رہتا ہوں میں
میری ہر سانس تیرے نام لکھی ہو جیسے
(انتخاب۔شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

وفا کا زخم ہے گہرا تو کوئی بات نہیں
لگاؤ بھی تو ہمیں ان سے انتہا کا تھا
(ثروت شاہد.....کراچی)

تجھے دیکھے بنا تیری تصویر بنا سکتی ہوں
تجھے جانے بنا تیرا حال بتا سکتی ہوں
میری محبت میں اتنا دم ہے
اپنی آنکھ کا آنسو تیری آنکھ سے گرا سکتی ہوں
(ارم سلیم.....لاہور)

اپنی نگاہ کو تلوار کرنا پڑے گا
ورنہ ہمیں اب بے موت مرنا پڑے گا
بہت پھیل گئی ہیں بانہیں اجل کی
زندگی کے لئے موت سے لڑنا پڑے گا
(اقصیٰ رباب.....اوکاڑہ)

جن سے تھی امید وفا کی وہ بدل گئے
نفرتوں کے دیپ پھر پیار میں ڈھل گئے
چار سو تاریک راہیں اور ایسے میں تنہائیاں
چاہتوں کے کارواں خوشیوں میں مچل گئے
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

تمہارا جو سہارا ہو گیا
بھنور بھی اب کنارہ ہو گیا ہے
محبت میں بھلا کیا اور ہوتا احسان
میرا یہ دل اب تمہارا ہو گیا ہے
(احسان سحر.....میانوالی)

اندھیری شب میں اس کے اشاروں جیسے ہیں
وہ اس کے نین چمکتے ستاروں جیسے ہیں
بچھڑ کے ہم سے بظاہر وہ مطمئن ہے بہت
پیام اس کے مگر بے قراروں جیسے ہیں
(محمد اسحاق انجم.....کنگن پور)

بیٹھے ہیں تیری محفل میں کئی دوست نئے
اب تمہیں یار پرانے کی ضرورت کیا ہے
(عثمان شوکت.....کھڈیاں خاص)

اندھیرا ان سے بہتر ہے بجھا دو سب چراغوں کو
کرے گی خون پروانوں کا ناحق روشنی کب تک
(شیخ نوید.....کھڈیاں خاص)

اب نظر آتا نہیں لوگوں میں پہلا سا وقار
تھی جہاں میں جن سے تو قہر جہاں گم ہو گئے
(نعیم احمد زرگر.....کھڈیاں خاص)

جب سے ان پھولوں کو ہاتھوں سے چھوا ہے میں نے
ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہوں پھول میرے ہاتھ میں
(محمد عمر دراز.....کھڈیاں خاص)

ٹوٹ جائے نہ کہیں ترک محبت کی قسم
تیرے قدموں کے نشانوں سے بہت دور چلے
(محمد عمران.....کوٹھ کلاں۔کنگن پور)

رکھوں گا خیال تیرا عمر بھر کے لیے
بس تو اپنے آپ کو میری امانت کر دے
(محمد فیضان.....کراچی)

خطائیں دیکھ کر بھی عطائیں کم نہیں کرتا
میں اکثر سوچتا ہوں میرا رب مہربان کتنا ہے
(محمد ذیشان.....کراچی)

کبھی کبھی وہ مجھے اتنا پیار دیتا ہے
غموں کا بوجھ وہ دل سے اتار دیتا ہے
اسے بھی چاہیے رکھے خیال اس کا وہ
اگر کسی کو کوئی اعتبار دیتا ہے
تمہارا پھول سا چہرہ اگر نظر آئے
خزاں کے دور میں لطف بہار دیتا ہے
وہ پیار کرتا ہے جس سے بھی ٹوٹ کر، اس کو
تمام عمر شب انتظار دیتا ہے
نواز دیتا ہے اس کو وہ صبر کی دولت
اگر کسی کو دل بے قرار دیتا ہے
حکیم ملتا ہے جب مسکرا کے مجھ سے وہ
تھکن سفر کی بدن سے اتار دیتا ہے
(حکیم خان حکیم.....ضلع اٹک)

چھوڑ دو یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خود کو یوں بے حال رکھنا
غموں کے جمگھٹوں میں جاناں دل کا اپنے خیال رکھنا
یاد ہے دیار غیر میں جلنا سب سے خندہ رو رو کر
دل حزیں کا اے جانِ جاں یاد ایک ایک سوال رکھنا
بے ساختہ پن میری باتوں کا جو ہنساتا ہے اکثر تم کو
اداس لمحات کے لئے میری باتیں سنبھال کر رکھنا
عجب اندازے ہیں تو ڑے رشتے ناتے بوقت رخصت
برہم سا تھا اگرچہ پھر بھی کہا کہ اپنا خیال رکھنا
ہار جاتا ہوں چند باتوں میں جانِ من مجھے یاد رکھنا
کوئی تو دیکھے گفتگو میں اس کے فن کا کمال یاد رکھنا
بھول کر ساری رنجشیں میری یاد رکھنا
تربت پر تیری میری جان پھولوں کو یاد رکھنا
تیری یاد میں آنکھ میری کبھی نم ہوئی کہ نہیں واجد
ملا کبھی وہ تو ساری عمر مجھے یاد رکھنا
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

اسی سے مانگو جو شہہ رگ سے قریب ہے
جو مالک ہے قسمتوں کا
آقا ہے فطرتوں کا
داتا ہے خواہشوں کا
اسی سے کہنا جو مالک کل ہے
جس رحیم کا ہر فیصلہ اٹل ہے
جو رحمان عقل گل ہے
جو حسیب شہہ رگ سے قریب
کوئی آسرا نہیں اس کے سوا
وہی ہے جو چلاتا ہے صبا
اور کون ہے جو رواں کرتا ہے دریا
وہی تو ہے جو درد کو کرتا ہے دوا
اسی سے مانگو جو شہہ رگ سے قریب ہے
(الیس۔امتیاز احمد.....کراچی)

میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں، سنبھال اب مجھ کو
دکھوں کی کھائی سے آکر نکال اب مجھ کو
ہر ایک قصر تمنا گرا دیا میں نے
نہ امتحان محبت میں ڈال اب مجھ کو
جواب دینے کے قابل بنا دیا تم نے
مزا تو دے گا تمہارا سوال اب مجھ کو
مذاق جان رہا تھا تیری جدائی کو
اس حادثے پر ہوا ہے ملال اب تجھ کو
محبتوں سے یہ کشکول زندگی بھر دے
نہ اپنے در سے میری جان ٹال اب تجھ کو
نہ اس سے پہلے اتنا اداس تھا عاطر
ستا رہا ہے تمہارا خیال اب مجھ کو
(رانا حنیف عاطر.....جھڈو)

دل وجاں کی تمناؤں کو میرے نام رہنے دو
محبت کی گھنی چھاؤں کو میرے نام رہنے دو
سنو تم! میں نے اس دل کے لئے دنیا بھلا ڈالی
سو اس کی دھڑکنوں آہوں کو میرے نام رہنے دو
چمکتی شوخ آنکھوں کو نہ یوں موڑو کبھی مجھ سے

www.pdfbooksfree.pk

خدارا! دل کی آشاؤں کو میرے نام رہنے دو
اگر تم بے وفا نکلے تو مر جاؤں گی میں اس پل
وفا کی تم سبھی راہوں کو میرے نام رہنے دو
یہی مانو کہ میری آخری پہلی یہ خواہش ہے
محبت کی پناہ گاہوں کو میرے نام رہنے دو
کرو وعدہ کہ خانم کو کبھی تنہا نہ چھوڑو گے
تم اپنی ان کڑی بانہوں کو میرے نام رہنے دو
(فریدہ خانم.....لاہور)

ان کو شکوہ ہے کہ ہجر کیوں تڑپایا ساری رات
جن کی خاطر رات لٹا دی چین نہ پایا ساری رات
ان اندیشوں میں دل نے کیسے کیسے گھبرا کر
سینے کے دیوار ودر سے سر ٹکرایا ساری رات
خوب سجی یادوں کی محفل مہمانوں نے تاپے ہاتھ
ہم نے اپنا کوئلہ کوئلہ دل دہکایا ساری رات
ساری شب آنکھوں میں کاٹی درد بٹایا ساری رات
ان سے شکایت کس منہ سے ہو جن کے ہوں احسان بہت
جن کومل یاد نے دکھتا دل سہلایا ساری رات
گرد آلود تھا پتہ پتہ کلی کلی کجھلائی ہوئی
ٹوٹ کر یادیں برسی پر بوٹا نہلایا ساری رات
روتے روتے سینے پر سر رکھ کر سوگئی ان کی یاد
کون پیا تھا، کون پریمی، بھید نہ پایا ساری رات
وہ یاد آئے چمن کے آنسو تھے غم کی خاموش کتھا
میرے سامنے بیٹھ کے روئے دکھ نہ بتایا ساری رات
وہ یاد آئے جن کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا
سوجے نین دکھائے اپنے اور رلایا ساری رات
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

ہم تیری ادا رقم کرتے رہیں گے
تیرا کیا ہوا، برداشت ہر ستم کرتے رہیں گے
تم سکون وچین سے سو بھی جاؤ گی جاناں
ہم تیرے درد وکرب میں ماتم کرتے رہیں گے
تو نے چمن نشینوں کو شاد سے ناشاد کیا
پھر بھی ہم تجھے دعائے شاد صنم کرتے رہیں گے
تیری بے مروتی، بے مہری اور بے رخی پر بھی
اسباب دل جوئی ہم کرتے رہیں گے
تو ملے نہ ملے یہ اور بات ہے جاناں
تجھے پانے کی تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے
تیرا دیا ہوا ہر زخم گوارہ ہے دلکش کو
اب سے لے کر نزاع تک مدار عالم کرتے رہیں گے
(انتخاب: دلکش امیر پوری.....کہروڑ پکا)

ڈر ہے تو بھی بدل جائے گا اک روز پھر سے
جیسے لوگ بدل جاتے ہیں حالات کے ساتھ
گلشن میں صحرا میں تو ہی تو ہو جیسے
میری ہر آواز بدل جائے جذبات کے ساتھ
گفتگو کا فن بھی تجھے آنہ سکا کبھی بھی
میں شرمسار ہوں آج اپنے دوست کے ساتھ
کس کے درودیوار پر لکھا ہے نام پھر سے تیرا
کچھ لمحات بھی چاہیے ایک سہانی رات کے ساتھ
جل ہی گیا پھر سے آج میرا ہی آشیاں
کتنے غم اٹھائے ہیں تیری ہر بات کے ساتھ
تیرے ہاتھوں میں وفا کی کوئی لکیریں نہیں جاوید
کتنے ساون برسے ہیں پھر ہر برسات کے ساتھ
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

جب ماضی کی یادیں یاد کرکے رویا کرو گے تم
نہ نیند آئے گی نہ سویا کرو گے تم
اس وقت میری یاد تم کو بہت ستائے گی
جب کسی سے آنکھ ملایا کرو گے تم
تڑپے دل اور آہ بھی نہ نکلے زبان سے
چپ چاپ آنسو بہایا کرو گے تم
جذبات میں آکر جلا ڈالی میری ساری یادیں
اب کس طرح دل کو بہلایا کرو گے تم
موت تو برحق ہے جدا کر کے ہی چھوڑے گی نوری
وعدہ کرو کہ میری قبر پر آیا کرو گے تم
(غلام نبی نوری.....کھڈیاں خاص)

کبھی دیوار کی مانند تو کبھی در کی صورت
اپنی ذات میں لگتا ہے وہ گھر کی صورت
اس کی یاد میں دل نے اتنے اشک بہائے
من اپنا لگتا ہے مجھے سمندر کی صورت
سیلاب غم روکے نہیں رکے گا اب کہ
میری آنکھ پر اترا ہے یہ ابر کی صورت
(اقصیٰ رباب.....اوکاڑہ)

سبز مدھم روشنی میں سرخ آنچل کی دھنک
سرد کمرے میں مچلتی گرم سانسوں کی مہک
بازوؤں کے سخت حلقے میں کوئی نازک بدن
سلوٹیں ملبوس پر آنچل بھی کچھ ڈھلکا ہوا
گرمی رخسار سے دہکتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
نرم زلفوں سے ملائم انگلیوں کی چھیڑ چھاڑ
سرخ ہونٹوں پر شرارت کے کسی لمحے کا عکس
ریشمی بانہوں میں چوڑی کی کبھی مدھم کھنک
شربگیں لہجوں میں دھیرے سے کبھی چاہت کی بات
دونوں کی دھڑکنوں میں گونجتی تھی ایک صدا
کپکپاتے ہونٹوں پر تھی اللہ سے صرف ایک دعا
کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں زادہ
(احسان سحر.....میانوالی)

اسے کیا پتا کیسے ضبط کھویا جاتا ہے
وہ کیا جانے کیسے بنا نیند کے سویا جاتا ہے
اس شخص نے تو ہمیشہ مسکراہٹیں دیکھیں
اس کو کیا پتا کیسے تنہائی میں رویا جاتا ہے
بدل لیتے ہیں نگاہیں جان سے پیارے لوگ
مفلسی دکھاتی ہے ایسے حالات کبھی کبھی
سنا سنا کر اپنی مخلصی کے قصے
بھری بزم میں لوٹا ہے دوستوں نے ہمیں
اک پل میں میرا سکون چھین لیا اس نے
اپنی تمناؤں پر جس کو حاکم بنایا تھا میں نے

اک مدت سے بھٹک رہا ہے صحراؤں میں
اک کنول تیرے پیار کی شبنم کے لئے
اس دل کی حقیقت کو ہم آج تک نہ سمجھ پائے کنول
کل اسے کھو کر شاد تھا آج اسے پاکے رو پڑا
وہ میری سر زمیں کی فضا ڈھونڈ لاؤ
وہ چہروں کی شرم وحیا ڈھونڈ لاؤ
انصاف بک رہا ہے سرعام یہاں
میرے دیس کے حکمرانوں کا خوف خدا ڈھونڈ لاؤ
(مس فوزیہ کنول.....منڈی کنگن پور)

زندگی صرف اسی کی یاد میں گزارے جائیں
بس میری جاں تیرا نام ہی پکارے جائیں
جب یہ طے ہے کہ ہم تمہارے ہیں
پھر کیوں نہ یہ درودیوار سنوارے جائیں
جب تک ملے نہ تھے تب اور بات تھی
اب یہ تنہائی کے لمحے کیسے گزاریں جائیں
بزم احباب میں کچھ تو بھرم رکھو!
جب تک نہ رقیب سارے جائیں
سچ کہتے ہیں جھوٹ نہیں کہتے انجم
وفا کے کچھ قرض اب اتارے جائیں
(محمد اسحاق انجم-کنگن پور)

اک آرزو ہے پوری پروردگار کرے
میں دیر سے جاؤں وہ میرا انتظار کرے
اپنے ہاتھوں سے سنواروں زلفیں اس کی
وہ شرما کر محبت کا اظہار کرے
لپٹ جائے مجھ سے عالم مدہوشی میں
اور خوش وجان میں محبت کا اقرار کرے
ہوشب وصال ایسی یا رب
کہ بھیگی زلفوں سے مجھے بے قرار کرے
جب میں اسے چھوڑ کر جانا چاہوں
وہ رو رو کر ایک اور رات کا اصرار کرے

www.pdfbooksfree.pk

خدا کی قسم میں کسی اور کی ہوسکتی نہیں فاریہ
یہ وعدہ وفا وہ بار بار کرے
(فاریہ..........قصور)

تیری آنکھوں میں جو نشہ ہے وہ شرابوں میں کہاں
خوشبو تیرے بدن کی گلابوں میں کہاں
جگنو چاند ستارے تیرے حسن کے پجاری
تیرے لبوں کی تعریف کتابوں میں کہاں
تیری زلفوں سے گھٹاؤں نے رنگ وروپ لئے ہیں
تیری تتلیوں سی نزاکت مہتابوں میں کہاں
موروں نے تجھ سے سیکھی ہے ادائیں کیا کیا
جھومتی ہے تیری چال میں وہ غزلوں میں کہاں
پرواز تجھ سا حسین کہیں دیکھا نہیں جہاں میں
جو نشہ ہے تیرے نینوں میں وہ پیالوں میں کہاں
(بشیر احمد پرواز۔جنڈانوالہ)

راستوں میں بٹ نہ جائے کارواں میرا کہیں
قندیلوں پر کھو نہ جائے راز داں میرا کہیں
اس دفعہ خاموش ہوں میں تیری شہرت کے لئے
اور پھر نہ لے سکو گے امتحاں میرا کہیں
آسماں سے کیا شکایت اندھیروں سے کیا گلہ
تیرے قدموں نے نہیں دیکھا نشاں میرا کہیں
بارشوں کے وصل تک کوئی جئے تو کس طرح
آندھیوں سے جل نہ جائے آشیاں میرا کہیں
آنسو پونچھتا ہوں رات کے پچھلے پہر
اے ستارو! تم نے دیکھا؟ آسماں میرا کہیں
(چوہدری قمر جہاں علی پوری..........ملتان)

اس امید پر ہم نے دیا جلائے رکھا ہے
تیری راہ گزر پر دل بچھائے رکھا ہے
ہزاروں آندھیاں تھیں سر جوڑے کھڑی
اپنی لو سے انہیں ڈرائے رکھا ہے

بہت سالوں سے سونامی کی ضد میں
زلزلوں سے جسے بچائے رکھا ہے
بڑی ہمت سے ہم نے تم کو بولا ہے
حال دل جو برسوں چھپائے رکھا ہے
اس خوف سے تم سے بات نہیں ہوپاتی
ٹوٹ نہ جائے بھرم جو ہم نے بنائے رکھا ہے
تیری باتیں ہمیں ماضی میں لے جاتی ہیں
بڑی مشکل سے جس کو بھلائے رکھا ہے
کوئی نہیں ہے یہاں فقط تیرے سوا
قفل دل کو ہم نے لگائے رکھا ہے
آئے اور پلٹ نہ جائے تیری یاد
اسی لئے ہم نے خود کو جگائے رکھا ہے
(سلیم عباس کنول..........چینوٹ)

اے بے وفا جانے سے پہلے مجھے یہ بتلا کے تو جا
اے بے وفا جانے سے پہلے مجھے یہ سمجھا کے تو جا
کب تک میں اپنے دل کو یونہی بہلاتا رہوں گا؟
کب تک بے وفائیوں کے زخموں کو چھپاتا رہوں گا؟
کب تک میں تیرے خطوں کو یونہی جلاتا رہوں گا؟
کب تک میں تیرا نام لکھ لکھ کر مٹاتا رہوں گا؟
اے بے وفا جانے سے پہلے مجھے یہ بتلا کے تو جا
اے بے وفا جانے سے پہلے مجھے یہ سمجھا کے تو جا
کب تک دل میں تیری یاد کو میں آباد رکھوں گا؟
کب تک تیرے بنا اپنی زندگی میں برباد رکھوں گا؟
کب تک اپنے ہونٹوں پر محبت کی فریاد رکھوں گا؟
کب تک واپس آئے گا اور کب تک تجھے یاد رکھوں گا؟
اے بے وفا جانے سے پہلے مجھے یہ بتلا کے تو جا
اے بے وفا جانے سے پہلے مجھے یہ سمجھا کہ تو جا
(ندیم شہزاد..........نواب شاہ)

اک روز میرا اک اجنبی سے سامنا ہوگیا
دیکھتے ہی دیکھتے یہ دل اس کا دیوانہ ہوگیا
اس پری پیکر چہرے کی تعریف کروں کیا میں

جاتے جاتے وہ میرا دل بھی اپنے ساتھ لے گیا
گیا دل کش ادائیں تھیں ظالم کی
ان اداؤں سے تو وہ مجھے گھائل کرگیا
وہ مسکرائے تو آسماں سے پھول برسنے لگتے ہیں
وہ اپنی اسی مسکراہٹ سے تو مجھے پاگل کرگیا
میں کیسے بھلا دوں اس اجنبی چہرے کو مختار
وہ اجنبی چہرہ تو میری نیندیں بھی اپنے ساتھ لے گیا
(مختار علی کیانی..........تلی ضلع سبی)

سوچتا ہوں کہ اسے نیند بھی آتی ہوگی
یا میری طرح فقط اشک بہاتی ہوگی
وہ میری شکل میرا نام بھلانے والی
اپنی تصویر سے کیا آنکھ ملاتی ہوگی
اس زمیں پر بھی ہے سیلاب میرے اشکوں سے
میرے ماتم کی صدا عرش ہلاتی ہوگی
شام ہوتے ہی وہ چوکھٹ پر جلا کر شمعیں
اپنی پلکوں پر کئی خواب سلاتی ہوگی
اس نے سلوا بھی لئے ہوں گے سیاہ رنگ لباس
اب محرم کی طرح عید مناتی ہوگی
ہوتی ہوگی میرے بوسے کی طلب میں پاگل
جب بھی زلفوں میں کوئی پھول سجاتی ہوگی
میرے تاریک زمانے سے نکلنے والی
روشنی تجھ کو میری یاد دلاتی ہوگی
دل کی معصوم رگیں خود ہی سلگتی ہوں گی
جونہی تصویر کا کونہ وہ جلاتی ہوگی
روپ دے کر مجھے اس میں کسی شہزادے کا
اپنے بچوں کو کہانی وہ سناتی ہوگی
(ایم اشرف ملک اعوان..........بٹر شریف)

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سنو اپنے آپ کو برباد کرکے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کرکے دیکھتے ہیں
سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے متصل ہے بہشت
مکیں ادھر کے بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں
کسے نصیب ہے کہ بے پیرہن اسے دیکھے
کبھی کبھی درودیوار گھر کے دیکھتے ہیں
رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں
اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کرجائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں
(شاعر:احمد فراز۔انتخاب ایچ صابر علی..........چی)

ہمیں اب کے منانے تم چلے آتے تو بہتر تھا
ہمیں چہرہ دکھانے تم چلے آتے تو بہتر تھا
ہمیں تم سے محبت تھی ، تمہی کو چاہا تھا
ہمارا گھر بسانے تم چلے آتے تو بہتر تھا!
تمہی سے روٹھ کر ہم نے تمہارا شہر چھوڑا تھا
ہمیں واپس بلانے تم چلے آتے تو بہتر تھا!
تمہیں سوچا، تمہیں مانگا، تمہیں دل میں بسایا تھا
ہمیں اپنا بنانے تم چلے آتے تو بہتر تھا!
سنو کہ اب دسمبر کا مہینہ پھر سے آیا ہے!
وفا کے گیت گانے تم چلے آتے تو بہتر تھا
ہمارے وقت کی الجھن ابھی لمحوں سے لرزاں ہے
اگر صدیاں مٹانے تم چلے آتے تو بہتر تھا
ابھی تم نے جو لکھا ہے کہ تم ہو بیوفا راشد
ہمیں چاہت سکھانے تم چلے آتے تو بہتر تھا
(راشد ترین..........مظفرگڑھ)

www.pdfbooksfree.pk

آج وہ کیا رونق محفل ہوا
گوہر ہستی مجھے حاصل ہوا
دیکھنے کی پوچھتے ہو کیا ادا
دل کسی جانب نہ یہ مائل ہوا
میری کشتی تھی بھنور کے آس پاس
نہ سمندر اور نہ یہ ساحل ہوا
کانچ کے ٹکڑے پڑے تھے راہ میں
آپ سے ملنا بڑا مشکل ہوا
جب نگاہوں سے تم اوجھل ہوئے
کس قدر مایوس میرا دل ہوا
زندگی کی راہ میں رانا قدیر
میرا ہی ساتھی میرا قاتل ہوا
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

سفر تنہا نہیں کرتے
سنو! ایسا نہیں کرتے
یہ اونچے پیڑ کیسے ہیں؟
کہیں سایہ نہیں کرتے
محبت تو محبت ہے
اسے رسوا نہیں کرتے
زمانے سے چھپاتے ہیں؟
کبھی چرچا نہیں کرتے
جو پہلے ہی اکیلا ہو.....!
اسے تنہا نہیں کرتے
جسے جانے کی جلدی ہو
اسے روکا نہیں کرتے.....!
سحر سے پوچھ لو محسن
کہ ہم سویا نہیں کرتے
(ساحل دعا بخاری.....بصیر پور)

وہ شب بھر مجھے ستاتی رہی
وہ بار بار مجھے ابکاتی رہی
آؤ میں تمہیں سینے سے لگاؤں
کبھی اوندھے کبھی سیدھے منہ سوتی رہی
وہ سب بھر مجھے اضطراب کرتی رہی
میری چھاتی سے اپنی چھاتی لگاتی رہی
میں جب اکتا جاتی تو وہ معصوم بن جاتی
خود ہنستی رہی مگر مجھے رولاتی رہی
میں نے بازیابی چاہی بار بار اس سے
مجھے پکڑتی بھی رہی گنگناتی رہی
اے حاتم نسیم کو غلط مت سمجھنا
وہ کوئی اور نہ تھی تیری یاد تھی
(نسیم کنول علی پوری.....لودھراں)

چڑیا کب کی بھیگ رہی ہے
پتا پتا ٹپک رہا ہے
چڑیا پوری بھیگ چکی ہے
انگ انگ سے بول رہی ہے
اس موسم میں بھیگتے رہنا
کتنا اچھا لگتا ہے
(سنبل طہ.....پنڈ دادنخان)

ہر فرد یہاں پر تاجر ہے
ہر وقت تجارت ہوتی ہے
تم آپ ہی اپنے دام کہو
چپکے سے نہیں سر عام کہو
کیا لو گے اپنی یاری کا
کیا لو گے تم دلداری کا
غم خوار بنو گے کتنے میں؟
تم پیار کرو گے کتنے میں؟
سب جذبے میرے نام کرو
ہم نام تم اپنا دام کہو
پر دام چکانے کی خاطر
ہم اپنا دفتر کھولیں تو
ہم اپنی جیبیں ٹٹولیں تو
بس پیار ملے گا تھوڑا سا
اظہار ملے گا تھوڑا سا
یہ سکے یہاں کب چلتے ہیں
کیا ادھار ملے گا تھوڑا سا
یہ دنیا بے اعتباری کی
یہ عرض ہے ہر بیوپاری کی
چل چھوڑ تمنا جذبوں کی
ہم خالی ہاتھ ہی آئے تھے
چل خالی ہاتھ ہی جائیں ہم
(رانا ظفر اقبال.....جنڈ والہ)

منگیاں سی جو یار دعا واں
بن گیاں اور خار دعاواں
جس ویلے میں کلا ہووں
کردیاں نے تکرار دعاواں
رہ گیاں آسانوں تھلے
بے وس تے لاچار دعاواں
خبر کہڑے پاسے گیاں
منگیاں سن دوچار دعاواں
مظہر جدوی ہتھ چکنا واں
کر بیٹھن انکار دعاواں
(مظہر عباس مظہر.....مظفر گڑھ)

اونچی تیری شان ہے عظمیٰ
تو تو میری جان ہے عظمیٰ
تو میری ہوجائے اک دن
یہ میرا ارمان ہے عظمیٰ
تو بھی مجھ کو چاہتی ہوگی
مجھ کو تم پر مان ہے عظمیٰ
میرے غربت کے سفر میں
تو سونے کی کان ہے عظمیٰ
دلہن میں تجھ کو بناؤں!
تو تو میری آن ہے عظمیٰ
میں تم سے جدا نہ ہوں گا
یہ میرا ایمان ہے عظمیٰ
عماد تو تم بن ہے اکیلا
تو میری پہچان ہے عظمیٰ
(سید کاشف عماد شاہ.....پی)

☆☆☆

لیٹر پیڈ

محمد عمران سعید-لاہور

فضا میں جہاز تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف محوِ پرواز تھا کہ ڈبے میں موجود کلاک کی ٹک ٹک کی آواز ابھرنے لگی جسے سنتے ہی وہاں موجود افراد سراسیمہ ہو کر بدحواس ہوگئے اور پھر اچانک انکشاف ہوا کہ.....

اچانک سامنے موجود شخص کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر سرایت کرگئی۔لرزہ براندام دہشت ناک کہانی

ابھی بڑا جیٹ طیارہ رن وے سے بلند ہوا ہی تھا کہ مسافروں نے اپنے آپ کو اس لمبی فلائٹ میں جو بوسٹن جا رہی تھی۔وقت گزارنے کے لئے مختلف کاموں میں مصروف کرلیا تاکہ وقت پاس ہوجائے اور سفر بھی خوشگوار طریقے سے کٹ جائے۔کچھ لوگوں نے ٹی وی دیکھنا شروع کردیا تاکہ کوئی فلم دیکھی جاسکے، کچھ لوگ کتابیں اور میگزین وغیرہ میں مشغول ہوگئے۔دو بوڑھے لوگوں نے تاش کے پتے نکالے اور رمی کھیلنا شروع کر دی۔ڈاکٹر گورڈن نے اپنے بریف کیس میں سے ایک لیٹر پیڈ نکالا۔کچھ منٹ اس کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔پھر اپنے سامنے سیٹ ٹیبل پر رکھا۔اور اس پر لکھنا شروع کردیا۔اس مقالے پر اس نے ہفتوں محنت کی تھی اور اسے ایک معاصر جریدے میں شائع ہونا تھا۔

ڈاکٹر گورڈن جو درحقیقت سوشل سائنس کا پروفیسر تھا اس نے اس کی گرامر اور ترتیب کو مکمل کرنے میں اچھی خاصی محنت کی تھی۔آج اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے ساتھ والی دونوں سیٹیں فروخت نہیں ہوسکی تھیں اور ڈاکٹر کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ وہ بغیر کسی مُداخلت کے اپنے اسکرپٹ پر اچھی طرح غور و فکر کرسکے گا۔لیکن یہ تنہائی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔جب وہ دو صفحات لکھ چکا تھا۔اور تیسرا لکھنے جارہا تھا تو گرامر کے ایک نکتے پر غور کرنے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں اٹھائیں دوسرے لمحے وہ چونک پڑا۔

ایک سات آٹھ سال کی بچی اس کی سیٹ کے ساتھ کے چھوٹے سے تنگ راستے میں کھڑی تھی اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی لڑکی کی آنکھیں لمبی اور پتلی تھیں۔اور اس کے بالوں کی سرخ چوٹی کی جوڑی اس کے جینز کے لباس کے ساتھ لٹک رہی تھی۔

"ہیلو....." لڑکی نے کہا۔"میرا نام سوزی ہے کیا آپ پڑھنے میں مصروف ہیں؟"

"نہیں اصل میں، میں کچھ لکھ رہا تھا۔" ڈاکٹر گورڈن نے جواب دیا۔بچی کی آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ پھیل گئیں۔

"واؤ یہ تو بڑی زبردست بات ہے میں بھی جب بڑی ہونگی تو لکھوں گی.....کیا آپ فلموں کے لئے لکھتے ہیں؟" بچی نے کہا

"نہیں یہ اُس سے مختلف ہے۔میں سوشل سائنس کا پروفیسر ہوں اور اس وقت امریکن ہسٹری کے متعلق کچھ لکھ رہا ہوں۔" ڈاکٹر گورڈن نے کہا۔

"کیا میں کچھ دیر ادھر کے لیے ادھر بیٹھ جاؤں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو؟" بچی نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ بیٹھ جاؤ لیکن آپ کی ممی کہیں آپ کو ڈھونڈنا نہ شروع کردیں۔" ڈاکٹر گورڈن نے کہا۔

"میری ممی مرچکی ہیں ممی اور پاپا دونوں ایک کار حادثے کا شکار ہوگئے تھے۔اب میرے انکل میری دیکھ بھال کرتے ہیں۔"

www.pdfbooksfree.pk

"اوہ..." ڈاکٹر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے چہرے پر بچی کے لیے ہمدردی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس کی شادی تو نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ جب اس کی شادی ہو جائے گی تو اس کے بچے بھی ایسے ہی ہوں گے۔ صاف ستھرے پیارے سے۔ پھر اس نے پیار سے بے اختیار بچی کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔

"میرا بڑا بھائی بھی مر چکا ہے۔" بچی نے بتایا۔

"وہ گاڑی چلا رہا تھا کہ اس کی اور ڈیڈی کی گاڑی میں لڑائی ہوئی اور گاڑی ایک درخت سے ٹکرا گئی، میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تھی جس کی وجہ سے مجھے زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی اور میں ٹھیک ہو گئی تھی۔"

"اچھا بیٹی تو آپ کے انکل کدھر بیٹھے ہیں۔"

"سوزی۔ میرا نام سوزی ہے۔" بچی نے کہا اور انکل شیطان، میرے ساتھ نہیں آئے وہ کہہ رہے تھے کہ میں مصروف ہوں۔"

"انکل شیطان۔" ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ "یہ کیسا نام ہے۔"

"ان کا یہی نام ہے انکل شیطان۔" سوزی نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اکیلے سفر کر رہی ہو۔" ڈاکٹر گورڈن نے کہا وہ جانتا تھا کہ بعض اوقات چھوٹے بچوں کو اسٹیورڈز کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

"ہاں انکل شیطان" نے مجھے اکیلا جہاز پر بھیج دیا اور خود گھر چلے گئے تاکہ شراب پی سکیں۔" سوزی نے کہا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر گورڈن آگے سے کچھ کہتا۔ ایک اسٹیورڈ اُن کے نزدیک آیا۔

"میرا خیال تھا کہ میں اس لڑکی کو مصروف رکھوں گا لیکن آج فلائٹ میں کچھ رش زیادہ ہے کیا آپ زیادہ مصروف تو نہیں۔...ڈاکٹر۔ اسٹیورڈ نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔...سب ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر گورڈن نے کہا اور اسٹیورڈ واپس چلا گیا۔

"بوسٹن میں تمہیں کون لینے آئے گا۔" ڈاکٹر گورڈن نے پیار سے سوزی سے پوچھا۔

"انکل شیطان کا بھائی...." سوزی نے جواب دیا۔ "وہ مجھے بوسٹن ایئر پورٹ سے لے گا اور اپنے گھر لے جائے گا جہاں پر ایک نوکرانی میری دیکھ بھال کرے گی اور میں جب چاہوں گی وہ مجھے سمندر میں لانچ پر سیر کے لئے لے جایا کرے گا۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے لیکن اس مرتبہ شائد ایسا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے اس مرتبہ مجھے کوئی ایئر پورٹ پر لینے نہ آئے۔"

"اوہ نہیں سوزی..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارے انکل تم سے جھوٹ کیسے بول سکتے ہیں۔" ڈاکٹر گورڈن نے کہا

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں انکل۔ لیکن اس بار شاید ایسا نہ ہو۔ آپ کو نہیں پتہ کہ "انکل شیطان" مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں مر جاؤں تاکہ وہ میری ساری جائیداد پر قبضہ کر لیں۔ میں نے کئی بار "انکل شیطان" کو نشے میں یہ باتیں کہتے سنا ہے۔ رات بھی وہ یہ کہہ رہے تھے کہ مجھے امید ہے کہ تم جلد مر جاؤ گی اور میں تمہاری ساری دولت حاصل کر لوں گا۔"

"یہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ سوزی۔" ڈاکٹر گورڈن کا دل سوزی کی بات سن کر دھک سے رہ گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں انکل..... میرے ڈیڈی میرے لئے بہت دولت چھوڑ گئے ہیں لیکن جب تک میری عمر 18 سال کی نہیں ہو جاتی میں اس دولت کو حاصل نہیں کر سکتی اور "انکل شیطان" کو بھی اس دولت کا تھوڑا حصہ دیا جاتا ہے جس سے وہ میری دیکھ بھال کرتے ہیں اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ میں مر جاؤں اور وہ ساری دولت پر قبضہ کر لیں۔" سوزی نے تفصیل بتائی۔

ڈاکٹر گورڈن نے اس انداز سے سوزی کی طرف دیکھا جیسے اندازہ کر رہا ہو کہ سوزی کی بات میں کتنا افسانہ ہو سکتا ہے۔ لیکن سوزی کے چہرے سے ایسا بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ دوسری طرف سوزی جس طرح اپنے انکل کو "انکل شیطان" کہتے ہوئے ان کے متعلق بتا رہی تھی اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس طرح کے لوگ یقیناً دُنیا میں ہوتے ہیں جو

دولت کی خاطر کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔

"لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟" ڈاکٹر نے سوچا۔

"کاش! میرا ٹیڈی بیئر میرے پاس ہوتا....." سوزی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"کیوں کیا وہ تم ساتھ نہیں لائیں۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں انکل شیطان" نے اسے سوٹ کیس سے نکال کر اس کی جگہ ٹافیوں کا ڈبہ رکھ دیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بوسٹن میں ٹافیاں نہیں ملتی ہیں۔ اس لیے یہاں سے ٹافیاں لے جاؤ۔ اور وہاں پہنچ کر نیا ٹیڈی بیئر خرید لینا۔ سوٹ کیس میں اتنی جگہ نہیں کہ اس میں ٹیڈی بیئر بھی رکھا جا سکے۔"

"یہ تو بڑی احمقانہ بات کی تمہارے انکل نے بوسٹن میں ہر طرح کی ٹافیاں ملتی ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

سوزی نے اثبات میں سر ہلایا "انکل شیطان" ہر وقت جھوٹ بولتے رہتے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ اس ڈبے میں ٹافیاں بھی نہیں ہیں بلکہ ایک کلاک ہے۔"

"کلاک!!" ڈاکٹر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں میں نے خود اس ڈبے میں سے ٹک ٹک کی آواز سُنی تھی جب "انکل شیطان" تھوڑی دیر کے لئے باہر گئے تھے اور میں نے "انکل شیطان" کو بتایا بھی تھا کہ اس ڈبے میں سے ٹک ٹک کی آواز آ رہی ہے لیکن "انکل شیطان" نے کہا کہ بکواس بند کرو اور پھر سُوٹ کیس کو لاک کر دیا تھا۔"

خوف کی ایک لہر ڈاکٹر گورڈن کے جسم میں دوڑ گئی۔

"ٹک..ٹک..ٹک" ڈاکٹر نے خوف سے دل میں الفاظ دہرائے۔ اُس کی پیشانی یکا یک پسینے سے بھر گئی تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور پسینہ صاف کیا۔

"وہ سُوٹ کیس کدھر ہے سوزی۔ جلدی بتاؤ...؟ کیا وہ تمہاری سیٹ کے پاس رکھا ہے؟" ڈاکٹر نے تیز لہجے میں کہا۔

"نہیں انکل شیطان" نے وہ سُوٹ کیس ایئر پورٹ پر ایک آدمی کو دیا تھا جس نے ٹکٹ کا ٹیگ لگا کر کہا تھا کہ یہ سُوٹ کیس اب تمہیں بوسٹن میں جا کر ہی ملے گا لیکن میں جانتی ہوں کہ شائد یہ جہاز اب کبھی بوسٹن نہ پہنچے۔" ڈاکٹر گورڈن نے ایک خفیہ نظر مسافروں پر دوڑائی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب معصوم لوگ مارے جائیں گے۔ لیکن سیکیورٹی والے اس طرح غیر محتاط کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر گورڈن کا سر چکرانے لگا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ موت سے کیسے بچا جائے۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اسکرپٹ کے صفحے اُڑ اُڑ کر زمین کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن پھر اس نے اپنے اعصاب پر قابو پایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ وقت خوش قسمتی سے اسے ملا ہے وہ فوری طور پر کسی بھی نزدیکی ایئر پورٹ پر اُتر سکتے ہیں۔

اس نے ایک اسٹیورڈ کو سروس والی جگہ پر دیکھا جو اس سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے ہمت کر کے سوزی کا ہاتھ پکڑا اور سروس ایریا کی طرف جانے لگا اور سوچا کہ یہ اچھا ہے کہ لڑکی کی موجودگی میں ساری بات اسٹیورڈ کو بتائی جائے۔ جیسے ہی وہ سروس ایریا میں پہنچا تو اس لڑکی نے اچانک اپنا ہاتھ چھڑایا اور اگلے حصے کی طرف بھاگ گئی۔ اگلی طرف فرسٹ کلاس تھی۔

"کیا کر رہی ہو سوزی....." ڈاکٹر کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی اونچی ہو گئی۔ پھر وہ تیزی سے فرسٹ کلاس کی طرف بڑھا۔ تمام مسافر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سوزی ایک عورت کے ساتھ والی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کا بازو پکڑ کر اسے سیٹ سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن لڑکی اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کے ساتھ چپک سی گئی۔ اس عورت نے بھی ہاتھ میں ایک لیٹر پیڈ پکڑ رکھا تھا۔

"کیوں تنگ کر رہی ہو سوزی۔" اس عورت نے لیٹر پیڈ کو سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ اور وہ اسٹیورڈ کہاں ہے جسے میں نے کہا تھا کہ تمہیں کچھ دیر مصروف رکھے تاکہ میں اپنا اسکرپٹ مکمل کر سکوں۔ میں نے تمہیں اپنی نئی فلم "انکل شیطان" کے متعلق بتایا تو تھا۔ اب پلیز! مجھے اس پر تھوڑا سا کام کر لینے دو۔ مجھے ابھی یہ سوچنا ہے کہ ٹافیوں والے ڈبہ میں رکھے ہوئے ٹائم بم سے کیسے مسافروں کو بچایا جائے؟ پلیز! مجھے کچھ دیر کے لیے اسکرپٹ پر کام کر لینے دو۔" سوزی کی ممی مشہور "ہالی وُڈ رائٹر" نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

شمیکا

ڈاکٹر اختر ہاشمی۔کراچی

آخری قسط

ایک انسان اور ایک ماورائی مخلوق کی چاہت و خلوص اور دیدہ دلیری پر مبنی شر کے خلاف برسر پیکار، خوفناک حیرت ناک عجیب و غریب حالات و واقعات کے گرد گھومتی ہوئی سوچ کے افق پر محو پرواز اپنی نوعیت کی ناقابل فراموش دلفریبی سے معمور، دل میں کسک پیدا کرتی اپنی مثال آپ داستان حیرت جو کہ پڑھنے والوں کے ذہن سے برسوں محو نہ ہوگی۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنیوالی ایک زبردست اور حیرت انگیز روداد

"مجھ سے غلطی ہوگئی پپو، میں تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں، اب زندگی بھر تم سے زبردستی نہیں کروں گا، ہر کام تمہاری مرضی اور منشا کے مطابق ہوگا۔" لڑکے نے ندیا میں اترنے کے لیے اپنا پاؤں پانی میں رکھتے ہوئے کہا۔

"خبردار بالے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے اپنی عزت بہت پیاری ہے۔ میں اپنی عزت کی خاطر اپنی جان تک داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہوں۔ تم نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو میں اس ندیا کے گہرائی والے حصے میں کود کر اپنی جان دے دوں گی اور تم جانتے ہو کہ مجھے تیرنا نہیں آتا ہے اور یہ بھی جانتے ہوں کہ میں اپنی ضد کی پکی ہوں۔" لڑکی نے دو قدم اور آگے بڑھا دیئے۔ اب پانی اس کے پیٹ سے اوپر آچکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ندیا جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی اور گہری ہوتی گئی تھی۔ یہ لڑکی اسی گاؤں کی لگ رہی تھی۔ اس کو شاید معلوم تھا کہ ندیا کس جگہ پر کتنی گہری ہے۔ اس نے دو قدم مزید اٹھائے تو مجھے محسوس ہوا کہ لڑکی کو واقعی اپنی عزت کا بہت خیال ہے۔ یہ یہاں تک محبت کی رو میں بہہ کر چلی تو آئی مگر اس کو اپنے کم ظرف اور ہوس پرست محبوب کی نیت کا علم ہوسکا۔ لڑکا واقعی چالاک اور چال باز نظر آرہا تھا۔ ان دونوں کے چہرے چاندنی رات میں صاف نظر آرہے تھے اور پہچانے بھی جاسکتے تھے مگر یہ دونوں ہمارے لیے اجنبی ہی تھے۔

"پپو میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں واقعی شرمندہ ہوں اور جذبات کی رو میں اپنے آپ پر اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور تم سے دست درازی کی۔ پپو مجھے معاف کردو۔ میں واقعی شرمند ہوں اور تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ بھلا میں تمہیں کھو کر خود کو کیسے زندہ رکھ سکوں گا۔" لڑکے کی باتیں واقعی چکنی چپڑی تھیں۔

"ٹھیک ہے بالے، اگر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے تو اچھا ہے۔ مگر میں تمہیں معاف اسی وقت کروں گی جب تم یہاں سے گھر چلے جاؤ گے۔" لڑکی گو کہ کم عمر تھی مگر بلا کی ذہین تھی۔ وہ کسی طور پر بھی اپنے محبوب کا اعتبار کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ نجانے ایسی کیا حرکت اس کے محبوب سے سرزد ہوگئی تھی جس کی بنا پر وہ اس پر اعتماد نہیں کر رہی تھی۔ جب لڑکے نے دیکھا کہ وہ اس طرح نہ اسے قریب آنے دے گی اور نہ خود کنارے پر آئے گی۔

www.pdfbooksfree.pk

"اچھا ٹھیک ہے پپو۔ میں گھر جارہا ہوں۔ مگر تم اپنا خیال رکھنا۔ دیکھو زیادہ دیر پانی میں مت رہنا۔ پانی کی ٹھنڈک تمہاری طبیعت خراب کرسکتی ہے۔" لڑکا یہ کہہ کر پیچھے قدم ہٹانے لگا مگر کسی طرح بھی اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ واپس جائے۔ نجانے ایسا کیا محرک تھا جو اسے تحریک دے رہا تھا۔ کیا بات تھی جو اس کے قدم روک رہی تھی۔ اس کی محبوبہ کی ناراضگی کا باعث کیا چیز تھی۔ بہرحال وہ بادل نخواستہ اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ میں اور شمیکا درخت کی آڑ میں ہوگئے۔ وہ جھاڑیوں میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ہم ابھی سامنے آنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں اس محرک کی تلاش تھی جس نے لڑکی کو نوجوانی، تنہائی اور اس قدر چاندنی رات کے پُرکیف سماں ہونے کے باوجود خفا کردیا تھا۔ جب کافی دیر ہوگئی اور لڑکی نے خطرے ٹلتے محسوس کیا تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے پانی سے باہر آنے لگی۔ شمیکا نے فوراً مجھے چہرے کو دوسری طرف پھیر لینے کا کہا تو میں لڑکی پر سے نظریں ہٹا کر اس کی مختلف سمت دیکھنے لگا۔ مجھے شمیکا کی اس بات اور اچانک حکم کا مطلب سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میرے تجسس کو ختم کرنے کے لیے شمیکا نے سرگوشی کے انداز میں بتانا شروع کیا۔

"ارسلان، محسوس نہ کرنا کہ میں نے تمہیں رخ دوسری طرف پھیر لینے کو کہا۔ یہ میری التجا تھی، حکم نہیں تھا۔ دراصل اس لڑکی کا جسم ناف سے لے کر پاؤں تک برہنہ ہے۔ اس کے بدن پر فقط کُرتی رہ گئی ہے اور لہنگا غائب ہے۔ شاید یہی وہ دست درازی کی ہوگی اس کے محبوب نے، جس کی وجہ سے لڑکی اس قدر زیادہ بدظن ہوگئی ہے۔ اس کا محبوب بہت ذہین اور چالاک تھا مگر بے وقوف بھی۔ اس نے اس لڑکی کی مرضی معلوم کیے بغیر یا اسے راضی کیے بغیر اپنانے کی کوشش کی ہوگی اور اپنانے میں بھی عجلت کا مظاہرہ کیا ہوگا یا شاید اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا ہو۔ بہرحال اس کشمکش اور چھینا جھپٹی میں شاید لڑکی کا لہنگا ندیا کے پر زور پانی میں بہہ گیا ہے۔ دیکھو لڑکی نہایت شرمساری محسوس کررہی ہے اور بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہی ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کیا کرے، کہیں ایسے میں اس پر کسی شخص کی نظر پڑ گئی تو کیا کرے گی۔ شرمندگی کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا اور اگر خدانخواستہ کسی مرد کی نظر میں آگئی تو پھر وہ اپنے محبوب سے تو ڈوب مرنے کی دھمکی دے کر بچ گئی مگر اس مرد سے نہ بچ سکے گی جس کی اس پر نظر پڑے گی۔ تم یہیں ٹھہرو، میں اس لڑکی کو نہ صرف دلاسا دے کر آتی ہوں بلکہ اس کا جسم بھی ڈھانپتی ہوں۔ جب تک میں نہ کہوں تم اس طرف نہ آنا۔ ورنہ وہ شرم سے پانی پانی ہوجائے گی اور ہم سے نظر تک ملا نہیں سکے گی۔ جب اس کو پتا چلے گا کہ ہم نے اس کی اور اس کے محبوب کی ساری باتیں سن لی ہیں اور اسے اس حالت میں دیکھ بھی لیا ہے تو وہ حیا سے زمین کے اندر گڑ جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے شمیکا اس لڑکی کی طرف روانہ ہوگی اور میں اسی درخت کی اوٹ میں دوسری جانب رخ کیے کھڑا رہا۔

کچھ دیر بعد میں نے قدموں کی آہٹ سنی تو سمجھ گیا کہ شمیکا اور وہ لڑکی میری جانب آرہی ہیں۔

"یہ میرے شوہر ہیں۔" شمیکا نے لڑکی کو بتایا۔ "ہم چائنا ریستوران میں کھانے کے لیے جارہے تھے کہ تمہاری چیخ اور بلند آواز میں بولنے کی آواز سنی تو اس طرف کا رخ کیا۔ دیکھا تو تم ندیا کے بیچ میں کھڑی تھیں اور وہ تم کو باہر بلانے کے لیے چکنی چپڑی باتیں کر رہا تھا۔ دیکھو پپو، ایک لڑکی کے پاس سب سے قیمتی چیز اس کی عزت و عصمت ہوتی ہے۔ وہ لٹ جائے تو پھر وہ مفلس و کنگال ہوجاتی ہے۔ لہٰذا تم ہمیشہ احتیاط سے کام لینا اور ایسے ہوس پرست انسانوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا۔"

شمیکا خاموش ہوئی تو پپو نے سلام کیا۔ میں نے جواب دے کر کہا۔

"شمیکا تم پپو کو اس کے گھر تک چھوڑ دو، میں یہیں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ جب تم آجاؤ گی تو ہم چائنا

ریستوران چلیں گے۔"

"نہیں بھائی جی، باجی نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، میں اس کا ہی بدلہ چکا نہیں سکوں گی۔ آپ میرے لیے مزید تکلیف نہ اٹھائیں۔ میں خود چلی جاؤں گی اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔" لڑکی کا چہرہ شرم و حیا سے سرخ ہورہا تھا۔ وہ نہ صرف حد درجہ ندامت محسوس کر رہی تھی بلکہ ٹھنڈے پانی اور سرد موسم کے اثرات کی وجہ سے بھی اس کی طبیعت مضمحل لگ رہی تھی۔

"اگر بالا راستے میں پھر مل گیا اور تمہارا اس نے راستہ روک لیا تو پھر کیا کرو گی؟" میں نے اس کو خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھائی جی، اب وہ کمینہ ناکامی کے بعد اور میرے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہونے کے بعد میرا راستہ روکنے کی جرات نہیں کرے گا۔" پپو نے ذرا حوصلہ مندی سے کہا۔

"تم ابھی کم سن اور نادان ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔ اور یاد رکھو کہ ناگ اور مرد کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا کہ وہ کب بے خبر پا کر عورت کو ڈس لے۔ اس کے بعد اپنی غفلت اور بے بسی پر پچھتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں پپو تمہارے بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں، عورت بے حد کمزور ہوتی ہے۔ وہ ہزار چالاک ہو، عقل مند ہو مگر مرد کے بچھائے ہوئے جال میں کسی نہ کسی طرح پھنس ہی جاتی ہے۔ چلو میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں اور ہاں تمہارے گھر والوں کو اتنی رات تک باہر رہنے اور اکیلے جانے کا جواز بھی پیش کرنا ہے جو میں نے اپنے ذہن میں تیار کرلیا ہے۔" شمیکا کے سمجھانے پر وہ مجھے شکر گزار نگاہوں سے خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ شمیکا نے اپنا شرارہ نما لباس اسے پہنا دیا تھا اور دوپٹے نما کپڑے سے اس کے اوپر کا تن ڈھانپ دیا تھا۔ اور خود شمیکا زیر جامہ میں تھی جو لباس کے ساتھ پہنا جاتا ہے۔ وہ چوڑی دار پائجامے جیسا چست تھا۔ میری نظر شمیکا کی گوری گوری پنڈلیوں سے چٹ کررہ گئی تھی۔ جب وہ نظروں سے دور ہوگئی تھی، مجھے بھی سردی کا احساس ہوا۔ ٹھنڈ بڑھتی جارہی تھی۔ میں اسی درخت کے نیچے سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا تھا اور شمیکا کا انتظار کرنے لگا۔

شمیکا کافی دیر کے بعد آئی تو مجھے اس کے چہرے پر غم و غصے کے آثار نظر آئے۔ اور اس کا لباس بھی بدلا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟" میں نے آتے ہی شمیکا سے دریافت کیا۔

"دنیا بڑی ظالم چیز ہے۔ نجانے کیسے کیسے کالی نیتوں کے بھیڑیے انسانی روپ میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ اس کائنات کا نظام اور نظم و نسق اس کے ہاتھ میں ہے۔ ورنہ فرعون کی طرح ہر شخص خود کو خدا کہلانے لگے۔" شمیکا نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"آخر مجھے بھی تو پتا چلے کہ ہوا کیا ہے۔ تم یہ جلی کٹی باتیں کیوں سنا رہی ہو۔ کیا کوئی پپو کے ساتھ راستے میں حادثہ پیش آگیا ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔" میں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جب میں پپو کو لے کر اس کے گاؤں، اس کے گھر کی طرف جارہی تھی، تب ہمیں سامنے سے بالا آتا نظر آیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اس کے دو دوست اور بھی تھے۔ بالے نے ہمارے سامنے رک کر دوستوں سے کہا۔

"لو بھئی ہم تو ایک شکار کی تلاش میں یہاں تک آئے تھے یہ تو دو شکار خود چل کر ہمارے پاس آگئے ہیں۔" یہ سن کر اس کے ایک دوست نے کہا۔

"ہاں بھئی شکار بھی ہرنیاں ہیں۔ ان کا گوشت نوچنے اور کھانے میں بڑا مزہ آئے گا۔" دوسرے دوست نے للچائی ہوئی نظروں سے پہلے پپو اور پھر میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور بولا۔

"یار بالے، تجھے تیری محبوبہ مبارک، ہمیں تو یہ

www.pdfbooksfree.pk

والی ہرن چاہیے۔ وہ قہقہے مار مار کر ہنس رہے تھے اور ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ پپو نے بالے کو غیرت دلانے کے لیے کہا۔

"بالے ابھی کچھ دیر پہلے تو تم اپنی محبت کو خدا اور عبادت کا درجہ دے رہے تھے اور ابھی تم اس کمینے پن پر اتر آئے ہو۔ تم تو کہہ رہے تھے محبت تو روحوں کی ہوتی ہے جسموں کا ملاپ ضروری نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ تینوں ایک بار پھر ہنسنے لگے اور بالے نے کہا۔

"پپو یہی باتیں کر کے ہم نے کئی لڑکیوں کی عزتیں لوٹی ہیں۔ تم خوش قسمت تھی کہ میرے سفاک پنجے میں آنے سے پہلے ہی بچ کر ندیا کے بیچ جا کھڑی ہوئی اور ڈوب مرنے کی دھمکیاں دینے لگی۔ میں تمہارے کہنے سے چلا تو آیا تھا مگر کافی دیر جھاڑیوں میں چھپا رہا کہ تم اسی طرف سے گزرو گی تو میں تمہیں یہی پر دبوچ کر بے آبرو کر دوں گا مگر تم نے آنے میں دیر لگائی اور پھر میں ایسا موقع اور اس سہانے موسم کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ خطرہ بھی محسوس ہوا کہ کہیں تم بچ کر نہ چلی جاؤ۔ میں اپنے ساتھ اپنے ان دو دوستوں کو بھی لے آیا جنھوں نے بارہا میری ایسے کاموں میں دل کھول کر مدد کی ہے۔ اس مدد کا عوض میں انھیں اپنا جوٹھا کھانے کی اجازت دے دیتا ہوں اور یوں ہم مل بانٹ کر اکثر اوقات پر ضیافت دعوتیں اُڑاتے رہتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی اور بولتا، اور میرے کانوں میں زہر گھولتا میں نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم تینوں وہ مجرم ہو، جنھوں نے اپنے اپنے جرائم کا اعتراف خود کر لیا ہے اور اپنے اپنے گناہ اور جرم بھی گنوا دیئے ہیں۔ تم میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کے گناہ کا عینی شاہد بھی ہے اور گواہی بھی دے رہا ہے کہ ایک نے دوسرے کو گناہ اور جرم کرتے دیکھا ہے۔ اب اس ویرانی اور تنہائی، جس میں تم نے اکثر گناہ کیے ہوں گے اور کوئی دیکھنے والا نہیں ہوگا۔ اس ویرانی اور تنہائی میں اور اس ان دیکھی اور غیر وجود عدالت میں تمہیں تمہارے اقبالِ جرم پر عبرت ناک سزا دی جائے گی۔ ایسی سزا جس کو دیکھ کر تم جیسے ہوس پرست نوجوان زنا الجبر کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھیں اور زنا کے نام ہی سے تھر تھر کانپنے لگیں گے۔" میری باتیں سن کر ان تینوں کے ہوش اُڑ گئے، ان کے اوسان خطا ہونے لگے تو ایک نوجوان جو کہ سب سے زیادہ تن درست اور توانا تھا، آگے بڑھ کر بولا۔

"یہ گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ بھلا یہ نازک ہاتھ اور ہم جیسے کڑیل نوجوان کو سزا دیں، ناممکن۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پپو کی کلائی پکڑ لی۔ پپو نے انتہائی خوف زدہ ہو کر کہا۔

"دیکھو باجی میری محسن ہیں۔ ان کو کچھ مت کہنا۔" میں نے پپو کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے، اس نوجوان کے ایک جناتی طاقت کا بھرپور مکا مارا تو وہ زمین چاٹنے لگا۔ دوسرا آگے بڑھا تو اس کے پیٹ میں ایسی لات لگی کہ وہ بلبلانے لگا۔ دونوں کی حالت دیکھ کر تیسرے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ مجھ پر حملہ کرے مگر اپنے دوستوں کے نامردی کے طعنوں سے بچنے کے لیے وہ بھی مجھ پر حملہ آور ہوا، اور گردن پکڑ کر زمین پر بری طرح لوٹنے لگا۔ جیسے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ وہ تینوں بے بسی سے زمین پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے، پپو خلافِ توقع یہ منظر دیکھ کر جہاں حیرت زدہ تھی وہاں خوشی کے تاثرات اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ظالم و سفاک درندوں کی طرف بڑھی تاکہ ان کو ان کے جرائم اور گناہوں کی سزا دے سکوں۔ انہیں سزا دینا ناگزیر تھا۔ ورنہ نجانے یہ درندے کتنی اور معصوم سی اور بے گناہ لڑکیوں کی عزت و عصمت سے محروم کرتے رہتے۔

جب ایک نوجوان کی ٹانگ پر میں نے ٹانگ رکھ کر چیرا لگایا تو اس کی فلک شگاف چیخ فضا میں بلند ہوئی اور معدوم ہوگئی۔ باقی دونوں یہ روح فرسا منظر دیکھ کر مجھ سے معافیاں مانگنے لگے۔ ایک نے تو پپو کے

پاؤں پکڑ کر بھی معافیاں مانگیں مگر سفاک اور ستم گر ہمیشہ یہی کرتا ہے جب اس کا دور ہوتا ہے تو وہ ظلم و ستم کی انتہا کر دیتا ہے۔ خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے اور جب اوٹ پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو پھر عاجزی و انکساری اور رحم و کرم کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔ میں نے بھی ان سے یہی کہا۔

"جب تم کسی سادہ لوح لڑکی سے اس کی عزت زبردستی چھین رہے ہوتے تھے وہ بھی تو تم سے معاف کر دینے کی، اسے چھوڑ دینے کی التجا کرتی ہوگی اور تم رحم نہیں کھاتے ہوں گے۔ وہ تمہیں اللہ و رسول اور رام و دیوتا کے واسطے دیتی ہوگی مگر تم شیطانیت کی پوجا کرتے ہوں گے۔ لہٰذا اب اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے تو میں کیوں تم پر رحم کروں۔ کیوں انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑو۔ میں نے یکے بعد دگر دونوں نوجوانوں کے بھی چیرہ لگا دیا اور ان کے نیم مردہ جسموں کو جھاڑیوں میں پھینک کر پپو کے گھر روانہ ہوگئی۔ ان کے نیم مردہ جسموں کو اس لیے جھاڑیوں میں پھینک دیا کہ وہ زخمی حالت میں تڑپ تڑپ کر جان دیں۔ تاکہ ان کو ان سادہ لوح لڑکیوں کی آہ و فغاں اور درد و کرب کا احساس ہو سکے جنھوں نے ان کے آگے اپنی عزت و عصمت کو اس طرح روتے بلکتے اور تڑپتے ہوئے دم توڑتے دیکھا۔" شمیکا نے ایک طویل سرد آہ بھری اور پھر گویا ہے۔

"اس کے بعد میں پپو کو چھوڑنے کے لیے اس کے گھر چل دی۔ گھر کے سبھی افراد جاگ رہے تھے اور بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ گھر کے ہر ہر فرد کے چہرے پر اضطراب و بے چینی کے اثرات تھے۔ وہ تذبذب کے عالم میں کچھ کر گزرنے کے لیے بے تاب تھے مگر ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔ ان کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پپو رات میں کہاں گئی ہے اور اس قدر دیر کیوں ہوگئی ہے۔ دروازے پر دستک پا کر سبھی دوڑ آئے۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے ہر فرد پپو سے سوالات کی بوچھار کرتا اور میرے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا۔ میں نے ان کی حیرانی کو دور کرتے ہوئے کہا۔

"میں ندیا کے کنارے پپو کو سیر کرانے لے گئی تھی۔ یہ مجھے بہت اچھی لگی اور پیاری بھی۔ میں نے اسے اپنی دوست بنا لیا ہے۔ پپو نے مجھے کہا بھی تھا کہ اس کے گھر والے پریشان ہوں گے اور اس کی راہ دیکھ رہے ہوں گے مگر میں نے اصرار کر کے اسے اپنے ساتھ رکھا۔ اور اب آپ کے پاس لے آئی ہوں۔ برائے مہربانی ایک اجنبی عورت سمجھتے ہوئے میری اس خطا کو معاف فرما دیں اور درگزر کریں کہ پپو کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اور پھر میں ان سب کو دم بخود چھوڑ کر واپس آنے لگی تو پپو نے میرا بے حد شکریہ ادا کیا اور اس کی عزت بچانے اور گناہ گاروں کو عبرت ناک سزائیں دینے کا احسان نہ بھولنے کا کہا۔ یوں میں ان سب کو تشویش ناک اور تشنگی کی حالت میں چھوڑ کر یہاں آ گئی۔"

شمیکا نے تمام روداد اور کارروائی سے مجھے آگاہ کیا۔ میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور اس کی عظمت کو سلیوٹ کیا۔ اس کا سر شرم و حیا سے جھکتا چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ تمام رات یہیں پر گزر جاتی۔ میں نے شمیکا کا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چائنا ریستوران کی طرف جانے لگا۔ بہت جلد ہم چائنا ریستوران میں جا پہنچیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت تھی کہ یہ ایک چھوٹا سا مگر خوب صورت اور صاف ستھرا ہوٹل تھا مگر غور کرنے پر پتا چلا کہ یہ چھوٹا ہوٹل نہیں ہے بلکہ گراؤنڈ فلور کے علاوہ میزنائن فلور پر بھی کھانے پینے کا انتظام ہے اور پہلی منزل پر قیام و طعام کا اہتمام بھی، بہرحال میں شمیکا کو لے کر میزنائن فلور پر گیا اور ایک میز منتخب کی۔ ویٹر کو آرڈر دیا اور کھانا جلد لانے کو کہا۔ ویٹر بھی بہت چست آدمی تھا۔ سرعت سے آرڈر لے آیا اور ہم نے "پہلے پیٹ پوجا اور پھر کام دوجا" کے محاورے پر عمل کیا۔ کھانا بڑے مزے کا تھا۔ ہم دونوں بھوک سے نڈھال کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ خوب مزے لے لے کر پر لطف ضیافت کا لطف اٹھا رہے تھے اور لذیذ اور مزے دار کھانوں کے مزے بھی لے رہے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

"کیا تمھارا پیٹ ہمارے کھانوں سے بھر جاتا ہے۔" میں نے کافی دیر بعد شمیکا سے سوال کیا تو گفتگو کا آغاز ہوا۔

"ہاں۔ جب سے مجھے ایک عالم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر کھانے شروع کرنے کا درس دیا ہے، تب سے نہ صرف پیٹ بھرنے لگا ہے بلکہ مزہ بھی آنے لگا ہے اور حقیقی طور پر خدا کی نعمتوں کا ٹھیک طور پر ذائقہ بھی۔" شمیکا نے انگلیاں چاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"ورنہ بسم اللہ پڑھنے سے پہلے کیا ہوتا تھا؟" میں نے جنات کے بارے میں دوسرا سوال کیا تاکہ میری معلومات میں مزید اضافہ ہو سکے کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ شمیکا جو بات بتائے گی وہ مستند اور تجربے والی ہوگی۔

"بسم اللہ پڑھنے سے پہلے چاہے ہم خوراک کا کتنا بڑا ذخیرہ کھا جاتے تھے مگر بھوک اپنی جگہ قائم رہتی تھی اور تشنگی بھی، چاہے ہم مشروبات کے ڈرم کے ڈرم پی جائیں اور ہاں اس قسم کا لطف اور ذائقہ بھی نہیں آتا تھا۔" شمیکا نے چٹخارہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنات نے بھی جان لیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام میں بے حد تاثیر ہوتی ہے اور وہی ہر چیز کا مالک وخالق ہے۔" میں نے اس کے عقائد جاننے کی کوشش کی۔

"ہاں ارسلان، یہی حقیقت ہے اور ہماری ایمانیات کا حصہ بھی کہ وہ خدائے بزرگ وبرتر اور وحدہٗ لاشریک خدا ہی اصل کائنات کا خالق اور تمام جن وانس، جمادات، نباتات، حیوانات، حشرات الارض، فرشتوں یعنی نوری، خاکی مخلوق کا مالک حقیقی بھی ہے۔ ہم اس کی عبادت کرتے ہیں اور اسی سے اپنی ضروریات طلب کرتے ہیں۔ اسی سے اپنی حاجتوں کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اسی کو پوجتے ہیں۔"

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ شمیکا میری ہم مذہب ہی نہیں بلکہ ہم مسلک بھی ہے اور راسخ العقیدہ بھی۔

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ جنات کی حقیقت میں خوراک کیا ہے؟" میں نے مزید پوچھا۔

"جنات کی حقیقت میں اصل غذا پتھر، ہڈیاں ہیں لیکن اس صورت میں جب وہ جنات کے روپ میں ہوں اور جب انسان کے روپ میں ہوں تو وہ بھی کچھ کھا پی لیتے ہیں۔" شمیکا نے قرآن کے مطابق بیان دیا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کی معلومات مذہب اسلام کے بارے میں کسی طور پر بھی کم یا معمولی نہیں۔

"اچھا یہ بتاؤ" میں نے کھانے سے فارغ ہوتے ہوئے پوچھا۔ "میں نے سنا ہے کہ جن گوبر وغیرہ بھی کھاتے ہیں؟" میں نے نظر جھکا کر کہا، کہیں وہ اس سوال کو محسوس نہ کرے۔

"ہاں جنات کی خوراک گوبر بھی ہے مگر ان جنات کی جو سرکش اور کافر جن ہوتے ہیں، وہ جن گوبر پر گزارا کرتے ہیں۔ شاید قدرت کی طرف سے یہ ان کی سزا بھی ہے۔ مگر مسلمان اور شریف جن پتھر اور ہڈیاں کھاتے ہیں۔" شمیکا نے خوش گفتاری سے جواب دیتے ہوئے وضاحت کی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی اور معلوماتی سوال کر کے اپنے علم میں اضافہ کرتا، مجھے کسی عورت کی آہ و زاری کی آواز سنائی دی۔

"کیا تم نے بھی کوئی آواز سنی ہے؟" میں نے شمیکا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں مجھے بھی کسی بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی ہے۔ جیسے وہ کسی ظالم وجابر شخص کی منت سماجت کر رہی ہو، لیکن میں حیران ہوں کہ آواز کہاں سے سنائی دی ہے۔" ہم آواز کی سمت پر غور کرنے لگے۔ اتنے میں ویٹر آیا تو میں نے جیب سے بٹوہ نکالنا چاہا۔ مگر بٹوا جیب میں نہیں تھا۔ مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ تب میں نے دوسری جیبوں میں بٹوہ ٹٹولا مگر نہ مل سکا۔ میں بد حواس ہو کر کھڑا ہو گیا اور ایک بار پھر تمام جیبوں کو کھنگال ڈالا مگر بٹوہ نہیں مل سکا۔ ویٹر میرا منہ حیرت سے تکنے لگا۔ میں بدحواس اس لیے ہو گیا تھا کہ وہ کوئی عام

بٹوہ نہیں تھا، جسے کھو جانے پر بازار سے دوبارہ خرید لیا جائے۔ وہ ایک جادوئی بٹوہ تھا جو کبھی خالی نہیں ہوتا تھا۔ شمیکا میری اس بدحواسی سے لاعلم تھی۔ وہ شاید اس بوڑھی عورت کی آواز کی سمت کان لگائے ہوئی تھی۔

میں نے ویٹر سے معذرت چاہی اور کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا۔ میں نے تذبذب کے عالم میں ایک نظر شمیکا کے چہرے پر ڈالی تو وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کے زیر لب ایک دل فریب مسکراہٹ بکھر رہی تھی، جسے وہ زبردستی ضبط کیے ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ شمیکا چاہتی تو میری اس بے بسی اور مجبوری سے بہت فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ مجھے مزید پریشان اور پشیمان کر سکتی تھی مگر وہ ایک رحم دل لڑکی تھی۔ اس سے میری شرمندگی برداشت نہ ہوئی تو اس نے مٹھی کھول کر بٹوہ میرے سامنے کر دیا۔

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور شمیکا کا شکریہ بھی۔ ندامت سے خود کو بچانے کے لیے فوراً بٹوہ اٹھایا اور اس میں سے ویٹر کو بل ادا کیا۔ جب ویٹر چلا گیا تو میں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹوں کو جنبش دی ہی تھی کہ شمیکا نے بتایا کہ یہ بٹوہ اس درخت کے نیچے پڑا تھا جس درخت کے ساتھ مجھے رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ لہٰذا شمیکا کی نظر پڑی تو اس نے اٹھا لیا تھا اور شمیکا نے اس بات کی بھی معذرت چاہی کہ اس نے میری اجازت کے بغیر اس بٹوے میں سے کافی رقم نکال کر پینو اور اس کے گھر والوں کو بطور امداد دے دی تھی۔

ایک بار پھر میں نے شمیکا کی عظمت کو سلام کیا۔

بوڑھی عورت کے چیخنے چلانے کی آواز دوبارہ آنے لگی تو میں نے ویٹر کو بلا کر پوچھا۔

"یہ کون عورت ہے اور اس پر ظلم وستم کیوں کیا جا رہا ہے۔" ویٹر میری طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"بتاؤ بھئی، یہ ظالم وجابر کون شخص ہے؟"

"صاحب آپ دونوں اس جگہ پر اجنبی معلوم ہو رہے ہیں۔ آپ کو یہاں کے بھائی لوگوں کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ لوگ کچھ بھی کالا کریں یا سفید کسی کو دخل اندازی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک شخص نے غیرت سے مجبور ہو کر ان کے خلاف آواز اٹھائی تو ان بھائی لوگوں نے اس کی نوعمر بیوی کی تمام لوگوں کے سامنے آبروریزی کی تھی۔" ویٹر نے ہماری بھلائی کے لیے بتاتے ہوئے کہا۔

"جناب آپ اپنے کام سے کام رکھیں اور اپنے شہر یا گاؤں کو چپ چاپ لوٹ جائیں ورنہ.....!" ویٹر نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تمہارے مشورے کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے ویٹر کی حیرانی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جناب ہمیں صرف اتنا بتا دیں یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے کیوں کہ پورے ریستوران میں اس قسم کے افراد کہیں موجود نہیں ہیں۔" ویٹر نے ایک بار پھر ہمارا جائزہ لیا اور ذرا ہمارے قریب ہو کر کہنے لگا۔

"اس ریستوران کے جو کمرے قیام کے لیے ہیں، ان میں سے ایک کمرے پر یہاں کے ایک ظالم شخص نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے بدمعاش دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کرتا ہے بلکہ نوجوان اور سیدھی سادی لڑکیوں کو بھلا پھسلا کر، یا اس کے ساتھی اپنے جال میں پھانس کر لاتے ہیں اور وہ ان کی آبرو ریزی کرتے ہیں۔ ان کی بے حیائی اور بے شرمی کی حرکات سے سبھی لوگ پریشان ہیں۔ دل میں برا جانتے ہیں مگر ہاتھ سے ان میں روکنے کی طاقت نہیں ہے۔" ویٹر کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر خاموش ہو گیا۔

"یہ تو تمہارا انعام، معلومات فراہم کرنے کا۔" میں نے ہزار کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم کچھ اور معلومات رکھتے ہو تو وہ بھی بتا دو۔" میں نے اس کا ذہن ہلکا کرنے کے لیے پوچھا۔

"دراصل ان لوگوں کی ہمت اس لیے اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس علاقے کی پولیس کو بھتہ پہنچایا جاتا ہے اور اس گاؤں کے چودھری کو بھی وہ نوجوان لڑکیاں پیش کی جاتی ہیں۔" ویٹر نے ہزار کا نوٹ جیب میں رکھتے

www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کہا۔

"لیکن یہ لوگ کون ہیں اور یہ سب گھناؤنی حرکات کیوں کرتے ہیں؟" میں نے مزید پوچھا۔

"درحقیقت اشرف عرف اچھو ہیروئن کا اسمگلر ہے۔ وہ نشے کا زہر ان بھولے بھالے اور سادہ لوح دیہاتیوں کی رگوں میں اتار دینا چاہتا ہے جو اس لت سے نفرت کرتے ہیں اور ان کے پاس اتنا مہنگا نشہ خریدنے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں اور اچھو کے جگری دوست موہن کو عورت بازی کا شوق ہے جبکہ اس کے تمام چیلے حرام خوری اور مفت کی شراب نوشی کے لیے ان لوگوں کے ساتھ دے کر انسانوں کو ظلم و ستم کی چکی میں پیستے ہیں۔" ویٹر شاید ان لوگوں کی ایک ایک حرکت سے واقف تھا اور ان میں نظر رکھتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کو کریدنے کے لیے ایک اور ہزار کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

"مگر یہ عورت کون ہے اور یہ اس ظلم شخص کی منت سماجت کیوں کر رہی ہے؟" شمیکا بھی بڑے غور سے ہماری گفتگو سن رہی تھی اور خود کو ایک نئے معرکے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ میں شمیکا کی بہادری سے بڑا متاثر ہوا تھا اور اس کی جناتی طاقتوں نے مجھے مرعوب کیا تھا۔ پھر شمیکا کے دل میں جو انسانی ہمدردی اور خلوص و پیار تھا۔ اس نے مجھے اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اسی لیے میں نے شمیکا کو اپنی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شریک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"صاحب یہ ایک غریب عورت ہے۔ اس کے یہاں تین بیٹیاں ہیں۔ جو نوجوان ہی نہیں بلکہ خوب صورت اور حسین و جمیل بھی ہیں۔ اچھو چاہتا ہے کہ وہ عورت ایک ایک کر کے تینوں بیٹیوں کو اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھا دے مگر وہ عورت بھی انتہائی جرات مند ہے۔ اس نے صاف انکار کر دیا ہے۔ ایسا کرنے اور اچھو کی بات ماننے سے۔ اچھو نے پہلے تو تینوں میں سے سب سے بڑی لڑکی سے شادی کی بات کی مگر عورت شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ ایسے شرابی کبابی کو اپنی لڑکی کیوں دے گی۔ جب عورت نے انکار کیا تو وہ زبردستی کرنے پر اتر آیا مگر وہ پولیس، کچہری اور عوام الناس کی لعنت سے بچنا چاہتا ہے۔ اس لیے بوڑھی عورت کو یہاں اٹھا لایا ہے تاکہ روپے پیسے کا لالچ دے کر یا دھونس دھمکی سے منانے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ پھر بھی نہیں مانی تو اسے موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے۔ یوں با آسانی وہ ایک نہیں بلکہ تینوں لڑکیوں کا مالک بن جائے گا۔ انھیں اٹھا کر اپنے اڈے پر لے آئے گا اور پھر چودھری اور وہ ان کی آبروریزی جی بھر کے کریں گے۔ کئی مہینوں تک جب جی بھر جائے گا تو اپنے فالتو کتوں کے سامنے ان کا گوشت نوچ نوچ کر کھانے کے لیے ڈال دے گا۔" ویٹر نے نہ صرف ہمیں معلومات بہم پہنچائی بلکہ اپنی نفرت کا اظہار بھی کیا اور دل کی بھڑاس بھی نکالی۔

"عورت کے نہ ماننے پر اچھو اسے موت کی نیند بھی سلا سکتا ہے۔" اس جملے اور خطرے نے شمیکا اور مجھ میں بجلی بھر دی تھی۔

"تم ہمیں اس کمرے کا راستہ بتاؤ۔" میں نے ویٹر سے پوچھا۔

"مین کاؤنٹر کے برابر میں جو زینہ اوپر جا رہا ہے، وہی ان کمروں تک جاتا ہے اور روم نمبر 10 اچھو کے قبضے میں ہے۔ وہیں پر وہ بوڑھی عورت بھی ہے۔" ویٹر برش اٹھانے لگا۔ میں اور شمیکا مین کاؤنٹر سے برابر میں بنے زینے پر چڑھنے لگے تو منیجر نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی مگر میں نے ایک ہی دھکے سے اسے پیچھے کی جانب دھکیل دیا تھا۔ خون رگوں میں تیز تیز گردش کرنے لگا تھا اور شمیکا کا بھی غصے سے برا حال تھا۔ روم نمبر دس کے دروازے پر میں نے دستک دی۔

"کون ہے بے"۔ اندر سے کرخت آواز آئی۔

"تیرا باپ" میں نے با آواز بلند جواب دیا۔

اندر کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر کسی نے بڑی تیزی سے دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے کے لیے گردن نکالی تو میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ اور ساتھ ہی اس کی

بندوق پر بھی قبضہ جما لیا۔

"کوئی ہتھیار اٹھانے اور چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرے۔ ورنہ بے موت مارا جائے گا۔" میں نے بندوق کی نال اس شخص کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" جس شخص نے پوچھا شاید وہ اچھو ہی تھا۔ کیوں کہ وہ ان تمام افراد یا بدمعاشوں میں بھاری بھرکم اور رعب دار تھا۔ حرام کی کمائی کھا کھا کر اور عیاشی کر کر کے اس کے جسم پر چربی چڑھ گئی تھی۔

"تمہاری یادداشت کمزور ہے۔ میں نے بتا تو دیا تھا کہ تیرا باپ۔" میں نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا تو شمیکا غائب تھی۔ وہ میرے ساتھ اندر کمرے میں بھی داخل نہیں ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ضرور غائب حالت میں اس کمرے میں موجود ہے اور بوقتِ ضرورت اپنی جناتی طاقتوں کو بروئے کار لا کر نہ صرف بوڑھی عورت کی جان بچا لے گی بلکہ ان بدمعاشوں کو ان کے گناہوں کی سزا بھی دے گی۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ کیا مجھے جانتے نہیں ہو؟" اچھو نے بڑے غصے سے کہا تھا۔

"اچھو میں تمہیں جانتا تو نہیں تھا مگر اب جان گیا ہوں، تم ایک ظالم و جابر شخص ہی نہیں بلکہ انتہائی گھاؤنے کردار اور کالے دھن کے کاروبار والے آدمی ہو۔ تم وہ بھونرا ہو جو نوخیز کلیوں کا رس چوس کر انھیں روندنے کے لیے اپنے ساتھیوں کے پیروں تلے ڈال دیتے ہو۔ اور تمہارے ساتھیوں میں یہ کتے ان معصوم سی اور بے گناہ لڑکیوں کی نہ صرف آبروریزی کرتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ غیر فطری اور غیر انسانی و غیر اخلاقی سلوک بھی روا رکھتے ہیں۔ یہ تمہارے ساتھی کئی دنوں تک ان پر جنسی تشدد بھی کرتے ہیں۔ چاہے اس دوران وہ سسک سسک اور تڑپ تڑپ کر اپنی جان ہی کیوں نہ دے دے۔ تمہیں ذرہ برابر بھی رحم اور ترس نہیں آتا۔ تم اور تمہارے ساتھی ایسے ستم گر اور سفاک درندے ہو اور تم یہ سب کچھ اس گاؤں کے چودھری اور پولیس آفسر کی مدد سے نہ جانے کتنی عورتوں کو آبرو باختہ کرتے رہے ہو اور کتنے بے گناہ انسانوں کا خون اپنی گردن پر لیا ہے۔ مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے جب اس گاؤں کے ایک غیرت مند شخص نے تمہیں غیرت دلانے کی کوشش میں تمہارے خلاف آواز بلند کی تھی تو تم نے اس کی بیوی کی سرِ عام عصمت کے لبادہ کو تار تار کر دیا تھا۔" میری تقریر سن کر اس پر ایک کوہِ حیرت ٹوٹ پڑا۔ وہ مجھے اجنبی سمجھ رہا تھا مگر میں نے اب تک کی اس کی پول پٹیاں کھول دی تھیں۔ اس کے گڑھے مردے اکھاڑ دیے تھے۔ وہ دم بخود میرے منہ کو تکے جا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے ذہن میں یا اس کے ساتھی میرے خلاف کوئی پلان بنا رہے ہوں یا کوئی ایسا جال بن رہے ہو جس میں مجھے پھانس سکیں اور ان کے خیال میں مجھے بے بس کر کے اپنی توہین کا بدلہ لے سکیں۔ تبھی ایک ساتھی نے نہ صرف خود بندوق اٹھائی اور اچھو کی طرف بھی ایک بندوق اچھال دی تاکہ وہ پلک جھپکتے میں مجھے گولیوں سے بھون دے۔ اچھو نے بندوق کو کھینچ کر لیا تھا مگر اس کے ساتھی کی کمر پر ایسی دو ہتھڑ پڑی تھی کہ وہ زمین چاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا اور بندوق چھٹ کر اس سے دور جا گری تھی۔ اس غیر مرئی شے کی ضرب برداشت کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور باقی ساتھیوں نے یہ طلسماتی مار اور منظر دیکھا تو وہ خوف زدہ نظر آنے لگے مگر اچھو نے اپنے رعب کا بھرم رکھنے کے لیے بندوق کا رخ میری جانب رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم کسی خفیہ پولیس کے آدمی ہو یا کوئی جاسوس اور سراغ رساں ایجنسی کے لیے کام کر رہے ہو۔ دیکھو تم جو کوئی بھی ہو، ہم تمہاری بہادری کی داد دیتے ہیں۔ تم ہمارے معاملات میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ ہم اس بات کے لیے تمہیں دو لاکھ روپے دینے کو تیار ہیں۔ تم یہ پیسہ لے کر جہاں سے آئے ہو وہاں چپ چاپ چلے جاؤ۔"

"نہیں، میں دولت کا بھوکا نہیں ہوں اور ہاں

www.pdfbooksfree.pk

سنو! نہ میرا تعلق پولیس سے ہے اور نہ جاسوسی سے۔ میں ایک عام سا شخص ہوں جس نے اپنی زندگی کا مقصد مظلوموں کی مدد کرنا بنالیا ہے۔ میں نے خود کو عوام الناس کی خدمت کے لیے وقف کرلیا ہے۔ جہاں پر بھی کسی مظلوم، بے بس، غریب اور بے کس کے ساتھ ظلم ہوگا میں وہاں پر کارروائی کا حق رکھتا ہے اور اللہ کے غریب بندوں اور بے سہارا لوگوں کی امداد کرتا ہوں اور یہ طاقت اور توفیق مجھے اللہ ہی نے دی ہے۔"

"اگر تم میری بات نہیں مانتے اور آئی ہوئی دولت کو ٹھکرا رہے ہو تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اچھو نے ایک آن میں دو گولیاں چلا دیں۔ کیوں کہ میرے سامنے اچھو تھا اور اچھو کے سامنے اس کا وہ ساتھی جسے میں نے بندوق کے زور پر بے قابو کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہوگئیں اور خون کے دو فوارے ابل پڑے۔ یہ تو خاموشی سے مر گیا مگر بوڑھی عورت سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ وہ چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔ میں نے اچھو کے ساتھی کا جسم مضبوطی سے تھاما۔ کیوں کہ وہ میرے بازوؤں میں جھول گیا تھا۔ مجھے اس کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا مگر میں اس کو چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ یہ اچھو کے خلاف میری ڈھال تھی۔ شہ پا کر اس کے دوسرے ساتھی نے بندوق اٹھائی تو اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید ہوا کہ وہ ہوا میں قلابازی کھا کر اندھے منہ زمین پر جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی اچھو تیسرا فائر کرنا چاہتا تھا کہ اس کا ہاتھ اتنی پھرتی سے مڑا کہ وہ درد و کرب سے بلبلا اٹھا اور اس کی بندوق کا رخ خود اس کے سینے کی طرف ہوگیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اسے وہ شخص نظر آجائے جو اس کا ہاتھ موڑے ہوئے ہے۔ مگر وہ کسی کو دیکھنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

"چلاؤ گولی۔ اب گولی کیوں نہیں چلاتے۔ اپنی اپنی جان سبھی کو اس طرح پیاری ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو بھی اپنی جان پیاری تھی جن سے تم نے بغیر کسی گناہ کے چھین لی۔ وہ بے قصور لوگ حشر میں تمہارا گریبان پکڑنے کے منتظر ہوں گے اور آج تمہیں دنیا میں اپنے کیے کی سزا ملنے والی ہے۔" میری بات سن کر اس کے ہوش اُڑ گئے تھے اور اس کے ساتھیوں کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اچانک اچھو کے ہاتھ سے بندوق چھین لی گئی اور اسے دھکا دے کر فرش پر پھینک دیا گیا۔ اس لمحے دروازے سے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ پا کر ہم سب نے اس طرف دیکھا۔ دروازے کے اندر داخل ہونے والی ایک انتہائی خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اس کی خوب صورتی نے سبھی کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی تھی۔ وہ ایک شانِ بے نیازی سے کمرے میں داخل ہوئی تو اچھو کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک عود آئی مگر ہوس کا یہ شعلہ جلد ہی بجھ گیا۔ کیوں اس وقت اس کی جان پر بنی تھی۔ اور جان سب سے عزیز شے ہوتی ہے۔

"تم نے اپنا کام ختم کرلیا ہو تو چلو بہت دیر ہو رہی ہے۔" شمیکا نے میرے قریب آکر کہا۔ پہلے تو میں بھی حیران تھا کہ وہ کمرے میں سے کب باہر گئی اور کب لباس تبدیل کر کے لوٹ آئی۔ وہ اس حلیے میں پہچانی نہیں جا رہی تھی کیوں کہ اس نے جینز کی ٹائٹ پینٹ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اونچی ہیل کے جوتوں نے اس کا قد اور بڑھا دیا تھا۔

"ہاں ابھی گرو کو سزا دینا باقی ہے۔" میں نے شمیکا کو بتایا۔ "تم بوڑھی عورت کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ میں اچھو اور اس کے ساتھیوں سے اچھا سلوک کرتا ہوں۔

"ہاں مسٹر" میں نے اچھو کے ایک ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم میرا ساتھ دو گے۔ یعنی میرا کہا مانو گے یا اب بھی اپنے بزدل اور ڈرپوک سردار کی بات مانو گے۔"

"نہیں صاحب، میں آپ کا ساتھی بننے کو تیار

ہوں۔ یہ بزدل سردار تو آپ کے آگے بھیگی بلی بنا ہوا ہے۔ ایسے ڈرپوک سردار کا ساتھ میں کیسے دے سکتا ہوں۔" اس نے اپنا سینہ ٹھونک کر کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر تم اپنی چپل اتار کر اس کے سر پر برساؤ تاکہ اس کے اس دماغ کو سزا مل سکے جس میں اتنی گھناؤنی سازشوں کا جال موجود ہے۔" میں نے بندوق کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھی نے اپنی دونوں چپلیں اتار کر ہاتھوں میں تھام لیں اور اچھو کی طرف چل پڑا۔ اچھو سے اپنی اس قدر ذلت برداشت نہ ہوئی۔ اس نے بھی اپنے ساتھی پر مکوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ یوں وہ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ اچھو حرام کھا کھا کر اور شراب پی پی کر جنگل والے کی طرح پلا ہوا تھا۔ اس نے بہت جلد اپنے ساتھی کو مار مار کر ادھ موا کردیا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کا ساتھی کمزور پڑ گیا ہے تو میں نے اس کے دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے میری بات مانتے ہوئے اچھو پر وہ تابڑ توڑ حملے کیے کہ اس کے اوسان خطا ہونے لگے مگر شاید اچھو میں سردار ہونے کا رعب اور بھرم باقی تھا۔ اس نے اپنے اس ساتھی کو بھی لہولہان کردیا تھا۔ وہ خود بھی بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ میں ایک ایک کر کے اس کے تمام ساتھیوں کو اس سے لڑوا چکا تھا اور یوں اسی کے ہاتھوں ان کو سزا دلوا چکا تھا۔

شاید شمیکا کی کوششوں سے بوڑھی عورت کو ہوش آگیا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے باری باری میری اور شمیکا کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے میں بے جان سے پڑے ظالموں کے جسموں کو دیکھ کر مطمئن نظر آرہی تھی۔

"بیٹا آپ لوگ میری لیے کسی فرشتے سے کم نہیں ہو، آپ لوگ نہ آتے تو یہ سفاک اور جابر انسان نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا اور پھر میری تین بیٹیوں کی....." اس نے اپنا جملہ ادھورہ چھوڑ دیا اور اس کے بعد اس کی آنکھیں نم آلود ہوئی تھیں مگر پھر یک دم گویا ہوئی۔

"ہاں بیٹا ہر شیر کے لیے سوا شیر، اور فرعون کے لیے موسیٰ ضرور آتا ہے۔ اس ظالم کو بھی اس کے کیے کی سزا ضرور دینا۔ اس نے سمجھ رکھا تھا کہ زندگی اسی کا نام ہے۔ یہ زمین پر خود کو خدا سمجھنے لگا تھا۔" بوڑھی عورت خاموش ہوئی تو میں نے شمیکا سے کہا۔

"تم اماں جی کو ان کے گھر چھوڑ کر آؤ۔ میں اچھو سے فارغ ہوتا ہوں۔" شمیکا نے بوڑھی عورت کو سہارا دے کر اٹھایا اور اپنے ساتھ لے کر چلتی بنی۔ شمیکا کے جانے کے بعد میں نے زخمی اچھو کو گریبان سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا ہوٹل سے باہر لے آیا۔ باہر نکل کر دیکھا تو ایک جمِ غفیر جمع ہوچکا تھا۔ میں نے گاؤں والوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بھائیو! ہم ظالم کو خود پیدا کرتے ہیں۔ یہ ظالم شخص اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم مظلوم کا ساتھ نہیں دیتے، ظلم ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔ کیا تمہیں پتا نہیں کہ خاموش رہنا بھی ظالم کا ساتھ دینے کے برابر ہے۔ ایمان کے تین درجات ہیں۔ کسی جگہ ظلم یا برائی ہوتی دیکھے تو اسے اپنی طاقت یعنی زورِ بازو سے روک دے یا مٹا دے، اگر اس کی طاقت نہیں ہو تو پھر زبان سے ظلم کو ظلم کہے اور برائی کو برائی اور اس کی روک تھام کے لیے آواز بلند کرے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو پھر اس بری چیز کو دل میں برا جانے، یہ ایمان کی سب سے کمزور نشانی ہے۔ ہم خاموش رہ کر ظالم کے حوصلے بڑھا دیتے ہیں اور وہ جو جی میں آئے کرتا چلا جاتا ہے۔ اپنی من مانیوں کو وسعت دیتا ہے اور یوں اس کے مظالم کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اس میں قصور فقط اور فقط ہمارا ہے؛ اگر ہم ظالم کو اس وقت ظلم سے روک دیں، جب وہ پہلی بار کسی پر دست درازی کرتا ہے تو اس کی ہمت نہیں ہوگی، دوبارہ ظلم کرنے یا دست درازی کرنے کی۔ مگر ہمارے خاموش اور چپ چاپ تماشائی بننے کی وجہ سے اس کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ یوں مٹھی بھر جرائم پیشہ افراد پورے گاؤں، شہر یا صوبے کو یرغمال بنا لیتے ہیں اور اس پر حکومت کرنے

www.pdfbooksfree.pk

لگتے ہیں۔ جس سے غریبوں، نادار، مفلسوں اور مجبور و بے بس لوگوں کا جیون اجیرن ہو جاتا ہے اور ان کی نہ صرف زندگی غیر محفوظ ہوتی ہے بلکہ ان کی عزت و آبرو اور عظمت و عصمت بھی غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔ جسے یہ جرائم پیشہ افراد با آسانی لوٹ لیتے ہیں اور ہم بے جان پتھر کے مجسموں کی طرح دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کیا گزرتی ہوگی ان نوخیز کلیوں کے دل پر جن کو یہ درندہ صفت لوگ اپنی ہوس کا شکار بنا کر پیروں تلے روند دیتے ہیں۔ بے دردی سے مسل دیتے ہیں۔

میں نے آج اس گناہ و جرائم کے پلندے اچھو سردار اور اس کے ساتھیوں کو ان کے کالے کرتوتوں کی سزا دے دی ہے۔ اب تمہیں اپنے گاؤں کو ان جیسے ناسوروں سے بچا کر رکھنا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس گاؤں کا چودھری اور اس گاؤں کے تھانے کا تھانے دار بھی اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ اب اگر وہ کسی دوسرے مجرم کی سرپرستی کریں تو اس شخص کو روکنا اور اس کے ساتھ اس گاؤں کے چودھری اور تھانے دار کو سزا دینا تمہارا کام ہے۔ جب تک تم اپنے اندر کے انسان کو نہیں جگاؤ گے وہ غفلت کی نیند سوتا رہے گا۔ اپنے اندر کے انسان کو جگاؤ اور ایک دوسرے کی مدد کرو، ایک دوسرے کے کام آؤ، اس کا نام انسانیت ہے اور اسی طرح ایک اچھا معاشرہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

ہاں ایک بات اور بزرگوں کا قول ہے جب ظالم تمہارے قابو میں آجائے یا کسی سفاک شخص پر تم قابو پالو تو اسے ہرگز معاف مت کرنا۔ کیوں کہ یہ ظالم لوگ جب پسپا ہو جاتے ہیں تو اپنی جان بچانے کے لیے معافی اور درگزر کا راستہ ڈھونڈتے ہیں جو وقتی طور پر ان کی پناہ گاہ ہوتی ہے، تمہارے معاف کر دینے کے بعد اور کچھ روز گزر جانے کے بعد یہ پھر اپنی اصلیت پر اتر آتے ہیں اور گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر وار کرتے ہیں۔ اس لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ ظالم پر رحم مت کھانا چاہیے وہ اپنی دستار بھی اتار کر تمہارے قدموں میں ڈال دے۔ کیوں کہ اس وقت کی نزاکت دیکھ کر اس کی چالاکی اور ہوتی ہے۔ وہ اس طرح ابن الوقت بن کر عیاری سے کام لیتے ہیں۔ جسے تم نرم دلی کی وجہ سے پہچان نہیں سکتے۔ لہٰذا ظالم کو اس کے کیفر کردار تک پہنچا کر دم لینا۔ یہی میرا مشن ہے اور آج سے آپ لوگوں کا بھی۔"

میں نے شمیکا کو آتے دیکھا تو اپنی نصیحت آموز تقریر ختم کی اور اچھو کو بری طرح زخمی حالت میں چھوڑ کر اس کے ساتھ روانہ ہو گیا مگر میں نے آخری بار گاؤں والوں کی آنکھوں میں ایک نیا ولولہ اور جذبہ دیکھا تھا۔ جرائم کے خلاف نفرت کا، انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کا۔

شمیکا نے مجھے بتایا کہ وہ بحفاظت بوڑھی عورت کو اس کے گھر چھوڑ آئی ہے۔ بوڑھی عورت کی تینوں بیٹیاں انتہائی خوب صورت اور حسین و جمیل ہیں جو نوجوانی کے بعد جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہیں۔ شمیکا نے مزید بتایا کہ اس نے بوڑھی عورت کو نصیحت بھی کر دی ہے کہ وہ جلد از جلد اچھے سے رشتے دیکھ کر ان تینوں لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کر دے۔ اور اس کے انتظامات کرنے کے لیے وہ اسی بٹوے میں سے ان کی امداد کے لیے کافی رقم بھی دے آئی ہے۔ بٹوے کا نام سنتے ہی میں نے ایک بار پھر اپنی جیبوں کو ٹٹولا جو خالی تھیں۔ میری بدحواس دیکھتے ہوئے شمیکا نے اپنے دوپٹے کے پلو سے کھول کر بٹوہ میرے حوالے کر دیا اور یوں ہم مسکراتے ہوئے اپنے عارضی مسکن کی طرف روانہ ہو گئے۔

صبح صبح فون کی گھنٹی بجی تو میں حیران ہوا کہ اتنی جلدی کس کا فون آگیا ہے۔ میں نے فون کا ریسور اٹھا کر کان سے لگایا تو اریبہ کی مانوس آواز میرے کانوں میں ٹکرائی۔ تب مجھے خیال آیا کہ ہمیں تو صائمہ اور نیلم کے قاتل ارباز خان کو گرفتار کرنے کوئٹہ شہر جانا تھا۔ میں نے بڑی عجلت میں ہیلو کہا تھا۔ دوسری جانب سے آواز ابھری تھی۔

"ارسلان صاحب، تمام تیاریاں مکمل ہو چکی

ہیں اور آج کے دن ہمیں دس بجے کوئٹہ کے لیے روانہ ہونا ہے۔ تاخیر کی وجہ صرف اور صرف ٹکٹوں کی بکنگ تھی آج کے ٹکٹ ہیں اور آج ہمیں اپنے منصوبے کے مطابق روانہ ہونا ہے۔ میں نے اپنے سگے بھائی کو اسلام آباد فون کر دیا تھا جس میں اسے ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ خفیہ طور پر دلاور خان کی کڑی نگرانی کرے اور اس پر ہر لحہ نظر رکھے۔ اس کی مشکوک حرکات و سکنات کو نوٹ کرے اور پھر مجھے ان حرکات و سکنات سے آگاہ کرے۔ میں نے شک کی بنیاد پر ایسا کیا تھا کیونکہ پولیس کیس میں شک کا میابی کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔ اور شک کی مضبوط وجہ یہی تھی کہ کالج رجسٹریشن رجسٹر سے ملنے والی تصویر ارباز خان یا پھر دلاور خان کی تھی۔ میرے بھائی شہزاد احمد نے اس شک کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ اسے جو کہا گیا ہے وہ کام کرے۔" میں نے وقت پر پہنچنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا۔

کہتے ہیں کہ کوئٹہ ایک قابل دید شہر ہے، جہاں خوش نما وادیاں، سرسبز و شاداب باغات، اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ، ہرے بھرے کھیت، لہلہاتا سبزہ زار اور سب سے دل فریب برف باری کا منظر نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ نہ صرف اندرون پاکستان کے سیر و تفریحی کے شائقین یہاں آتے ہیں بلکہ غیر ملکی سیاح بھی اس خطے سے ضرور گزرتے ہیں اور کیمرے کی آنکھ میں یادگار لمحات قید کرتے ہیں اور ناقابل فراموش مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہی دل کشی تھی کہ ہم نے بھی پروگرام بنایا کہ بذریعہ ریل گاڑی سفر کریں گے اور دل فریب مناظر سے لطف اٹھاتے جائیں گے اور بذریعہ کوچ واپسی ہوگی تاکہ دونوں راستوں سے حسین و دل کش نظاروں سے دل بہلاتے رہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر ہم پہنچے تو انسپکٹر روبینہ سادہ کپڑے میں نہ صرف عام سی عورت لگ رہی تھی بلکہ اس لباس کی تبدیلی نے اسے پرکشش اور دل گزار بنا دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ اسے مزید جاذب نظر بنا رہی تھی۔

وہ خراماں خراماں میرے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ میں اپنا بیگ تھام رکھا تھا جس میں مختصر سا سامان تھا اور دوسرے ہاتھ میں روبینہ کا بریف کیس تھام لیا تھا۔ اس اندیشے سے کہ کہیں اس نازک اندام لڑکی کے ہاتھ میں وزن اٹھانے سے موچ نہ آجائے۔ روبینہ نے اصرار بھی کیا تھا کہ وہ اپنا بریف کیس خود اٹھالے گی مگر میں نے زبردستی اس کا بریف کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

جس علاقے سے ہم سوار ہو رہے تھے یہ پاکستانی حدود نہیں تھی، شاید انڈیا کے شمالی علاقہ جات کا حصہ ہو۔ جس شہر کوئٹہ جا رہے تھے اس کا تعلق پاکستان سے تھا۔ پاکستان کے بارے میں مشہور تھا کہ جو کام دنیا کے کسی حصے میں نہ ہوتا ہو وہ پاکستان میں بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے کیوں کہ یہاں سفارش اور رشوت دو ایسے ہتھیار ہیں جن سے کسی بھی سخت سے سخت انسان اور اصول پرست شخص کو پگھلایا جاسکتا تھا۔ یا اس سے اپنا کام نکلوایا جاسکتا تھا۔ دولت کی ریل پیل ہو اور مزید ذرائع ہوں تو کامیابی خود بخود انسان کے قدم چومتی ہے۔ انسپکٹر روبینہ نے فقط اپنا کارڈ دکھایا تو ہمیں فوراً سیٹیں مل گئیں اور برتھیں بھی ریزرو کر دی گئیں۔ یوں ہم خوش حال خان ایکسپریس میں سوار ہو گئے۔ سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ تین گھنٹے تک تو وہی آب و ہوا محسوس ہوتی رہی جس میں ہم سانس لے چکے تھے۔ جب ریل گاڑی نے اپنا رخ بدلا اور پٹری کا ٹریک تبدیل ہوا تو نہ صرف مناظر بدل گئے بلکہ موسم کے اثرات بھی تبدیل ہو گئے۔ دل فریب و دل کش نظارے گردش کرنے لگے۔ ہم تینوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ یوں تو مناظر میں محو تھا مگر ہر شخص پلان سوچ رہا تھا۔ کیوں کہ کوئٹہ شہر تک تو سنا تھا کہ کچھ نہ کچھ قانون کی پاس داری موجود تھی مگر علاقہ غیر میں تو سنا تھا کہ وہاں کے رہائشیوں کے اپنے قوانین ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے جرگے ہوتے ہیں جو عدالت اور منصف کے فرائض سرانجام دیتے ہیں، رسم و رواج، تہذیب و ثقافت ایک ہوتی

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ یعنی ان کا پہننا اوڑھنا، کھانا پینا اور سونا جاگنا دیگر شہریوں سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی محبت ونفرت کے قانون بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خواتین کے معاملات میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں پردہ داری کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کے درمیان دشمنی سالہا سال پر محیط ہوتی ہے۔ یہ لوگ انتقام یا بدلہ لینے کے لیے برسوں کا انتظار کرلیتے ہیں اور اپنے دشمن کو کبھی بھولتے نہیں۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ خدانخواستہ ارباز خان کو پتا چل بھی گیا اور وہ غیر علاقے میں فرار ہوگیا تو پھر کیا ہوگا۔ لیکن پھر فوراً ہی میرے دل کو ڈھارس بندھی کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں اور قانون کے شکنجے سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اسی لیے مثل مشہور ہے کہ ”بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔“ ایک جھٹکے سے ایکسپریس ٹرین وادیٔ مہران کے ایک سرسبز وشاداب پلیٹ فارم پر آکر رکی تو میرے خیالات منتشر ہوگئے۔

”کس قدر خوب صورت اور پرفضا مقام ہے۔ کاش ایسی جگہ رہا جائے تاکہ بیماریوں کا کوئی خطرہ نہ ہو۔“ انسپکٹر روبینہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

”واقعی کس قدر خاموشی اور سکوت وسکون ہے۔ ہم جیسے جوڑے کو بھی ایسے خوش گوار ماحول میں ہی رہنا چاہیے۔“ میں نے شمیکا کی طرف نظریں اٹھا کر کہا۔

”واقعی اس حسین اور سہانے موسم کی جگہ پتھر انسان کیا موسم بھی مداخلت نہیں کرے گا۔“ روبینہ نے میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا تو شمیکا زیرِلب مسکرادی۔

”آپ لوگوں کی طبیعت میں اکیلا پن شامل ہے یا آپ لوگ گوشہ نشین رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے ارسطو کا ایک قول یاد آرہا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص معاشرے میں یا کسی جنگل میں اکیلا رہتا ہے تو وہ یا تو درندہ ہے یا پھر دیوتا ہے۔ لہٰذا مجھے تو درندہ یا دیوتا بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں ایک انسان ہوں، آدم زاد اور انسانی معاشرے میں اپنا مقام اور مسکن بنانا چاہتی ہوں۔“

اریبہ نے جو فلسفہ چھیڑا تھا اس پر اچھی خاصی بحث چھڑ سکتی تھی مگر ٹرین کی وسل نے اس بحث میں حصہ نہیں لینے دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹرین نے رینگنا شروع کردیا۔ وہ رفتہ رفتہ تیز رفتاری کی طرف مائل ہورہی تھی۔ ہماری نگاہیں حسین مناظر کو پیچھے چھوڑتی جارہی تھیں۔ ہر شے وجدان میں تھی۔ درخت جھوم رہے تھے۔ کھیت لہرا رہے تھے، شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکی جارہی تھیں۔ زمین گردش کرتی نظر آرہی تھی۔ ٹرین ابھی پلیٹ فارم سے تھوڑی دور ہی گئی ہوگی کہ دفعتاً میری نظر ایک شخص پر پڑی جو وہیل چیئر پر تھا۔ وہ ٹرین کو بے بسی سے گزرتا دیکھے جارہا تھا۔ شاید وہ اسی ٹرین میں سوار ہونا چاہتا تھا مگر وہیل چیئر پر ہونے کی وجہ سے لیٹ ہوگیا تھا اور ٹرین پر سوار ہونے کا موقع وہ اپنی معذوری کی وجہ سے گنوا چکا تھا۔ میں نے غور کیا تو وہ کوئی مرد نہیں تھا، وہ ایک جواں سال عورت تھی جو دونوں ٹانگوں سے معذور ہوچکی تھی۔ میری بوگی اس کے قریب سے گزری تو میری چھٹی حس پھڑک اٹھی۔

”اریبہ پلیز۔ اس عورت کو دیکھو۔ اسے ہم نے کہیں دیکھا ہے۔“ میں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر اس عورت کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ دراصل میں نے بلند آواز سے اس لیے بھی کہا تھا کہ ہم تینوں کے علاوہ بھی ہمارے ساتھ ایک چوتھا شخص غیر محسوس انداز سے سفر کررہا تھا۔ وہ شخص شمیکا تھی۔ یوں تو بظاہر ہم تین افراد میں، انسپکٹر روبینہ اور اریبہ تھے مگر میں جانتا تھا وہ شخص شمیکا اس مشکل مہم میں مجھے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ غائب حالت میں چلے گی اور کسی کو گمان تک نہیں ہونے دے گی کہ وہ ہمارے ساتھ موجود ہے۔ میری آواز پر جہاں انسپکٹر روبینہ اور اریبہ نے بغور دیکھا، وہاں شمیکا نے بھی اچک کر دیکھا تھا۔

”ہاں ارسلان۔ مجھے بھی اس کے سائیڈ پوز سے کچھ کچھ یاد آرہا ہے۔“ روبینہ نے کہا۔

”پلیز..... ذہن پر زور دو ہم نے اسے کہاں دیکھا ہے۔“ اریبہ نے اپنا آدھا جسم کھڑکی سے باہر نکال کر کہا۔

ہم نے انسپکٹر روبینہ کی طرف دیکھا تو روبینہ نے پلک جھپکتے میں ٹرین روکنے کے لیے زنجیر کھینچ ڈالی۔ یہ وہی لڑکی ہے جو میرے پاس آئی تھی جسے میں نے دارالامان میں پناہ دی تھی۔ وہاں سے وہی مطلوبہ قاتل شخص اسے لے بھاگا تھا۔“ اس سے پہلے کہ ہم روبینہ سے کوئی سوال کرتے اس نے پہلے ہی وضاحت کرتے ہوئے ہمیں صاف بتادیا تھا۔

”خدا کا شکر ہے کہ ہماری کامیابی کا ایک ثبوت ہمارے ہاتھ آگیا ہے۔ اب تو ہمیں اپنی منزل آسان نظر آنے لگی ہے۔“ اریبہ نے شکر گزار نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ٹرین رک چکی تھی۔ روبینہ نے ٹرین سے اتر کر لڑکی کو جالیا۔ میں نے اریبہ کا ہاتھ تھام کر اسے ٹرین سے نیچے اتارا۔ کیوں کہ ہماری بوگی پلیٹ فارم پر نہیں تھی بلکہ یہ پتھروں والی جگہ کھڑی تھی۔ بہرحال ہم بڑی عجلت میں اس وہیل چیئر والی عورت تک پہنچے۔ انسپکٹر روبینہ اس عورت پر جھکی ہوئی تھی اور کچھ پوچھنے کی کوشش کررہی تھی۔ اریبہ اور میں جسے ہی لڑکی کے قریب پہنچے، ٹرین کے گارڈ نے ہمارا راستہ روک لیا اور ٹرین کو زنجیر کھینچ کر ایمرجنسی حالت میں رکوانے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے روبینہ کی طرف اشارہ کردیا۔

”روبینہ یہ..... یہ..... صائمہ ہے۔ اس محلے کی لڑکی جہاں میں آج کل ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس نے ادریس خان سے شادی کی تھی۔ پھر اس کی اچانک موت واقع ہونے کی خبر آئی تھی۔ اریبہ اور میں اس کے قریب تر ہوگئے۔ روبینہ گارڈ کو اپنا کارڈ دکھا کر وجوہات بیان کررہی تھی اور گزارش بھی۔ اس نے گارڈ کو صائمہ اور اپنی مہم کے بارے میں مختصر سا بتا کر ہدایت کی کہ گاڑی کو چلنے نہ دے۔ لیکن اس مہم اور اس کیس میں اس اپاہج لڑکی کا کردار بہت اہم ہے۔ لہٰذا اس سے پوچھ گچھ ضروری ہے۔ اور اس کا بیان بھی قلم بند کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے اسے اسی حالت میں ٹرین میں سوار کرکے اپنے ساتھ لے جانا پڑے۔“ روبینہ کی باتیں سن کر گارڈ نے حیرت سے دیکھا تو روبینہ نے اس سے مزید کہا۔

”اگر آپ کو اب بھی کوئی شک وشبہ ہے تو میں آئی جی صاحب سے آپ کی موبائل فون پر بات کراسکتی ہوں۔“ روبینہ کی باتوں کی آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔ تب گارڈ کے چہرے پر تجسس کے تاثرات نہیں تھے۔

”نہیں انسپکٹر صاحبہ..... آئی جی صاحب کو زحمت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنی کارروائی مکمل کرلیں، جب آپ کہیں گی ٹرین کو تب ہی سگنل دوں گا۔“ گارڈ نے فرماں برداری کا ثبوت دیا تو ہم اطمینان کے ساتھ اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ہم تینوں اس سے مختلف سوالات کررہے تھے مگر وہ ہم میں سے ہر ایک کا منہ حیرت سے تک رہی تھی۔ ہاں البتہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ اور بار بار ذہن پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ کافی تعداد میں مسافر ٹرین سے اتر کر ہمارے گرد جمع ہوچکے تھے۔ کافی تگ ودو کے باوجود بھی اس عورت نے اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ ہمیں مایوسی ہونے لگی تو ایک شخص لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔

”ارے صائمہ تم یہاں ہو..... میں تمہیں باغ میں تلاش کررہا تھا۔“ آنے والے ادھیڑ عمر شخص نے صائمہ کو خیریت سے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔

”بابا یہ لڑکی کون ہے اور بولتی کیوں نہیں؟“ اریبہ نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

”بیٹا جس کی زبان کاٹ دی گئی ہو، وہ بھلا کیسے بول سکتی ہے۔“ بابا نے بڑے کرب بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن بابا دو ہفتے پہلے تک تو یہ لڑکی بولتی تھی۔ میری اس سے ملاقات ہوچکی ہے اور اس نے مجھے اپنی روداد الم بھی سنائی تھی۔ پھر آج اس کی زبان کو کس نے کاٹ ڈالا۔“ انسپکٹر روبینہ نے تشویش زدہ انداز میں

www.pdfbooksfree.pk

پوچھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی، جب تک یہ شہر نہیں گئی تھی، تب تک اس کی زبان سلامت تھی، جب سے یہ شہر سے واپس لائی گئی ہے، تب سے کسی نے اس کی زبان کاٹ دی ہے۔"

"اُف مائی گارڈ، سفاک شخص ایک بار تو میرے سامنے آجا..... تجھ سے میں گن گن کر، ایک ایک ظلم وستم اور ہر ہر جبر و بربریت کا بدلہ لوں گی۔ اگر میں ان مظالم کا انتقام نہ لے سکی تو خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بابا یہ شہر جانے سے پہلے بولتی تھی بتاؤ تو سہی اس نے آپ کو کیا بتایا تھا اپنے بارے میں۔ یہ اس حالت میں کیسے پہنچی، اس کی دونوں ٹانگیں کس حادثے میں ضائع ہوگئی ہیں۔" انسپکٹر روبینہ نے اپنے غصے پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اس بدنصیب لڑکی نے ایک ہی بات بتائی تھی کہ اس کے شوہر نے اسے دھوکے سے بہت ہی اونچے پہاڑ سے دھکا دے دیا تھا۔ یہ تو اس کی زندگی تھی جو اس قدر اونچائی سے گر کر بھی زندہ ہے۔ دراصل مارنے والے سے بچانے والا بہتر ہوتا ہے۔ اس کو حسن اتفاق کہہ لو کہ یہ پہاڑ کی جس سمت گری تھی، ادھر ایک گہری جھیل تھی۔ پانی میں گرنے کی وجہ سے اس کی زندگی تو بچ گئی مگر جھیل میں پتھروں سے ٹکرا کر اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ بے چاری کچھ بول کر اپنے دل کی کچھ بھڑاس نکال لیتی تھی مگر اب تو کسی ظالم نے اس کی زبان کاٹ کر اس سے یہ حق بھی چھین لیا۔"

"بابا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ شخص کون ہوسکتا ہے جس نے اسے پہاڑ سے نیچے دھکا دے کر قتل کرنے کی کوشش کی۔ زندہ بچ جانے کی صورت میں یہاں لاکر چھوڑ دیا اور پھر یہاں سے فرار ہونے کی پاداش میں اس کی زبان کاٹ دی تاکہ اس کا نام نہ بتا سکے۔" روبینہ نے بابا کی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بیٹا..... اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ ظالم کون ہے۔" اس جواب پر بابا کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ اور گھبراہٹ کے آثار اس کے چہرے سے ہویدا ہونے لگے تھے۔

"دیکھو بابا کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم ہمیں سچ سچ بتا دو۔ ہم سے تعاون کرو اور انسانیت کے ناتے اس انسانیت کے دشمن کا نام و پتا ظاہر کردو تاکہ وہ آئندہ کسی بے بس اور مظلوم لڑکی کے ساتھ ایسا گھناؤنا کھیل نہ کھیل سکے۔ وہ آزاد رہا تو نجانے کتنی معصوم اور سادہ لوح لڑکیوں کو اس حال تک پہنچائے گا۔ اور نجانے اس نے کس کس کو اس حال تک پہنچانے کے منصوبے بنا رکھے ہوں گے۔ پلیز..... بابا اگر آپ ہمارا ساتھ دیں گے تو ہم آپ کو اور اس مظلوم عورت کو اپنے ساتھ لے چلیں گے۔ اپنی پناہ میں رکھیں گے۔ خود حفاظت کریں گے۔" اس بار میں نے جھوٹ اور سچ کا سہارا لیتے ہوئے بابا کو دلاسا دے کر اس کی ڈھارس بندھائی۔ بابا نے ایک سرسری سے نظر مجمع کے لوگوں پر ڈالی۔

"بابا یہ سب مسافر ہیں، ان میں کوئی بھی مخبر نہیں ہے۔ آپ بغیر خوف وخطر کے بتا سکتے ہیں۔"

"بیٹا۔ اس کا نام ادریس خان ہے۔ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس وادی کی آخری چٹان میں اس کی کمین گاہ ہے لیکن وہ وہاں بہت کم آتا ہے۔ جب کوئی نیا شکار لاتا ہے تو تب یہاں رہتا ہے۔ ورنہ اس کا اصل ٹھکانہ تو کوئٹہ شہر ہی میں ہے۔ اس نے ہی صائمہ کو پہاڑ سے گرایا تھا اور اس نے ہی اس کی زبان کاٹی ہے۔ جاؤ بیٹا خدا کے لیے اس ظالم شخص کو پکڑ لو اور گرفتار کر کے ایسی عبرت ناک سزا دو کہ دنیا کا کوئی نوجوان اس قسم کی حرکت کرنے کے بارے میں عمل تو کیا سوچ بھی نہ سکے۔" یہ کہتے کہتے بابا کی آواز بھرا گئی اور وہ زاروقطار رونے لگا۔ ہم سب حیرت کا مجسمہ بنے کھڑے تھے کہ اس بوڑھے شخص کو ادریس خان کے کالے کرتوتوں کے بارے میں اس قدر معلومات کیوں کر ہے اور یہ صائمہ کی

روداد سے پوری طرح واقف کس بنا پر ہے۔

بہر حال یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ انسپکٹر روبینہ نے تمام مسافروں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی اپنی سیٹوں پر چلے جائیں اور گارڈ کو ٹرین چلانے کا سگنل دے دیا۔ اتنے میں ہم تینوں نے صائمہ کو وہیل چیئر سمت اور بابا کو سہارا دے کر اپنی بوگی میں سوار کیا۔ بڑی عجیب کہانی تھی۔ میں نے آج تک اس کے جیسی سسپنس فل کہانی نہ پڑھی اور نہ ہی سنی تھی۔ یہ سچی کہانی تھی جس میں قدم قدم پر تجسس، خوف اور نیا موڑ تھا۔ راستہ کافی دور تھا۔ ہم نے صائمہ اور بابا رحیمو کی بڑی خدمت کی مگر نجانے قسمت کو کیا منظور تھا۔ صائمہ کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور اس کی حالت تشویش ناک ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کوئٹہ اسٹیشن پر اترتے ہی ہمیں سب سے پہلا کام یہی کرنا پڑا کہ صائمہ کو ہسپتال میں داخل کرادیا گیا۔ ہزار بھاگ دوڑ کے باوجود بھی ہم اس کی زندگی کو نہ بچا سکے۔ دوسری طرف رحیمو بابا کی عمر کا تقاضا تھا اور بڑھاپے کا بوجھ بھی ان کی کمر توڑے جارہا تھا اور پھر ان کے دل پر کوئی ایسا صدمہ بھی ضرور تھا جو انہیں دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ اوپر سے یہ شخص چٹان کی صورت تھی مگر اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ بالکل کھوکھلے درخت کی طرح ہوچکا تھا۔

انسپکٹر روبینہ نے اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر ایدھی ہوم سے رابطہ کر کے صائمہ کی تجہیز وتکفین بغیر کسی تشہیر کے کرنے کو کہا اور رحیمو بابا کو پناہ دینے کا وعدہ بھی لیا۔ اس طرح چند ماہ پہلے موت کی خبر پانے والی صائمہ آج حقیقت میں اس دنیا سے چل دی تھی۔ ایدھی ہوم کے حوالے کر کے رحیمو بابا کی طرف سے اطمینان حاصل ہوگیا تھا۔ بہت تھکاوٹ محسوس ہورہی تھی۔ لہٰذا ہم تینوں پہلے سے بک کیے ہوئے ہوٹل کے کمروں میں بلا تاخیر پہنچ چکے تھے۔ یہ ہوٹل ریلوے روڈ پر ہی واقع تھا۔ جس میں دو کمرے بک کروائے گئے تھے۔ ایک میں اریبہ اور انسپکٹر روبینہ ٹھہر گئی اور دوسرے کمرے میں، میں آرام فرما تھا۔ انسپکٹر روبینہ اور اریبہ کی نظر میں، میں اس کمرے میں اکیلا تھا مگر میرے ساتھ شمیکا تھی۔ جو میری تنہائی کو باآسانی دور کررہی تھی۔ میں نے اس کہانی اور واقع پر شمیکا کا ردعمل نوٹ کیا۔ وہ بہت بے چین تھی ادریس خان کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے اور اسے اس کے کالے کرتوتوں کی عبرت ناک سزا دینے کے لیے۔ شمیکا کا رویہ غیر قانونی ضرور تھا مگر ہمارے نزدیک انتہائی موثر تھا۔ ایسے سفاک مجرم کو اگر قانون کے حوالے کیا جائے تو وہ اسے آرام دے جگہ پر رکھتی ہے۔ تاکہ انھیں آمدنی میسر آئے۔ ساری عمر وہ مجرم سے اس کو پناہ دینے کے عوض معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ اگر سختی کی جائے تو مہینوں بلکہ سالوں عدالتوں میں کیس چلتے ہیں یہاں تک کہ حکومتیں تبدیل ہوجاتی ہیں اور پھر وہی مجرم دندناتے جیل سے باہر آجاتے ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں گویا ان کی کسر پوری کر رہے ہوں۔ جب وہ جیل میں بے بس تھے۔ شمیکا کا انداز جداگانہ اور جارحانہ تھا۔ وہ مجرم کو حراست میں لیتی تھی۔ اس سے اقبالِ جرم کراتی تھی اور ہاتھ کے ہاتھ سزا دے دیتی تھی۔ یوں مجرم آسانی سے کورٹ کچہریوں کا چکر لگائے بغیر قرار واقعی سزا پالیتا تھا اور دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بھی بن جاتا تھا۔

ادریس خان کو تلاش کرنا اب شمیکا کی سب سے اولین ترجیحات میں شامل تھا۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے پاگل سی ہورہی تھی۔

"شمیکا..... صبر سے کام لو۔ جو قسمت میں لکھا ہوگا وہی ہوگا۔" میں نے شمیکا کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ارسلان، ایسے لوگ اتنا عرصہ پولیس اور عوام کی نظروں سے کیسے بچے رہتے ہیں۔ ان کو قانون کے لمبے ہاتھ گرفتار کیوں نہیں کرتے۔ عوام نفرت وغصے کا اظہار ان کے خلاف کیوں نہیں کرتے۔" شمیکا نے آنکھیں لال کرلی تھیں، اس کا غصے سے برا حال ہورہا تھا۔

"شمیکا۔ بہت جلد ہم ادریس خان کو گرفتار

www.pdfbooksfree.pk

کرلیں گے اور سزا سے ہم کنار بھی کریں گے۔ تم ثابت ہوجاؤ۔'' میں نے شمیکا کو اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں نم ناک ہورہی تھیں، نجانے اسے آج کی رات اس غم میں نیند بھی آئے گی یا نہیں۔ بہرحال میں نے تھکاوٹ اور سفر کے باعث اور شمیکا کی گداز بانہوں کا لمس پاکر نیند کی آغوش میں جاتے دیکھا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

صبح نو بجے میرے دروازے پر دستک ہوئی تو میری آنکھ کھلی۔ میں نے دیکھا شمیکا غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ اس کے سیاہ، گھنے اور دراز بال اس کے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے جس کی وجہ سے پورا کمرا سوندھی سوندھی، مہکی مہکی خوشبو سے معطر ہورہا تھا۔ دروازے پر اس نے بھی دستک سن لی تھی۔ لہٰذا وہ غائب حالت میں ہوگئی تھی۔ میرے علاوہ اب اسے کوئی اور نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو انسپکٹر روبینہ نے مجھے تیار ہوکر ہال میں آنے کے لیے کہا۔ تاکہ ناشتہ کرکے اپنی مہم پر نکلا جاسکے۔

یوں ہم تینوں ناشتہ کرکے اس طرف چل دیئے، جدھر باتوں باتوں میں رحیمو بابا نے ادریس خان کی رہائش کی نشان دہی کی تھی۔ ہم سب یہاں نہ تو ہنی مون منانے آئے تھے اور نہ ہی سیر وتفریح کے لیے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اور کام زیادہ۔ کیوں کہ ابھی تک ہمیں ادریس خان کے کارناموں کے بارے میں پتا چلا تھا۔ اس کے ٹھکانے کی نشان دہی ہوئی تھی جو 10 فی صد کامیابی تھی، نوے فی صد ابھی باقی تھی۔ اس مہم میں کسی کی جان بھی جاسکتی تھی کیوں کہ یہ ایک جان لیوا مہم تھی۔ دشمن اپنا حفاظت کے لیے دوسروں کی جان گنوا سکتا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو تھا کہ وہ ہم سب کی حفاظت فرمائے اور ہمیں اپنے نیک مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔ آمین کہہ کر میں نے دل سے دیگر قسم کے خیالات کو جھٹکا اور انسپکٹر روبینہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''مس روبینہ! اب ہمیں ارباز کے دوسرے ایڈریس پر چھاپہ مارنا چاہیے۔'' میں نے مطلب کی بات کرتے ہوئے کہا۔

''جی ارسلان صاحب، آپ نے بجا فرمایا ہے لیکن ہم یہاں پولیس پارٹی کے روپ میں نہیں ہیں، ایک پرائیویٹ سراغ رسانی کے ادارے کی طرح کام کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کو بھی اس مہم کی خبر نہیں ہونے دی ہے۔ لہٰذا ہمیں الگ الگ، خفیہ اور سازگار ماحول میں کام کرنا ہوگا۔'' روبینہ کی بات سن کر مجھے اپنے لفظ چھاپہ مارنے پر افسوس ہوا۔

''چلو تو پھر دیر کس بات کی ہے؟'' اریبہ نے خود کو تیار کرتے ہوئے کہا۔ اور یوں ہم اپنی مہم کا دوسرا قدم اٹھانے کے لیے چل دیئے۔ کوئٹہ شہر اتنا بڑا نہیں ہے جس میں کوئی ایڈریس تلاش کرنا مشکل ہو۔ ٹی وی اسٹیشن روڈ پر مکان تھا جو کہ باآسانی ہمیں مل گیا۔ یہاں کے باشندے ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ پٹھان قوم یہاں پر اکثریت میں آباد ہے جو بہت غیرت مند اور بہادر ہوتی ہے۔ روبینہ نے مجھے ایک مناسب جگہ پر کھڑا کردیا جہاں سے مجھے اس گھر میں ہونے والی آمدورفت کا پتا چل رہا تھا۔ روبینہ بڑے محتاط انداز میں اریبہ کو ساتھ لے کر مطلوبہ مکان کے دروازے تک گئی۔ پہلی دستک دینے کے بعد انتظار کیا۔ مگر دوسری دستک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ دروازہ کھولنے والا شخص خود ارباز خان تھا۔ وہ عجیب نظروں سے ان دونوں عورتوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ پھر شاید اس نے آواز دے کر اپنی گھر والی کو بلایا اور کہا کہ وہ ان عورتوں سے بات کرے۔ انسپکٹر روبینہ کی شرٹ میں مائیکروفون لگا ہونے کی وجہ سے مجھے بھی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ارباز خان کو سامنے پاکر ہم تینوں میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی مگر ہم نے صبر وتحمل اور ضبط سے کام لیا کیوں کہ اس نے اپنی بیوی کو آواز دی تھی اور ہم بے چین تھے کہ اب ہمارے سامنے اریبہ کی بہن علیشا جلوہ گر ہونے والی ہے۔ یوں ہمیں باآسانی صائمہ کے بعد علیشا بھی

ملنے والی تھی۔ میں ان لوگوں کے اور قریب ہوگیا تاکہ کسی بھی ان جانے یا ناگہاں خطرے سے نپٹ سکوں۔ ویسے تو مجھے شمیکا پر پورا بھروسا تھا کہ وہ کسی آن ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے اور تمام حرکات وسکنات کو دیکھ رہی تھی اور ہر خطرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ارباز خان کی بیوی نے پشتو میں کچھ پوچھا، عجب اتفاق تھا کہ ہم تینوں میں سے پشتو زبان کسی کو نہیں آتی تھی۔

''کیا تم ارباز خان ہو؟'' آخرکار روبینہ نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''ہاں ہمارا نام ارباز خان ہے، لیکن تم لوگ کون ہے اور ہمارا متعلق کیوں پوچھتا ہے؟'' ارباز خان نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ارباز خان ہم کراچی شہر سے آئے ہیں۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں اور بھی بہت سے کام ہیں۔'' اریبہ نے اس بار حوصلہ مندی سے بات کی مگر اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''ارباز خان سنو، میں انسپکٹر روبینہ ہوں اور یہ میری دوست اریبہ..... ایک اور آفیسر ہمارے ساتھ ہے جو باہر کھڑا ہے۔ ہم تم سے جو سوالات کریں ان کا جواب سچ سچ دینا۔ ورنہ پولیس خود بخود تم سے سب کچھ اگلوالے گی۔'' انسپکٹر روبینہ نے جان بوجھ کر دوپٹے کا پلو سر کا کر ہولسٹر میں لگا ریوالور شو کردیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم لوگ جو کچھ پوچھے گا لیکن پہلے تم دونوں عورتیں اندر آجاؤ۔ یوں دروازے پر عورتوں کا کھڑے ہوکر باتیں کرنا کسی کو پسند نہیں آئے گا۔'' ارباز خان گھبرا گیا تھا۔ پولیس کا نام سن کر یا انسپکٹر روبینہ کا ریوالور دیکھ کر۔ اس نے انسپکٹر روبینہ اور اریبہ کو اندر جانے کا راستہ دیا اور میں جان بوجھ کر باہر ہی ٹھہرا رہا۔ کیوں کہ اندر ارباز خان کی بیوی موجود تھی، یہ لوگ پردہ داری کے بہت سخت ہوتے ہیں اس لیے۔ ارباز خان نے اپنی بیوی کو اندر کمرے میں جانے کا کہا تو وہ اندر چلی گئی ہوگی۔ تبھی تو اریبہ نے مجھے اندر آجانے کی اجازت دے دی۔ ارباز خان نے ہمیں بان سے بنی ہوئی کرسیوں پر بٹھایا تھا۔ تب وہ پرسکون ہوکر کہنے لگا۔

''جی پوچھو کیا پوچھنا ہے۔''

''ارباز خان تم اسے پہچانتے ہو۔'' میں نے صائمہ کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ رانی پور گاؤں کی رہنے الی ہے جو شادی کرکے تمہارے ہاں آگئی تھی۔ میرا مطلب ہے تمہارے شہر کوئٹہ آگئی تھی۔'' مجھے اس کی آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر محسوس ہوا کہ شاید ہمیں غلط فہمی ہوگئی ہے اور ہم نے غلط دروازے پر دستک دے دی ہے مگر یہ بھی یقین تھا کہ یہ غلطی ہی ہمارے لیے نیا راستہ پیدا کرے گی، میری بات سن کر وہ ان جان بنا باری باری ہمارا منہ تکنے لگا۔

''یارا..... تم کیا بات کرتا ہے۔ خدا قسم ہم تو آج تک کراچی شہر نہیں گیا۔ ہم تو کراچی شہر کو خواب میں بھی نہیں دیکھا اور اتنا جانتا ہے کہ پاکستان کا بڑا شہر کراچی ہے جہاں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ بس: ارباز خان نے مجھے پاگل سمجھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''ارباز..... کیا تم مجھے بھی نہیں پہچانو گے۔ میں نے تو اپنے ہاتھوں سے علیشا باجی کو دلہن بنا کر تمہارے حوالے کیا تھا۔'' اریبہ نے غم زدہ انداز میں کہا۔

''ارے میری بہن..... آپ لوگ کس دنیا سے آئے ہو۔ ہماری صرف ایک شادی ہوئی ہے۔ آج سے دس سال پہلے ہماری خالہ زاد سے جس کا نام پلوشہ ہے اور جو تمہارے سامنے میرے گھر میں موجود ہے۔''

'کیا یہ تصویر بھی تمہاری نہیں ہے؟'' انسپکٹر روبینہ نے اس کے سامنے اس کی تصویر پھینکتے ہوئے کہا۔ ارباز نے اپنی تصویر کو کئی منٹ تک مختلف زاویوں سے دیکھا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ جس پر ہم سب کو غصہ آگیا۔

''ارباز..... تم بہت چالاکی کا مظاہرہ کررہے ہو۔ اپنے سادہ پن سے دھوکا دے رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

"نہیں، یہ شخص اس طرح نہیں مانے گا۔ لگتا ہے اسے ریمانڈ پر جیل لے کر جانا پڑے گا۔" انسپکٹر نے اپنی پیشہ ورانہ بولی میں کہا۔

"میم صاحب! ہم کسی جیل ویل سے نہیں ڈرتا۔ جو غلط کرتا ہے وہ ڈرتا ہے۔ نہ ہم نے کوئی غلط کام کیا ہے اور نہ ہمیں ڈر ہے۔ ہم تو اس تصویر والے بابو پر ہنس رہا تھا۔ جس نے پینٹ کوٹ پہن رکھا ہے۔" ارباز خان اٹھ کر اپنی بیوی کے پاس گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو بھی تصویر دکھائی تھی۔ تبھی تو کمرے کے اندر سے دونوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ شاید ارباز خان نے اس سے کہا تھا کہ دیکھو جانِ جاں، اگر ہم بھی انگریزوں والا لباس پہن لے گا تو ایسا ہی لگے گا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر ہمارے درمیان موجود تھا۔ ارباز خان کے اس بھول پن سے ہمیں کچھ دیر کو ایسا لگا جیسے واقعی وہ سچ بول رہا ہے۔ ورنہ اس کے چہرے پر سفاکی اور درندگی ہوتی اور پھر وہ اندر کمرے میں جانے کے بعد پچھلے دروازے سے فرار ہونے کی کامیاب کوشش بھی کر سکتا تھا یا اپنی جان بچانے کے لیے ہم پر حملہ آور بھی ہو سکتا تھا۔ ورنہ کم از کم اسلحے کے زور پر ہمیں اپنے گھر سے نکال دینے میں تو ضرور کامیاب ہو جاتا کیوں کہ پٹھان لوگوں کے پاس سب سے جدید قسم کا اسلحہ موجود ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جس طرح بطخ کے بچے کو تیرنا بچپن ہی سے آجاتا ہے اسی طرح پٹھان کے بچے کو اسلحہ چلانے کا شوق بچپن ہی میں پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ ارباز خان نے فرار ہونے کی کوشش کی اور نہ ہم پر حملہ آور ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ اور پھر اس کا چہرہ کھلی کتاب کی صورت ہمارے سامنے تھا جس پر کسی بھی قسم کے مکروہات نمایاں نہیں تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ بارہ برس سے سرکاری ملازمت کر رہا ہے۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم وہاں سے چلے آئے لیکن ایک خفیہ پہرے دار پولیس اہلکار جس کا تعلق کوئٹہ پولیس سے تھا تعینات کرآئے تا کہ وہ ارباز خان کی آج کے بعد ہونے والی نقل و حرکت پر نظر رکھے۔

ہم نے اس کے سرکاری محکمے میں بھی جا کر جانچ پڑتال کی مگر اس کی بدکرداری کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا بلکہ کوئی ایسا سراغ بھی نہیں ملا جس سے اس پر کسی جرم میں ملوث ہونے کا شک کیا جا سکتا تھا۔ اب انسپکٹر روبینہ کا شک اپنے منگیتر دلاور خان کی طرف گیا کیوں کہ وہ کئی بار کراچی بھی آچکا تھا اور پڑھا لکھا، اسمارٹ شخص ہونے کے باوجود ذہین اور کاروباری بھی تھا۔ ہم نے ہوٹل میں آکر کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کیا۔ یہ ہوٹل ایک پہاڑی مقام پر بنا ہوا تھا جس طرف نظر جاتی دلکش نظاروں سے آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ یہاں کا ماحول بڑا پرسکون اور آب و ہوا موسم سرما والی اور فضا انتہائی خوشگوار تھی۔ ہمارا پیٹ بھرا اور ذہن پرسکون ہوا تھا ہم نے اس کیس پر مزید غور و فکر شروع کر دیا۔

اسی دوران انسپکٹر روبینہ نے اپنے بھائی شہزاد سے اسلام آباد میں موبائل فون پر رابطہ کیا۔ روبینہ کے بھائی شہزاد نے کہا کہ میں دو دن سے مسلسل دلاور خان کی پل پل نگرانی کر رہا ہوں مگر وہ شخص اپنے کاروبار میں اس قدر مگن ہے کہ اسے دیگر کسی کام کی فرصت ہی نہیں ہے۔ یہاں تک اس سے ملنے آنے والوں میں بھی کوئی شکل و صورت سے جرائم پیشہ نہیں لگتا۔ دلاور خان دکان سے گھر اور گھر سے کاروبار کرنے دفتر آتا ہے۔ بس۔

اب تو ہمیں ہماری محنت ضائع ہوتی نظر آئی۔ اور معاملہ ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔

ہمیں انتہائی حیرت تھی کہ جس کی ہمیں تلاش تھی، اس کے ہم شکل دو انسان مل گئے تھے مگر دونوں میں سے وہ کردار ایک بھی نہیں تھا جس کی ہمیں تلاش تھی بہت سوچ بچار کے باوجود ہم کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے۔

دو دن ہو گئے تھے ہمیں رحیمو بابا کی یاد آئی۔ جس کو ہم ایدھی ہوم میں لاوارث سمجھ کر چھوڑ آئے تھے۔ میں نے اخلاقاً بزرگ سے مل لینے میں بہتری سمجھی۔ میں اریبہ کو مطلع کر کے روبینہ سے اجازت لے کر ایدھی ہوم جانے لگا تو وہ دونوں بھی میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئیں۔ لہٰذا ہم برف پوش پہاڑوں کے مناظر سے

لطف اندوز ہوتے ہوئے ایدھی ہوم پہنچ گئے۔ شاید بڑے میاں کی منتظر نظریں ہمارا ہی انتظار کر رہی تھیں۔

"بابو جی...... کیا تم لوگوں نے ادریس خان کو گرفتار کر لیا۔" رحیمو بابا نے دیکھتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"نہیں بابا جی...... دراصل ہم ایک بڑی مشکل کا شکار ہو گئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کہ ہم کیا کریں؟" میں نے بابا کے سامنے اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔

"مجھے بتاؤ بیٹا...... کیا مشکل آن پڑی ہے۔"

بابا نے میری کان میں سرگوشی کی۔

"چھوڑو بابا جی...... آپ بھی ہماری طرح ٹینشن کا شکار ہو جاؤ گے۔"

"کان ادھر لاؤ بیٹا! اگر تم تینوں مجھ سے وعدہ کرو تو میں ادریس خان کو گرفتار کروا سکتا ہوں۔"

بابا نے مجھے قریب بلا کر کہا۔ یہ بات سنتے ہی میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"کیسا وعدہ بابا؟" ہم آپ کا ہر حکم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آخر آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ ہمارے باپ کی طرح ہیں۔" میں نے نہایت جذباتی لہجے میں بابا کو تسلی دی۔

"ایک وعدہ تو یہ کہ تم اس راز کو راز ہی رکھو گے کہ ادریس خان میرا بیٹا ہے۔ دوسرا وعدہ یہ کہ ادریس خان کو پھانسی پر چڑھا دو گے۔" بابا نے ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ انسپکٹر روبینہ نے اتنی اہم باتوں کا ہونا اس جگہ مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ایدھی ہوم کے انچارج سے اجازت لے کر اور تحریری شکل میں دستخط کر کے رحیمو بابا کو اپنے ساتھ ہوٹل میں لے آئی۔ اریبہ بھی حیران و پریشان تھی کہ ایک باپ اپنے لختِ جگر اور دل کے ٹکڑے کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا اس دنیا میں مزید سانس نہ لے سکے۔ تبھی اس نے اپنے بیٹے کو گرفتار کروانے اور پھانسی پر چڑھا دینے کا وعدہ لیا تھا۔

میں بھی سوچ رہا تھا، اولاد نافرمان ہوتی ہے۔ ماں باپ کا دل دکھاتی ہے۔ ان کی عزت و احترام نہیں کرتی۔ زبان درازی سے کام لیتی ہے۔ بہر حال پرسکون ماحول میں رحیمو بابا نے دونوں وعدے وفا کرنے کا قول و اقرار لے کر اصل راز افشا کر دیا۔ وہ بتانے لگا۔

"بیٹا...... ادریس کے ہر کیس کا سب سے اہم گواہ میں ہوں۔ آپ لوگ حیران ہوں گے کہ میں کون ہوں جو اس کے متعلق اتنے اہم راز جانتا ہوں۔ تو سنو...... دراصل میرے ہاں تین ہم شکل بیٹوں نے بیک وقت جنم لیا تھا۔ جن کی پیدائش پر ان کی ماں مرگئی تھی۔ میرے لیے تین تین نومولود بچوں کی پرورش، نگہداشت اور تعلیم و تربیت کا مسئلہ تھا۔ میں نے ایک بیٹا اپنے مالک کے حوالے کر دیا جن کے گھر میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ بیٹا آج پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن گیا ہے۔ جو اسلام آباد میں خوشحال زندگی بسر کر رہا ہے لیکن میں نے مالک سے بھی وعدہ لے لیا تھا کہ وہ دلاور کو کبھی یہ راز نہ بتائے کہ وہ میری اولاد ہے اور اس کے دو ہم شکل اور بھائی بھی ہیں۔ دوسرا بیٹا میرے بچپن کے دوست سمندر خان نے مانگ لیا تھا جو بے چارہ بے اولاد تھا اور اس کو بچوں کی بڑی طلب تھی۔ اس کی بیوی بھی بچوں سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس لیے مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ سمندر خان نے اب اپنی جگہ ارباز خان کو سرکاری ملازمت پر رکھوا دیا ہے اور تیسرا بیٹا ادریس خان ہے جس کی میں نے خود پرورش کی ہے۔ میرے بے جا لاڈ و پیار نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ میں نے اسے ناز و نعم میں پالا۔ خود بوڑھا ہو کر بھی ملازمت کرتا رہا اور اسے کام کے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ جس سے اس کو کاہلی، سستی اور آرام طلبی کی عادت پڑ گئی تھی اور وہ بہت خود سر ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ باپ کو باپ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ جوانی کے نشے میں اندھا ہو گیا تھا۔ وہ پاک دامن عورتوں کی عزتوں سے کھیلتا ہے۔ دھوکا دہی اور مکر و فریب سے ان سے شادی رچاتا ہے اور ان کا جہیز، مال و دولت لوٹ کر کئی ماہ اس نئی نویلی دلہن کے ساتھ بسر کرتا ہے اور دل بھر جانے پر یا نیا شکار مل جانے

www.pdfbooksfree.pk

پر اسے سیر و تفریح کے بہانے سے پہاڑ کے اوپر لے کر دھکا دے دیتا ہے جس سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ طریقۂ قتل اس نے اس لیے اپنا رکھا ہے کہ قتل اور مقتول کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ وہ ظالم اور سفاک بھیڑیا اب بھی اس پہاڑی پناہ گاہ میں موجود ہے اور اس نے آج کل بھی ایک کالج کی طالبہ کو وہاں قید کر رکھا ہے۔ وہ اسے ہر روز جنسی تشدد کا نشانہ بناتا ہے اور اپنے درندگی کا ثبوت دیتا ہے۔ اس پہاڑی پناہ گاہ کا راستہ بہت ہی دشوار اور نا معلوم ہے۔ جسے میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' یہ کہتے ہوئے رحیمو بابا دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگا۔

''چلو بیٹا دیر نہ کرو۔ ادریس خان کو گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھا دو۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ یہ بڑا ہو کر میری شرمندگی کا باعث اور دوزخ کا حق دار ہو گا تو میں اسے پیدا ہوتے ہی جان سے مار دیتا۔''

ہم چار افراد پر مشتمل ٹیم بابا کی سربراہی میں ادریس خان کی پہاڑی پناہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ رینٹ پر کار حاصل کی گئی۔ روبینہ بہت اچھے طریقے سے کار کو ڈرائیو کر رہی تھی حالاں کہ کوئٹہ ایک فرازی پر آباد ہے۔ یہاں کے راستے اور سڑکیں نشیب و فراز میں واقع ہیں۔ فقط ایک گھنٹے کی مسلسل تیز رفتار مسافت کے بعد ہم اس پہاڑ کے دامن میں جا پہنچے جہاں ادریس خان نے اپنا عشرت کدہ بنایا ہوا تھا۔ پہاڑی انتہائی بلند تھی۔ ابھی ہم پہاڑی سے دور تھے کہ بابا رحیمو کی باز جیسی نظر کام کر گئی۔

''وہ دیکھو..... ادریس خان آ رہا ہے۔ نجانے کیا خیال تھا جو روبینہ کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا اس نے ہمیں چھپ جانے کا اشارہ کیا اور خود اکیلی ادریس خان کی جانب تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگی۔

میں نے شمیکا کی طرف دیکھا تو وہ میرا اشارہ سمجھ گئی اور پلک جھپکتے میں ادریس خان کی پشت کی جانب جا کھڑی ہوئی تا کہ ادریس خان فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے یا کوئی مزاحمت کر کے روبینہ کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ ہم سب دم بخود تھے۔ آج روبینہ نے ہرے رنگ کا چوڑی دار پائجامہ اور کرتا زیب تن کیا ہوا تھا۔ جس سے وہ ایک نازک سی ہری بھری لچکتی شاخ نظر آ رہی تھی۔ جیسے ہی ادریس خان کی نظر روبینہ پر پڑی ویسے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا، پھر چاروں طرف دیکھ کر اس نے یقین کر لیا کہ آس پاس کوئی دوسرا موجود نہیں ہے اور یہ دوشیزہ اکیلی ہی اس کی جانب بڑھ رہی ہے۔ ادریس خان کی آنکھوں میں کسی شکاری سی چمک پیدا ہو گئی اس کی یہ سوچ کر رال ٹپکنے لگی کہ آج تو بغیر محنت کے شکار خود بخود اس کے جال میں آ پھنسا ہے۔ وہ بھی روبینہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کون ہو تم..... اور اس سنسان وادی میں کیا کر رہی ہو؟'' ادریس خان کی رگِ ہوس پھڑک اٹھی۔

''نوجوان..... ہم لاہور سے کوئٹہ کی سیر کرنے آئے ہیں۔ اگر تم ہمیں اس پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر نظارہ کراؤ تو ہم تمھیں عیش کرا دیں گے۔'' روبینہ نے مخمور نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ شرط پوری کرنا ادریس خان کے لیے نہایت آسان تھا۔ کیوں کہ یہ تو اس کا گھناؤنا کھیل تھا۔ وہ دل بھر جانے پر اپنی بیبیوں کو پہاڑ کی اونچائی پر لے جاتا تھا اور پھر بہانے سے دھکا دے دیتا تھا۔ اور ان کی دردناک موت کا منظر دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتا تھا اور ان کی کرب میں ڈوبی آخری چیخ سے محظوظ ہوتا تھا۔ وہ بلا چوں چرا روبینہ کو پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر لے گیا۔ فقط اس امید پر کہ اس کے بعد وہ حسینہ اس کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گرے گی۔ عین چوٹی پر پہنچ کر روبینہ نے ہزاروں فٹ گہری کھائی دیکھی تو اسے چکر سے آنے لگے۔ وہ خود کو مشکل سے سنبھال پائی۔ روبینہ کو یوں بھی حیرت ہو رہی تھی کہ ادریس خان ہو بہو دلاور خان اور ارباز خان کا ہم شکل تھا۔ اگر تینوں کو ایک سے لباس میں کھڑا کر دیا جائے تو ان کی پہچان مشکل ہو جائے گی۔ وہ محوِ حیرت تھی مگر بہت جلد ہی حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی

کیوں کہ اس کے سامنے انسانیت کا مجرم کھڑا تھا اور وہ خود کو قانون کا محافظ تصور کرتی تھی۔ وہ ادریس خان سے مخاطب ہوئی۔

''ادریس خان اس پہاڑ سے اگر کوئی نیچے دھکا دے دیا جائے تو کیا ہوتا ہے؟'' روبینہ یعنی ایک اجنبی کے منہ سے وہ اپنا حقیقی نام سن کر سٹ پٹا گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ کسی زخمی شیر کی طرح روبینہ پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا مگر اگلے ہی لمحے روبینہ نے اس کے سینے کا نشانہ لے کر اس پر ریوالور تان لیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج شکاری خود شکار ہو جائے گا۔ وہ کتنا لاپروا بنا ہوا تھا یا پھر حسین و جمیل لڑکیاں اس کی کمزوری رہی تھیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک نازک اندام لڑکی اس کے لیے اس قدر خطرناک ثابت ہو گی اور اس کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ ادریس خان اس سے کوئی سوال کرتا وہ خود ہی گویا ہوئی۔

''تم نے پوچھا تھا ناں کہ میں کون ہوں۔ تو سنو! ادریس خان، تمہارے لیے میرے کئی نام ہیں۔ ایک تو میں بے چاری صائمہ کی بہن ہوں، جس کو تم نے پہاڑی سے دھکا دے کر قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اتفاق سے وہ جھیل کے گہرے اور برفیلے پانی میں جا گری۔ برف کے تودوں پر گرنے سے اس کی ٹانگیں تو ٹوٹ گئیں مگر وہ زندہ بچ گئی۔ جیسے تیسے وہ مجھ تک پہنچ گئی۔ اور میں نے اسے دارالامان میں پناہ دی۔ تم اسے وہاں سے بھی لے اُڑے اور مجھے رودادِ الم سنانے کے جرم میں تم نے اس کی زبان بھی کاٹ دی۔''

''میں دوست ہوں علیشا کی۔ جس سے تم نے ارباز خان بن کر شادی کی تھی۔ تم جانتے تھے کہ اس شہر میں کوئی تمہارا ہم شکل بھی رہتا ہے۔ تم نے اس بھولے بھالے انسان کو اپنے گناہوں کے جال میں پھسانے کی کوشش کی۔ اس کا نام اور پتا استعمال کیا تا کہ گناہ تم کرو، سزا وہ بھگتے اور میرا تیسرا نام موت ہے۔ تمہاری موت..... بالکل اسی انداز کی موت جس طرح تم عورتوں اور معصوم لڑکیوں کو دیتے ہو۔ تم نے کبھی سوچا کہ اس بلند ترین پہاڑی سے نیچے کھائی میں گرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ انسان کی ہڈیاں تک نہیں ملتیں۔'' روبینہ نے بات ختم کرتے ہوئے ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

''نہیں۔ نہیں۔ تم مجھے مت مارو۔ میں اپنے گناہوں سے توبہ کر لوں گا۔ آئندہ راہ راست پر چلنے کا عہد کرتا ہوں۔ پلیز مجھے مت مارو۔ مجھے زندگی سے پیار ہے۔'' ادریس خان نے موت کے ساتھ ساتھ ایک پوری ٹیم کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو وہ چھوٹے بچوں کی طرح روتے ہوئے گڑگڑانے لگا اور التجائیں کرنے لگا۔

''ادریس خان..... زندگی ہر جان دار کو پیاری ہوتی ہے۔ کوئی جانور بھی بے موت مرنا یا اذیت کی موت پسند نہیں کرتا۔ وہ بھی اپنی جان بچانے کی ہزار ہا کوشش کرتا ہے۔ تم نے ان لڑکیوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچا جنھوں نے تمہیں اپنا مزاجی خدا مان کر اپنا تن من دھن سب سونپ دیا تھا۔ اور تم نے ان کی بے لوث محبت، گہرا پیار اور ایثار کا بدلہ موت کی صورت میں دیا۔ ان سے ان کی زندگی ہی چھین لی۔ لعنت ہے تم جیسے ظلم و سفاک شخص پر۔ تم جیسے عیاش مرد پر۔ تم جیسی نافرمان اور ناخلف اولاد پر، جو والدین کے لیے باعثِ شرم ہوتی ہے اور معاشرے کے لیے بدنما داغ۔ تم جیسے سماجی ناسوروں کو جسم سے کاٹ کر پھینک دینے میں ہی بھلائی ہے۔'' روبینہ نے اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

''خدا کے لیے مجھ پر رحم کھاؤ۔ عورت کا دل تو رحم سے بھرا ہوتا ہے۔'' ادریس خان موت کے خوف سے باسی پھول کی طرح مرجھا گیا تھا۔

''ہاں عورت کا دل رحم سے بھرا ہوتا ہے۔ اسی لیے تو آج تک کسی عورت نے تمہاری طرح اپنے شوہر کا سب کچھ لوٹ کر اسے موت کے منہ میں بے رحمی سے نہیں پھینکا۔''

''اچھا مجھے گرفتار کر لو۔ پولیس کے حوالے کر دو

www.pdfbooksfree.pk

یا پھانسی پر چڑھا دو مگر خدا کے لیے اس اذیت ناک موت سے بچالو جس کا منظر میں متعدد بار اپنی بے رحم آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ مجھے راتوں کو خوابوں میں وہی مناظر نظر آتے ہیں جنھوں نے میری نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ مجھے سناٹے میں ان لڑکیوں کی کرب ناک چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ جو کبھی صائمہ، نجمہ، گل بہار، بیگم جان اور علیشا کی صورت میں آتی ہیں۔ میں بیٹھا بیٹھا چونک جاتا ہوں۔

ادریس خان کی بات مکمل سنے بغیر ہی روبینہ نے کہا۔

''اچھا..... اس کا مطلب ہے تم نے اور بھی کئی عورتوں کو اس طرح موت کے منہ میں دھکیلا ہے، کیا تم علیشا کے بارے میں بتانا پسند کرو گے کہ تم نے اس قدر محبت کرنے والی لڑکی کو کس بے دردی سے قتل کیا۔'' روبینہ نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا تو وہ بلبلا اٹھا۔

''نہیں نہیں علیشا زندہ ہے وہ میری پناہ گاہ میں محفوظ ہے۔'' ادریس خان نے جلدی سے کہا، تاکہ اس پر ترس کھایا جائے۔ روبینہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ علیشا کی جان بچ گئی۔

''ادریس خان..... تیار ہو جاؤ تم خود اس بلندی سے چھلانگ لگاتے ہو یا مجھے دھکا دے کر گرانا پڑے گا۔''

ادریس خان کو اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ اس نے تنکے کو سہارے بنانے کے لیے ایک پل میں اپنا ریوالور نکال لیا جیسے ہی اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا ایک زوردار جھٹکے سے اس کا ریوالور دور جا گرا۔ اور وہ اپنی کلائی کو پکڑ کر چیخنے لگا۔ روبینہ بھی حیران تھی کہ اس کی کلائی پر اس زور کی ضرب کس نے لگائی ہے کہ اس کی کلائی کی نہ صرف ہڈی ٹوٹ گئی ہے بلکہ ریوالور بھی اس کی پہنچ سے دور جا گرا۔ مگر یہ باتیں سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ روبینہ نے پولیس والوں کا حربہ استعمال کیا۔ ادریس خان کی ٹانگوں کے پاس فائر کیے، تو وہ لڑکھڑا کر دور جا گرا اور کھائی کے قریب ہو گیا۔ فائر کی آواز بازگشت کی طرح اس وادی میں کئی بار گونجی۔ روبینہ اس پر فائر کرتی جاتی تھی اور وہ کھائی کے مزید قریب ہوتا جا رہا تھا۔ موت کے خوف سے اس کے بدن کا لہو خشک ہو گیا تھا۔ پہاڑ کی سطح ترچھی ہونے کے سبب وہ پتھر کی طرح لڑھکتا ہوا خود بخود اس گہری کھائی میں جا گرا، جس میں آج تک اس نے دوسروں کو پھینکا تھا۔ ایک دل دوز چیخ سنائی دی، جس سے سبھی کے دل دہل گئے۔ روبینہ نے سب کو واپس چلنے کا اشارہ کیا اور خود دل میں سوچنے لگی۔

''ادریس خان..... میں پولیس والوں کو اچھی طرح جانتی ہوں، اگر تمھیں زندہ گرفتار کر لیا جاتا تو تم دولت اور اثر و رسوخ کی بنیاد پر رہائی پا جاتے اور تمہارے ہاتھوں نجانے مزید کتنی بے گناہ اور معصوم سی لڑکیوں کا خون ہوتا۔ لہٰذا میں نے تمھیں وہ سزا دی ہے جس کا کوئی ریکارڈ، کوئی ایف آئی آر درج نہیں، جس کا کسی عدالت کو کوئی جواب نہیں دینا پڑے گا۔''

روبینہ خود کلامی کرتی ہوئی پہاڑی سے نیچے اتری تو وہاں اس نے مجھے، علشیا، اریبہ اور رحیمو بابا کو اپنا منتظر پایا۔ بابا علیشا کو غار سے باہر نکال لایا تھا۔ آج ایک بہادر سپاہی نے وہ کارنامہ سر انجام دیا تھا جو ناقابلِ فراموش تھا۔ ہم نے روبینہ کے لباسِ زیست پر بے شمار انمول دعاؤں کے تمغے سجا دیئے تھے۔ جس سے ہماری نظروں میں اس کا رتبہ کسی فاتح جرنیل سے کم نہیں تھا۔

ہم سب واپس اپنے گاؤں پہنچ چکے تھے۔ میں نے شمیکا کو حاضر ہونے کا اشارہ کیا اور یوں ہم نے سوچا کہ تمام ادھورے کام نمٹا لیے گئے ہیں۔ اب ہمیں اپنے گاؤں چل کر شادی کر لینی چاہیے۔ لہٰذا ہم بغیر کسی تاخیر، جھجک اور وقت ضائع کیے، سب سے رخصت ہونے کی اجازت لے کر اپنے گاؤں رانی پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ سب نے ہمیں اپنی مسکراہٹوں کے سائے میں روانہ کیا۔

(ختم شد)

www.pdfbooksfree.pk